اردو زبان کے غیر معمولی اور غیر فانی افسانوں کی خوش رنگ کہکشاں

منتخب مشہور افسانے

حصہ اول

مرتبہ ضیاء ساجد

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

فہرست مضامین

نیا کھاتا	04
وہ بڈھا	53
حسب نسب	71
جینی	93
چٹان	131
پس ماندگان	147
کن رس	163
داستان ہند باد	196
چنبیلی	220
لوہے کا کمر بند	247
تیسرا آدمی	262
خط سرطان	292

M.Iqbal CyberLibrary All rights reserved. ©2002-2006

انتساب

اسلوب گر اور عہد ساز عظیم شاعر
محسن نقوی کے نام

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
اقبال اکادمی پاکستان
©2002-2006

نیا کھاتا

افسانہ نگار : حیات اللہ انصاری

"کون تھا؟"

شوکت الشان نے دروازے کی کنڈی لگا کر جواب دیا۔

کوئی نہیں ابا حضور۔۔ہوا کا جھونکا تھا۔"

"ہوا کا جھونکا۔گلون سے خار بہتر ہیں، جو دامن تھام لیتے ہیں" بیٹا اب کوئی کیا آئے گا۔ ماما اصیلیں سب سوگئی ہوں گی۔ دیر ہوئی جب گھڑیال نے دس بجائے تھے۔ بیٹا بہت بھوکے ہو۔؟

"نہیں ابا حضور کچھ ایسی بھوک تو نہیں۔

"کیا بتلائیں، قوال کے چھوکرے نے پیسہ اس طرح مانگا، کہ انکار بن ہی نہ پڑا، نہیں تو کچھ نہ کچھ تو تمہارے پیٹ میں پڑ ہی جاتا۔

یہ کہہ کر نواب رفیع الشان نے ایک چھوٹی سی آہ کھینچی۔ان کی آہ سن کر شوکت بے چین ہو گیا، اور کہنے لگا:

"ابا حضور میری فکر نہ کیجئے۔ مجھے کوئی ایسی بھوک نہیں۔آپ کو بھی تو خاصہ تناول کرنے کا موقع نہ ملا۔"

نہیں بیٹے ہم پرانے لوگ تو بہت کڑی جھیل چکے ہیں۔استاد مولانا خدا بخش کہا کرتے تھے، کہ ہمارے جد امجد شہنشاہ ہمایوں نے وہ تکلیفیں جھیلی ہیں۔جو غریب سے غریب نے بھی نہ جھیلی ہوں۔شہزادوں کا دن اگر تخت و تاج ہے۔تو رات میدان جنگ یا جنگلوں کی خاک چھاننا ہے۔ بیٹے ایسی زندگی میں دن رات سے کہاں مفر؟"

نواب رفیع الشان اپنی پھٹی ہوئی رضائی میلی چکٹ تو شک میں گھسے ہوئے لیٹے

تھے۔ لیکن شوکت ابھی تک پاؤں میں رضائی ڈالے بیٹھا تھا۔

ان لوگوں کا گھر دو چار پائی والے ایک در کے دالان اور اتنے ہی بڑے صحن پر مشتمل تھا۔ دالان کے لکڑی کے در پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا، جو جگہ جگہ پھٹ جانے کی وجہ سے بس برائے نام سردی کو روک رہا تھا۔ خاص کر شوکت کی طرف کا تو پردہ بہت پھٹا ہوا تھا۔ اس کے بدن پہ ململ کے کرتے کے اوپر ایک پھٹی ہوئی صدری تھی، جسے توڑ توڑ کر سردی جسم کو برفا رہی تھی،

اتنے میں چراغ لہرایا۔ نواب رفیع نے کہا:

''لو بھئی انہوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ کیا مصرع کہہ دیا ہے ظالم نے شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے۔

یہاں یہی عالم ہے، اچھا بیٹے اب کھانے کی آس چھوڑ دو۔ بڑے لوگوں کے دماغوں سے ہم غریب عزیزوں کی یاد او جھل ہوگئی ہے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے، اچھا لاؤ ایک ایک کٹورا پانی تو پی لیں، اور سمجھ لیں کہ خاصا نوش جان کر چکے ہیں۔''

پانی پی کر نواب صاحب نے کہا:

''کیوں بیٹے شیر مال کیسی تھی؟''

یہ سوال سن کر حشمت کے لڑکپن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

بہت خستہ تھی ابا حضور۔''

''ہاں بھئی خستہ تو بہت تھی، اور بالائی کے ساتھ تو مزہ دے گی۔ اور گل فام بھی خوب تھا۔''

نواب نے یہ کہہ کر ایک چٹخارا مارا۔

''گل فام پر ابا حضور؟''

ارے ہاں تم کیا جانو۔ ہائے تم نے دیکھا کیا ہے؟۔ علاقہ واپس مل جائے تو پہلا کام تو یہی کرنا ہے۔ کہ تم کو نوابی کھانوں اور نوابی خلعتوں کا مزہ چکھایا جائے۔

اس کے بغیر کیسے سمجھو گے کہ شہزادگی کیا چیز ہے۔

''گلفام ایسی مٹھائی ہوتی ہے جو صرف ہمارے ہاں کے رکاب دار بنا سکتے تھے بس منہ میں رکھو اور پگھل جائے۔ یاد کر کے مزہ آ گیا۔ ظالم رکاب دار کبھی، کبھی گل فام میں آم کی باس دے دیتا تھا۔ اہاہا۔ ہاہا۔ حیدر آباد کے نواب شہامت یار جنگ نے جو ایک بار گل فام کھایا، تو رکاب دار کو ایک ہزار روپے ماہوار دینے پر تیار ہو گئے۔

لیکن اس نے کہا جس در کا نمک کھایا ہے، اس سے مر کر نکلوں گا۔ وہ کسی طرح بھی جانے پر راضی نہ ہوا۔ وہ وفاداریاں اب کہاں؟

''کیسا تھا گل فام بیٹا۔

''بہت نفیس۔ کیا کہنا منہ میں ڈالتے ہی گھل گیا، اور باس سے دل خوش ہو گیا، جیسے بنارس کے لنگڑوں کا عطر نکالا گیا ہو۔

باپ بیٹا نے ان یادوں سے پیٹ بھر کر دو گھونٹ پانی پیا، اور لیٹ گئے۔ چراغ پہلے ہی بھڑک کر خاموش ہو چکا تھا۔ کہیں دور طبلا ٹھنک رہا تھا، مجرے کھنک رہے تھے، اور ہوا کی لہروں پر میٹھی تانیں لہریں لیتی ہوئی آ رہی تھیں۔ تھوڑی دیر سناٹا رہا۔ پھر نواب نے کہا،،

سو گئے بیٹا؟

بھوک میں نیند کہاں آتی ہے؟ شوکت کھائے ہوئے گلفام کے مزے یاد کر رہا تھا۔ منہ میں بار بار رال آ جاتی تھی، جو گل فام کی گھلاوٹ اور آم کی باس میں ڈوب کر نیچے اتر جاتی،

شوکت نے جواب دیا

نہیں ابا حضور۔ فرمایئے۔

اپنا علاقہ واپس مل جائے گا۔ تو ہم کبھی ایسی گھٹیا بات نہ کریں گے، کہ شادی بیاہ

اور تقریب میں جہاں جہاں کھانا جاتا ہو، وہاں بھیجنا بھول جائیں۔ اور کسی غریب کو بھوکا سلا دیں۔

''ابا وہ لوگ تو ہم کو بھوکا جگا رہے ہیں۔ سلا کہاں رہے ہیں۔''

جیتے رہو بیٹا کیا بات پیدا کی ہے؟

یہ ہوا تڑ پا تڑپا کر مارنا۔ کوئی شرافت ہے۔ ہمارے جد امجد ہمایوں کے ساتھ ان کے بھائیوں کامران اور عسکری نے بھی تو ایسا ہی کیا تھا، بھئی میرے پاس تو وہ دل ہے جہاں ایک خوان کی ضرورت ہو وہاں جب تک دو نہ بھیج لوں۔ چین نہ آئے۔ ہائے تم نے یہ تماشے کہاں دیکھے ہیں۔ خدا بخشے تمہارے دادا میاں کو! جب لڑکے تھے تو محل سے باہر کہیں جا رہے تھے۔ راہ میں ان سے کسی فقیر نے کہا، کہ میں بھوکا ہوں۔ انھوں ان نیوکر سے کہا اسے کھانا کھلا دو، اور آگے چلے گئے، واپس آئے تو فقیر اسی جگہ کھڑا ہوا دیکھا۔ انھوں نے پوچھا کھانا ملا۔ وہ چند روٹیاں دکھلا کر کہنے لگا

بس کتوں کے کھانے والی یہ چند روٹیاں ملی ہیں۔

ہوتا یہ تھا، کہ پتیلا خالی ہونے کے بعد اسے دو چار روٹیوں سے پوچھ لیا جاتا تھا یا پھر وہ گلی کے کتوں کے آگے ڈال دی جاتی تھیں۔ یا کسی فقیر کو دے دی جاتی تھیں۔ وہی روٹیاں اس فقیر کو دے دی گئی تھیں۔ فقیر ایسا موٹا تھا کہ اس نے ان کا ایک نوالہ بھی نہ کھایا۔

ابا نواب کو یہ بات ناگوار ہوئی، کہ جس فقیر کے لئے میں نے کھانے کا حکم دیا تھا، اسے ایسا کھانا دیا گیا۔ میری دادی بڑی طنطنہ کی بیگم تھی، ان سے شکایت کرنے کیا با نواب کو ہمت نہ ہوئی، انہوں نے اندر کہلا دیا کہ میرا خاصہ باہر آ جائے۔ جب وہ باہر آیا تو چار خوان تھے۔ اور ہو گا کوئی دس آدمیوں کا کھانا۔ ابا نواب نے وہ چاروں خوان فقیر کو دے دیے۔ اور کہا دکھاؤ اور کھلاؤ۔''

"کیا کہا امیر مینائی نے:

گزشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں میں۔

شوکت کی آنکھوں میں آنسو بھر گئے۔ بھوک سے نہیں۔ اپنے باپ پر اور اپنے پر ترس کھا کر۔ پہلے کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔

نواب صاحب کی ذرا دیر بعد پھر آواز سنائی دی،

ہمارے محل میں تو عزیزوں، عزیز کے عزیزوں اور ان کے عزیزوں اور دوستوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ جو بھی ایک دن کے لئے آتا برسوں اور سالوں رہتا۔ ہم کو تو یہ بھی خیال نہیں ہوتا تھا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات ہے۔ اور اس کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ ایک یہ لوگ ہیں، ہیں تو خاندانی نواب، مگر نہ عزیزوں کے نہ دوستوں کے۔ حالت یہ ہے کہ شادی کے موقع پر کھانا بھجوانے کو کہہ دیتے ہیں مگر کھانا بھیجنا بھول جاتے ہیں۔ کیا زمانہ ہے طوق زریں ہمہ گردن در خرمی یتیم۔"

شوکت اپنے دماغ میں محل بنانے اور بسانے لگا، جس میں اس نے اپنے ساتھ کے کھیلنے والے گلی کے لونڈوں تک کو آرام سے بٹھایا۔ وہ چھپر کھٹوں کو جو انہیں سونے کو ملے تھے، حیرت سے تک رہے تھے، اور گلفام پر ٹوٹے پڑ رہے تھے، خلعتوں میں اٹھلائے، اٹھلائے آرہے تھے، ساری رات وہ ایسے ہی تماشوں سے لطف اندوز ہوتا رہا، جب صبح آنکھ کھلی تو لبوں پر تبسم تھا،

(۲)

نواب زادہ صاحب۔ بھئی نواب زادے صاحب۔ ہو

نواب اور نواب زادے دونوں جاگ رہے تھے، لیکن خاموش اپنے اپنے بستر میں پڑے تھے،

آواز سن کر نواب نے کہا:

اچھا بھئی۔"

پھر شوکت سے کہا ''ذرا دیکھنا بیٹا۔مگر پہلے بستر وغیرہ درست کرلو، یہ لحافوں کے کھلے ہوئے سیلون ہماری غریبی پر ہنستے ہیں۔

باپ بیٹا دونوں سردی کھاتے ہوئےبستروں سے نکل آئے۔شوکت نے ان کو تہہ کر کے پلنگوں کے سرہانے لگا دیا،اور پھر دروازے کی کنڈی کھولی،

دروازہ کھلتے ہی نواب اغن اندر آئے بغل میں ان کا محبوب مرغ بانکے بہادر دبا ہوا تھا،آتے ہی انہوں نے کہا:

چچا اب تو جینے کو جی نہیں چاہتا ہے۔''

یہ کہتے ، کہتے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔اغن کے بدن پر اچھی سی چھینٹ کا پرانا دگلا تھا، جس کے رنگ مدھم ہو گئے تھے،اور سر پر کشمیری کام کی ٹوپی تھی، جس پر تیل کے دھبوں کی تہہ سی چڑھ گئی تھی۔کندھوں پر پرانی مگر بہت قیمتی کشمیری شال تھی،

خدا نہ کرے،خدا نہ کرے۔کیسی باتیں کرتے ہو۔بیٹھو۔یہ تو بتلاؤ کہ معاملہ کیا ہے،

اغن نواب نے اپنے آنسو پونچھے اور کہنے لگے،:

ہوا کیا۔کیا بتلاؤں، مفلسی سب بہار کھوتی ہے۔

نواب اغن نے یہ کہہ کر مرغ پر ہاتھ پھیرا،اور نواب کی طرف منہ اٹھا کر کہنے لگے ''اب تو اپنی پیاری اولاد کو ہاتھ سے دینا پڑے گا۔''

رفیع الشان نے مرغ کی طرف محبت سے دیکھ کر کہا،

بھئی پہلیاں تو نہ بجھاؤ۔''

اغن نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا،

''کل جو میں گھر گیا تو دیکھتا کیا ہوں۔کہ ایک پلیٹ میں قیمہ رکھا ہوا ہے۔ اسے دیکھتے ہی یاد آیا، کہ بیٹا بانکے بہادر کو ایک ہفتے سے گوشت نہیں ملا۔دال بھات کی واہیات خوراک پر بھلا کیا لڑے گا۔میں نے پلیٹ اٹھا کر سامنے رکھ دی۔اس

نے بات کہنے میں سب قیمہ صاف کر دیا، میں اسے پیار کرتا رہا، اور پیار کرتے کرتے باہر چلا گیا۔''

نواب فلک جاہ کے محل پر مشاعرہ تھا۔ وہاں سے رات گئے واپس آیا۔ آکر خاصہ طلب کیا۔ اب جو خوان اٹھا کر دیکھتا ہوں، تو سوکھی روٹیاں ہیں۔ واللہ دال تک نہیں۔ میری شرافت دیکھیے کہ میں نے بیگم سے کچھ نہیں پوچھا۔ دو لقمے اگل نگل کر کھا لیے۔ پھر ایک کٹورا ٹھنڈا پانی پیا اور پڑ رہا۔

رات کو دو بجے تک بھوک سے کروٹیں بدلتا رہا۔ اس اللہ کی بندی نے بات تک نہ پوچھی۔ آخر میں نے پوچھا:

''تم نے بھی کچھ کھایا؟''

میں جب بلا کھائے ہی جی سکتی ہوں، تو کھانے کی کیا ضرورت ہے''

''بچوں نے بھی کچھ کھایا''

''ہاں''

''کیا کھایا؟

''پلیٹ بھر قیمہ''

''بھئی میں بانکے بہادر کی بات نہیں کر رہا ہوں دوسرے بچوں کے بارے میں پوچھ رہا ہوں۔''

''کیا آپ کے اور بچے بھی ہیں؟''

''بھئی اتنا شرمندہ نہ کرو۔ تم ہی بتلاؤ کہ کیا کروں۔ کیا بانکے بہادر کو مر جانے دوں۔''

''نوج۔۔۔ ان کا نمبر تو ہم سب کے بعد آئے تو آئے

''خدا کے لئے یہ تو بتلا دو کہ تم نے اور بچوں نے کچھ کھایا نہیں۔ تم کو میرے سر کی قسم۔

"آخر آج یہ فکریں کہاں سے آپڑی ہیں۔ کیا بانکے بہادر سلمہ سے جی بھر گیا؟"

میں اٹھ کر خود ہی بچوں کے پاس گیا، تو دیکھا کہ تینوں جاگ رہے ہیں اور رو رہے ہیں، میں نے پوچھا کیا بات ہے۔

بڑی لڑکی تو کچھ نہ بولی، مگر دونوں چھوٹے لڑکوں نے کہا "اماں جان نے ہم کو مار مار کر سوکھی روٹی کھلائی، اور کہا اب زندگی بھر یہی کھانا ملے گا۔ گوشت جب آئے گا بانکے بہادر کو دیا جائے گا۔

یہ سن کر میرے دل پر عجیب عالم گزر گیا، کہ ہائے یہ بچے سوکھی روٹی کھائیں۔ میں سوچ میں پڑ گیا، کہ کیا کروں اور کہاں جاؤں۔ وہ اللہ کی بندی بھی نہیں سوئی۔ لیکن ایک کلمہ بھی جو دل دہی کا کہا ہو۔ بچا اس زندگی پر لعنت ہے۔ اب اس اولاد کو دفن کروں یا ان اولادوں کو۔"

نواب رفیع الشان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بانکے بہادر کی طرف دیکھ کر کہنے لگے۔۔۔

بھئی بانکے بہادر بھی کیا مرد میدان ہے۔ ہمیشہ سر ہتھیلی پر لے کر میدان میں اترتا ہے۔ پیٹھ دکھلانا تو جانتا ہی نہیں۔ خون میں نہا نہا جاتا ہے۔ لیکن تیور وہی رہتے ہیں۔ اس کی رستمانہ جنگ دیکھ کر رگوں میں خون اس طرح دوڑنے لگتا ہے کہ جیسے ہم خود میدان جنگ میں ہوں۔ واللہ شاہ نامے کی داستانیں آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہیں۔

بھئی نواب اغن سچ کہتا ہوں، کہ اگر آج مجھے میرا علاقہ واپس مل جائے، تو اس کے لئے محل بنوا دوں۔ مگر کیا کروں۔ ایسا مجبور ہوں،

نواب رفیع الشان ہاتھ ملنے لگے، شوکت بھی حسرت سے بانکے بہادر کی طرف دیکھنے لگا، بانکے بہادر نے بھی ایک نگاہ اس پر ڈالی، اور اپنے پر کھجانے لگا۔ سوچنے

لگا، کہ اگر اپنی کچھ حیثیت ہوتی تو میں ضد کرتا کہ ابا حضور یہ مرغ مجھے دلا دیجیئے۔

نواب رفیع کچھ سوچ کر کہنے لگے:

بیٹا اغن اسے کسی قدر دان کو دے دو،

''چچا اسکی جدائی کا خیال کر کے کلیجہ پھٹنے لگتا ہے، اللہ جانتا ہے اس مرغ کے لئے میں نے دولت پانی کی طرح بہائی ہے۔ جب یہ چوزہ تھا، تو اس وقت سے اسے روزانہ جواہر مہرہ، اور کشتہ مرجان کھلایا ہے، اور جب جوانی پر آیا تو دونوں وقت مغز کنجشک دیا۔ پر اب کیا کروں، پیسے، پیسے کے لئے بیگم کا دست نگر ہوں۔ ہائے اس پیارے کے بغیر کیسے جیوں گا۔

بیٹا شہزادوں پر ہر قسم کے وقت پڑتے ہیں اور وہ سب برداشت کر لیتے ہیں۔

اغن نے خیالات کی دنیا میں ڈوب کر کہا،

''اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ابھی میرا راج پاٹ باقی ہے۔ سب میری شمشیر کا لوہا مانتے ہیں،،،،،، ہائے۔''

نواب رفیع کچھ سوچ کر کہنے لگے۔

''ایک راہ سوجھ گئی۔ ایسی جگہ اسے دیا جائے جہاں تمہارا بھی حق رہے۔''

اغن جب اپنے ہاتھ سے گیا تو گیا۔ خیر اگر کچھ حق رہے تو دل کو ذرا تسلی ہو جائے گی۔

اغن تم اس بیٹے کو بیٹی سمجھو۔ بیٹی دوسرے گھر بیاہی جاتی ہے تو کیا اپنی نہیں رہتی۔

''چچا بیٹی کے لئے تو ماں باپ پہلے ہی سے تیار رہتے ہیں۔ مگر بیٹے کی بات۔۔

۔۔

اتنے میں دروازے پر شور ہوا، اور دس بارہ آدمی جن میں بوڑھے جوان، بچے سب ہی تھے۔ اندر آ گئے اور شور کرنے لگے۔

مبارک ہو، مبارک ہو۔ اسفند یار نے سہراب کو مار لیا۔"

نواب رفیع یہ سن کر اچھل پڑے۔۔ ان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

نواب واللہ سچ ہے!! واقعی ہی سہراب کو مار لیا۔۔۔ ہمارا اسفند یار نوشیرواں ہے۔ نوشیرواں۔"

جھمن بیگ نے جو سب سے آگے تھے آداب بجالا کر کہا،،،

"نواب استاد۔ ادھر یہ جیتا اور ادھر بڑے نواب نے کمر سے روپوں کا توڑا نکال کر سامنے رکھ دیا، اور کہا مجھے عطا کر دو اسفند یار کو۔"

نواب رفیع تم نے کیا جواب دیا۔ جھمن بیگ،،،

جھمن بیگ کڑک کر بولے، میں نے کہا حضور نواب صاحب آپ جو فرمائیں سر آنکھوں پر۔

لیکن رستم سے رستمی اور اسفند یار سے اسفند یاری خریدی جا سکتی، تو آپ اس بٹیر کو خرید لیں،

جھمن بیگ کے ہاتھ میں بٹیر دبا ہوا کانپ رہا تھا۔ اس کی چونچ اور سر پر ابھی کل کے زخموں کے نشان باقی تھے، نواب صاحب نے ہاتھ بڑھا کر کہا ادھر لاؤ میرے فاتح کو،

جھمن بیگ کے ساتھ ایک چھوکرا۔ ہاتھ میں حقہ اور خاصدان لیے ہوئے آیا تھا۔ جھمن بیگ نے پہلے بٹیر نواب کے ہاتھ میں دیا، اور پھر باری، باری دونوں چیزیں نواب رفیع صاحب کے سامنے پیش کیں اور ادب سے کہا:

"نواب استاد صاحب آپ نے کئی مرتبہ کہا، کہ میرے یہاں حقہ اور خاصدان لے کر نہ آیا کرو، میں جانتا ہوں کہ اس سے آپ کی شان مہمان داری مجروح ہوتی ہے۔ لیکن کیا کروں میرا جی چاہتا ہے، کہ اس دربار میں میرا ہی سکہ چلے۔"

اس فقرے پر سب ہنس پڑے۔

جھمن ۔ ''نواب شوکت اب تم حقے اور پان کی فکر نہ کرنا۔''

نواب رفیع نے ایک تبسم کے ساتھ یہ سب باتیں سن لیں۔ ایسے موقعے ان کے یہاں اکثر آتے رہتے تھے۔ جب ان کے گھر میں نہ پان ہوتا تھا نہ حقہ۔ اسے وہ بھی جانتے تھے اور جھمن بیگ بھی، آج بھی ویسا ہی موقع تھا۔

نواب صاحب نے جواب دیا:

''بھئی تمہاری خوشی اس میں ہے تو یہ ہی سہی۔

پھر انہوں نے اسفندیار کے پنجے اور چونچ دیکھ کر کہا:

بات کھلی تو نہیں؟''

ایک بوڑھے نے جو پھٹی رضائی اوڑھے کھڑا تھا، جواب دیا:

'' کیسے کھلتی۔ نواب استاد۔ اس فن میں تو آپ کا ثانی نہیں۔ وہاں کے استادوں نے پالی سے پہلے اس کی چونچ اور پنجوں کو کوب دیکھ لیا تھا۔ لیکن کسی کی سمجھ میں یہ معاملہ نہیں آیا۔

بوڑھے روشن لال نے کہا:

'' ایسی چونچ اور پنجے کون تراش سکتا ہے۔ آپ نے تو تراشنے کے بعد دھاریاں تک بنا دیں۔ قدرت کی کاریگری کا مقابلہ کیا ہے آپ کی تراش نے۔''

نواب۔ ارے روشن لال جی۔ کانٹوں میں کیوں گھسیٹتے ہو۔ یہ تو مشق کی بات ہے، لوگ چاول پر قل ہو اللہ لکھتے ہیں۔ میں چاہوں تو پوری الحمد چاول پر لکھ دوں۔''

''حق ہے۔''

''حق ہے''

''سچ ہے۔ سچ ہے۔ آپ ہی کی کاریگری سے اسفندیار جیتا ہے۔ ورنہ سہراب تو ایسا چنختا ہے۔ کہ شیر کیا چیخے گا۔ لیکن اس کی ضرب اسفندیار کی ضرب کے آگے

ایسی تھی، جیسے خنجر کے سامنے چاقو اور چھری۔''

باپ کے کمالوں کا تذکرہ سن کر شوکت کا سینہ چوڑا ہو گیا، اور وہ اپنی بھوک بھول گیا۔ اس کے پاؤں میں سردی لگ رہی تھی، اور جی چاہتا تھا، کہ رضائی اوڑھ لوں۔ لیکن کیسے اوڑھتا۔ وہ پھٹی ہوئی تھی۔

نواب رفیع نے اسفندیار کو موتھ دے کر کہا:

''بھئی آدھا کاغذ اسے اور موٹا کرو۔

''جھمن کیا کروں، اس کے لئے۔''

''کچھ نہیں میرے خیال میں شہد اور بالائیجو اسے دیتے ہو۔ اس میں ایک منقہ پیس کر ملا دیا کرو۔ اور ہاں رتی کا سولہواں حصہ کشتہ یاقوت بھی دو۔ لیکن لوگے کہاں سے۔ یہ کشتہ کسی لکھنؤ کے عطار کے یہاں سے نہ لے لینا۔ یہ جانے چوڑیوں کے ٹکڑوں سے بناتے ہیں۔ یا کاہے سے۔ ان کے کشتے میں ذرا جو طاقت ہو۔ حکیم اجمل خاں کے دواخانہ سے منگوا لینا۔''

ایک نوجوان جو صرف ایک موٹا کرتا پہنے ہوئے تھا۔ اپنے کپکپاتے دانتوں اور ہونٹوں کو سنبھال کر کہنے لگا۔

''اگر حکیم صاحب کو اسفندیار کا حال لکھ کر نسخہ لکھوایا جائے۔ یا دہلی جا کر دکھلا دیا جائے، تو کیسا رہے۔ حضور اغن صاحب؟''

روشن لال۔ ''حکیم صاحب بٹیروں کا حال کیا جانیں۔ بٹیر کے پاؤں میں کوئی نبض لگی ہوئی ہے، جس سے وہ حال جان لیں گے؟''۔

نواب اغن۔ حکیم صاحب تو بہت بڑے حکیم ہیں، وہ جانتے تو ضرور ہونگے۔ مرغوں اور بٹیروں کا حال۔ لیکن یہ لوگ ان فنون کی قدر نہیں کرتے ہیں۔

روشن لال ٹھیک کہا آپ نے۔ یہ نئے زمانے کے لوگ۔ وہ میرا بھتیجا جو وکالت کرتا ہے۔ وہ مرغ بازی اور بٹیر بازی کی ہنسی اڑاتا ہے۔

نواب رفیع ان لوگوں کی رگوں میں وہ گرم خون کہاں، جو بہادرانہ جنگوں پر کھول اٹھے۔وہ تو بس تاش کھیلنا جانتے ہیں۔

اغن سچ ہے نواب صاحب۔کیا بات کہہ دی آپ نے

نواب بھئی ہم تو بٹیروں اور مرغوں سے بہادری کے کارناموں کو زندہ کیے ہوئے ہیں۔ورنہ غدر کے بعد سے تو جسے دیکھو چوڑیاں پہنے بیٹھا ہوا ہے۔

نواب اغن ''چچا میں تو جب اپنے بانکے بہادر کو لڑتے دیکھتا ہوں، تو یہ محسوس کرتا ہوں، کہ گویا خود دشمنوں کے نرغے میں گھرا ہوا ہوں۔اور ان کو اپنی شمشیر زنی سے گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا ہوں۔۔۔

سردی کھاتا ہوا نوجوان۔اور جو اپنا بٹیر یا مرغ ہار گیا تو پھر حضور۔۔۔

روشن لال۔''تو کیا میاں صاحب زادے، تم نے نہیں سنا،

گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ سے

وہ طفل کیا گرے گا جو گھٹنوں کے بل چلے''

نواب رفیع۔کیا شعر پڑھ دیا ہے ظالم نے۔''

اغن۔''(ٹھنڈی سانس بھر کر) چچا بٹیر بازی سکھلا دیں، تو مرغ بازی سے توبہ کرلوں۔''

روشن لال۔نواب اغن۔بٹیر بازی، زربازی، سونا اڑاؤ تب ہیرا ہاتھ لگتا ہے۔جھمن بیگ کو دیکھو۔ج پندرہ سال خون تھوکا ہے۔تب یہ موتی (اسفندیار کی طرف اشارہ کرکے) ہاتھ آیا ہے۔''

ایک نوجون جو کشمیرے کی اچکن اور اسپر گلوبند لپیٹے ہوئے تھا، کہنے لگا:

لالہ جی، نواب اغن نے مرغ کے لیے کچھ کم کھویا ہے۔ساری جائیداد گنوا دی ہے، تب بانکے بہادر ملا ہے۔دیکھیے نواب صاحب کی شان۔اس میں پیوند تک لگ گئے۔''

نوجوان جوش محبت میں یہ کہہ گیا، لیکن آخری فقرہ سن کر سب سٹ پٹا سے گئے۔ اور ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ نواب اغن کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، اور یہ عالم ہو گیا کہ زمین پھٹے تو اس میں سما جائیں، یہ بات اس وجہ سے اور کھلی کہ کہنے والے کی حیثیت بہت معمولی تھی، وہ کشمیرے کی اچکن جو پہنے تھا۔ نواب رفیع نے کھنکار کر کہا۔۔۔

میاں صاحب زادے یہ پیوند نہیں ہیں۔ یہ تو رفتے ہیں۔ اور رفتے تو بڑے بڑے نوابوں کی شال میں لگے دیکھے گئے ہیں۔ مگر بھئی واللہ جس نے یہ رفتے لگائے ہیں کمال کر دیا ہے۔ نہ جھول نہ موڑ۔ نہ تناؤ۔ واہ کیسے کیسے کاریگر ہیں، ابھی لکھنو میں۔ یہ لوگ تو ایسے ہیں۔ کہ اگر کام نہ ہو تو بھی ان سے کام بنواؤ۔ بھئی مجھے ایسا آدمی مل جائے تو میں اپنی نئی شال میں بھی ایک دو رفتے تو ضرور لگوا لوں۔ کیوں بھئی اغن، تم نے تو بہت انعام دیا ہوگا اس کاری گر کو۔

نواب اغن اور محفل پر نواب رفیع الشان کی اس تقریر کا خاطر خواہ اثر ہوا، اور فضا بدل گئی۔ نواب اغن نے اپنے کو سنبھال کر اور مسکرا کر کہا:

چچا اس کو دیا تو کچھ ضرور، مگر اصل انعام تو اس بات کو سمجھیے، کہ یہ شال کندھے پر ڈالے گھوم رہا ہوں، جو ملتا ہے وہ بھی اس کی تعریف کرتا ہے۔ اور میں بھی تعریف کرتا ہوں،

”نواب رفیع یہ انعام تو سو انعاموں کا ایک انعام ہے۔ اب دیکھو ان میاں صاحب زادے ہی کو معلوم ہو گیا، کہ رقعہ لگانا کیسا فن ہے، اور اس کی قدر دانی کیسے کی جاتی ہے۔ اسی طرح بات معلوم ہوا کرتی ہے۔ کیوں بھئی؟

اس آخری بات سے نوجوان بہت شرمندہ ہو گیا۔ ذرا جھینپ گیا۔ اور کہنے لگا:

بجا ارشاد ہوا۔ مجھے بڑی قیمتی بات معلوم ہو گئی۔

رفیع۔ ”میاں صاحب زادے یہ بات تم نے سچ کہی تھی، کہ نواب اغن نے

لاکھوں روپیہ اڑادیا تب جا کے بانکے بہادر ہاتھ آیا ہے۔

نواب اغن مگر چچا حضور۔اب تو مرغ بازی سے توبہ کرنی پڑے گی۔اب یہ فن بھی جا رہا ہے۔کون قدر کرتا ہے بانکے بہادر کی؟

جھمن بیگ۔"نواب اغن یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔آج آپ کے بانکے بہادر کو کون نہیں جانتا ہے۔اخبار شطرنج میں تو اس کی خبر تک چھپ چکی ہے۔وہ جو ہیں ملیح آباد کے بڑے خاں صاحب، جب وہ لکھنؤ آتے ہیں۔اپنا کوئی نہ کوئی مرغ ساتھ لاتے ہیں اور کہیں نہ کہیں اسے لڑاتے بھی ہیں۔لیکن ان سے جہاں کہو، کہ بانکے بہادر سے مقابلہ ہوجائے۔وہ ہمیشہ یہی جواب دیتے ہیں، کہ میرے مرغ کا مزاج نصیب دشمناں ناساز ہے۔

نواب بہادری تو اس کی خیر مسلم ہے، لیکن ذرا، اس کی شان تو دیکھو، کس طرح چھاتی تان کر چلتا ہے۔اور کیا مردانہ وار ادھر اُدھر دیکھتا ہے۔جیسے نگاہوں میں کوئی جچتا ہی نہیں، معلوم ہوتا ہے جنگل میں شیر بے خوفی سے گھوم رہا ہے، جب مقابل میں کوئی مرغ ہوتا ہے تو کس غرور سے اس کے پنجوں، چونچ اور بازؤں کی طاقت کا جائزہ لیتا ہے۔جست تو اس غضب کی ہوتی ہے جیسے کڑی کمان کا تیر۔

اتنا کہہ کر نواب رفیع نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا۔

مگر بھئی اغن کا کہنا بھی سچ ہے۔اب یہ فن شریف لکھنؤ سے جا رہا ہے۔استادان فن ناقدری سے تنگ آ آ کر بھاگ رہے ہیں۔کوئی رام پور جا رہا ہے تو کوئی حیدر آباد"

اغن "حیدر آباد جو گئے ہیں ان کا حال تو مجھ سے سنیں۔بے چارے روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہاں تنخواہ و نخواہو انعام و اکرام سب کچھ ہے۔مگر وہ بات کہاں لکھنؤ کی سی۔"

کہتے ہیں کہ حیدر آبادی نواب اصیل مرغوں کی جگہ انگریزی نسلوں کے مرغے

پالتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ان کو موٹا کرو۔ جب استاد لوگ کہتے ہیں کہ حضور ان مرغوں کے بدن پر تو یوں ہی چربی ہوتی ہے۔ اگر ان کو دبلا نہ کیا جائے تو کم سے کم موٹا تو نہ کیا جائے۔ موٹا کیا تو لڑنے میں ان کا دم پھول جائے گا۔ پھر نہ چیخ رہے گی اور نہ چھلانگ۔ لیکن حیدر آبادی نواب ایسی باتوں پر کان نہیں دھرتے۔

روشن لال۔ ''وہ جو خود مشک کے برابر توند رکھتے ہیں۔ وہ لوگ کیا جانیں دبلاپے کی قدر۔

نواب اغن۔ ''ابھی سنئے تو استاد لوگ ان کی فرمائشوں سے مجبور ہو کر مرغوں کو کشتوں اور مروارید کی جگہ پر مکھن اور عرق انگور دلواتے ہیں۔ اور جب وہ کوب موٹے ہو جاتے ہیں تو آپ جانتے ہیں نواب صاحبان کیا کرتے ہیں؟

سب کیا کرتے ہیں؟

''ان کا موٹاپا دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آتا ہے، اور باورچی کو دے کر کہتے ہیں کہ بھون لاؤ

ساری محفل چیخ اٹھی۔

ارے، ارے

توبہ۔ توبہ''

اغن جی اولاد بنا کے ایسی حرکت۔ بھئی مرغ ہم میں سے کون نہیں کھاتا مگر۔۔

روشن لال۔ ''(ٹوک کر) کیا کہتے ہو نواب زادے۔''

اغن۔ ''ارے بھائی معاف کیجئے گا۔ یاد نہیں رہا، کہ آپ نہیں کھاتے، کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہم میں سے تو بہتیرے مرغ کھاتے ہیں۔ لیکن ایسے مرغ کو کون کھائے گا جسے متبنیٰ کر چکا ہے۔

نواب رفیع بھئی رام پور والے تو ایسے نہیں ہیں۔

جھمن بیگ ان کو تو دنبے لڑانے کا شوق ہے۔ اور اس کے بعد مرغوں کا۔ بٹیر تو ان کے نزدیک اتنی چھوٹی سی چیز ہے، کہ اس کی لڑائی نظر ہی نہیں آسکتی۔۔۔

نواب رفیع۔ "واہ رے لکھنؤ۔ یہاں تو ہم نے چرکوے تک لڑائے ہیں۔ لیکن ان نازک لڑائیوں سے لطف لینے کے لئے بھی اسی ذوق کی ضرورت ہے۔ جس سے انیس و دبیر کے کلام سے لطف لیتے ہیں،

جھمن بجا فرمایا آپ نے۔ وہ خاں صاحب والا واقعہ یاد ہے۔ ان کا بٹیر ہار گیا، تو لوگوں نے شور مچایا، کہ خاں صاحب ہار گئے۔ یہ سننا تھا کہ خاں صاحب لاٹھی تان کر کھڑے ہو گئے۔ گرج کر بولے کیا شور مچا رکھا ہے۔ کہ خاں صاحب ہار گئے، مٹھی بھر کا بٹیر ہار گیا ہے یا میں ہار گیا ہوں۔ کسی مائی کے لال میں ہمت ہو تو آ کر پٹھان کا مقابلہ کر دیکھے۔ وہ تو کہو، خلیفہ موجود تھے۔ ان کا سب لحاظ کرتے تھے۔ انہوں نے آنکھ ماردی اس لئے خاں صاحب سے کوئی نہیں بولا۔ ورنہ وہاں تو ایک سے ایک پھنکیت موجود تھا۔ بٹیر بازی بات کی بات میں لٹھ بازی بن جاتی۔

اغن یہ خاں صاحب تو بس اکھاڑے کے مرد ہیں۔

وہاں صبح سے شام تک کشتیاں دیکھتے رہتے ہیں۔ اور خود بھی زور کرتے ہیں۔ لیکن بٹیر بازی کے میدان میں تو اس طرح چر چراتے ہیں جیسے ہریلا جواری

نواب رفیع میاں اغن، اکھاڑے کی بات اور ہے۔ بٹیر بازی میں ایک طرف خون کے فوارے چلتے ہیں۔ اور دوسری طرف رگوں میں آگ دوڑتی ہے۔ بھئی اس میدان میں بڑے صبر اور شرافت کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے میر سلطان علی مرحوم کی آنکھیں دیکھی ہیں۔ ان کا مرغ یا بٹیر ہار جائے تو بھی اسی طرح مسکراتے تھے۔ جیسا اس کے جیت جانے پر۔ یہ وضع داریاں کشتی والوں اور لٹھ بازوں میں کہاں۔

سرخ محل کی ڈیوڑھی کے گھڑیال نے دس بجائے۔ ان کو گن کر جھمن بیگ نے

جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی اور پھر کہنے لگے:

استاد حضور رخصت کی اجازت چاہتا ہوں۔ نئے بٹیروں کو موٹھ کرنا ہے۔ جھمن بیگ کے ساتھ اغن کے سوا سب کھڑے ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد اغن نے کہا۔

چچا میرے بارے میں کیا حکم ہے؟

نواب رفیع بھئی اغن مرغ کا پالنا اور ہاتھی کا پالنا برابر ہے۔ اس کا کھانا، اس کی دیکھ بھال، صفائی، تعلیم اور ریاض۔ یہ سب کچھ بہت کٹھن کام ہیں۔ رونق مرزا بے چارے نے اس کی خاطر بیوی بچے بھی چھوڑ دیے۔ اس پر بھی کام نہ بنا تو چوری کی۔ سنا ہے کہ اس نے عدالت میں کہا تھا کہ مرغ کہ ذمہ داری بیوی بچوں اور اپنی ذات سے بھی اونچی چیز ہوتی ہے، مگر عدالت نے اس کی بات کی قدر نہ کی اور اسے جیل بھیج دیا۔ ہا بے چارہ!! میں جانتا ہوں کہ اللہ کا دیا بہت کچھ ہے تمہارے پاس۔ اور تم ابھی برسوں اس شوق کو چلا سکتے ہو۔ لیکن اپنی بیگم اور بچوں کا خیال کرو۔ یہ بھی دیکھو بیگم کے لئے ت و بانکے بہادر سوتیلا بیٹا ہے وہ اس کے لئے کیوں مصیبتیں جھیلنے لگی۔

نواب رفیع سوچنے لگے اور پھر بولے:

سوچتا ہوں، لالہ شیام ناتھ سے بات کروں۔ اگر مرغ وہاں رہا تو گویا تمہارا ہی رہا۔ تمہارے ہی نام سے لڑایا جائے گا۔ اور ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ تم کو۔۔۔ ہاں ہاں تم کو اس کی ضرورت نہیں۔ لیکن دوسرے کو بھی شکریہ کا موقع دینا چاہیئے۔ سو دو سو روپیہ شکرانہ معمولی رقم ہے۔

اغن چچا آپ نے تو دل پر گھونسا مار دیا۔"

رفیع "اگر مجھے بزرگ سمجھتے ہو تو بس چپ رہو اس معاملہ میں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دو،، کل سہ پہر کو آجانا۔"

جب اغن چلے گئے تو نواب نے شوکت سے کہا:

اغن کا شوق کتنا سچا ہے۔ ہائے کیا بیتے گی اس کے دل پر جب بانکے بہادر کسی دوسرے کے گھر جائے گا۔ لیکن میں سمجھ گیا ہوں ہوگا دوسرا تیسرا فاقہ اس کے گھر میں۔ مرغ کا اونڈا ابھی بالکل خالی تھا۔ کتنی نحیف آواز تھی اس کی۔

ہاں بیٹا مہری اس وقت بھی نہ آئی۔ ان لونڈی بچوں نے خود ہی کہلایا تھا، کہ شادی کے زمانے میں دونوں وقت کھانا آئے گا۔ اور خود ہی دو روز بھیج کر بند کر دیا، کیسے کیسے لوگوں کو عروج مل رہا ہے اس زمانے میں۔۔۔۔

ہائے۔۔۔ افسوس پر کار چراغ بلند''

اچھا جاؤ اور دو پیسے کی نہاری روٹی تحسین کی مسجد سے ادھار لے آؤ۔

شوکت یہ سن کر ذرا ہچکچایا، اور پھر کہنے لگا، پچھلے پیسے باقی ہیں اس کے کتنے؟

چھ آنے

ہوں اس سے کہہ دینا، کہ سب جلد ہی ادا ہو جائے گا۔ اب ایسی بات بھی نہیں ہے کہ وہ چھ آنے کی وجہ سے اور قرض نہ دے۔ ہائے اپنا علاقہ! تب کیا دن گزرتے تھے، اور اب کیا گزر رہے ہیں۔ اور جانے کب تک یہ حال رہے؟

شوکت نے جامے ور کا انگرکھا پہن رکھا تھا، جس میں درجنوں چھوٹے بڑے چھید تھے، لیکن وہ تھی بڑی نادر چیز۔ اس کے رنگوں میں ابھی تک تازگی باقی تھی۔ ایسی تازگی جو زخموں کو چھپا لیتی تھی۔

اس نے ایک اور رومال مین پیالہ باندھا اور چوک کی طرف چلا۔ شوکت کو نہاری روٹی لینے اکثر جانا پڑتا تھا، اور اس کے لئے ہاتھ میں پوٹلی لے کر آدھے چوک سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ چیز اسکی نواب زادگی پر بہت شاق گزرتی تھی۔

شوکت اپنی لمبی گلی سے گزر کر چوک کے پاس پہنچا ہی تھا کہ ایک طرف سے

تان کی آواز آئی۔۔۔

آ، آ، آ، آ، آ۔۔۔۔۔۔

شوکت کے دل پر یہ آواز ایک نامعلوم اثر کرتی تھی۔ جس کا سمجھنا اس کے بس سے باہر تھا، عجیب میٹھا میٹھا درد پیدا ہو جاتا تھا۔ اس آواز سے اس کا سابقہ پہلے پہل نواب جانی کی شادی میں پڑا تھا۔ جب ملکہ جان نے لوگوں کے اصرار پر اپنی گیارہ سالہ بیٹی مہ لقا سے ایک غزل گوادی تھی۔ کیا شعر تھا اس میں:۔۔

لکھی تھی حسن پرستی ازل سے قسمت میں

میرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا!

اس راستے سے گزرتے وقت وہ اکثر اس آواز کو سنا کرتا تھا۔ اس وقت جو اس نے یہ آواز سنی تو سب کچھ بھول گیا اور دیوار کے پاس کھڑا ہو کر آ۔ آ۔ سننے لگا، جب تان چڑھتے، چڑھتے، بہت اوپر پہنچ کر ایک جھونک کے ساتھ لہراتی ہوئی نیچے اترتی تھی، تو اسے ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے کوئی زخمی دل میں گدگدی پیدا کر رہا ہے۔

آ۔آ۔آ۔آ۔۔۔۔۔

آ۔آ۔آ۔آ۔۔۔۔۔

یہ ملکہ جان کے بالا خانے کی پشت تھی، اس کے نیچے بھی ایک کمرہ تھا جو گلی کی طرف کھلتا تھا۔ اس وقت اس میں تعلیم ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے دروازے بند تھے۔

اتنے میں کسی نے کمرے کا دروازہ کھولا اور کہا:

آؤ بیٹے اندر آ کے سنو۔"

یہ ملکہ جان خود تھی۔ بال کھلے۔ چہرہ اڑا، اڑا سا، بھاری جسم، ملگجی ساڑھی بے ہنگم طور سے لپٹی ہوئی۔۔۔

شوکت کو اسے دیکھ کر کراہت سی آئی۔ لوگ اسی پر مرتے ہیں۔ اس نے جلدی سے کہا معاف کیجیے گا۔

پھر گھبرا کر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا گلی سے نکل کر چوک میں داخل ہو گیا۔ لیکن چلتے وقت کھلے دروازے سے اس کی نظر مہ لقا پر پڑ گئی۔ جس کا بھولا چہرہ بڑی بڑی بالیوں کے ہالے کے بیچ میں چمک رہا تھا۔

وہ تو بھاگ آیا لیکن مہ لقا کی آواز اس کے کانوں اور دل کا پیچھا کرتی رہی۔

آ۔آ۔آ۔آ۔آ

آ۔آ۔آ۔آ۔آ۔

ادھر اس آواز میں چوک کا شور و شغب شامل ہوا، اور ادھر شوکت کو یہ احساس ہونے لگا، کہ کہاں میں اور کہاں یہ سودا خریدنا، اور خرید کر گزرنا۔۔۔۔ ہمیں تو موت ہی آئی شباب کے بدلے۔

لالہ شیام ناتھ کی بارہ دری میں جب نواب صاحب پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ شیخ رسول بخش بھی موجود ہیں۔ یہ بات ذرا ویسی رہی۔ کیونکہ شیخ جی بھی مشہور مرغ باز تھے۔ ان کی موجودگی میں اگر بانکے بہادر کے بارے میں لالہ جی سے بات چیت کی جائے گی۔ تو انہیں ضرور ناگوار ہوگا، کہ یہ مشہور مرغ مجھے کیوں نہ دیا۔

لالہ جی نے نواب صاحب کو دیکھتے ہی کہا۔

آیئے، آیئے نواب صاحب آج کدھر کا چاند نکلا؟'

"کیا بتاؤں لالہ جی۔ بہت دنوں سے ادھر آنے کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن ایسی مصروفیتیں رہیں کہ بس"

میں تو سمجھا تھا کہ آپ مجھے بھول گئے۔

ارے ایسا کہاں ممکن ہے۔ وہ پتنگ بازیاں کہیں بھولنے والی چیز ہیں۔

لالہ بس اتنا ہی یاد ہے۔

نواب ارے بھائی اب وہ باتیں تو یاد نہ دلاؤ

ماجرائے نوجوانی عہد پیری میں نہ پوچھ

شرم آتی ہے اب اس قصے کو دہراتے ہوئے

لالہ۔ ''کبھی ادھر سے گزرتے بھی ہو۔''

''خالی ہاتھ کیا گزروں۔ اپنی وضع تو یہ رہی ہے کہ جب گئے خاصدان میں سو ڈیڑھ سو رکھ آئے۔

شیخ جی آج کل تو کوئی بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ گرانی کتنی ہے۔ غضب خدا کا چار سیر کا آٹا بک رہا ہے۔ آدھ سیر کا گھی۔ پانچ روپے خشک تنخواہ پانے والے جانے کتنی زندگی ہیں۔''

نواب ہاں شیخ جی آٹے دال کا بھاؤ۔ تم نہ جانو گے تو کون جانے گا۔

شیخ تم تو ٹھہرے نواب۔ نہ گھر کی فکر نہ شہر کا اندیشہ۔''

لالہ جی قاضی بننا تو آپ ہی کی قسمت میں آیا۔

نواب شیخ جی کاش ایسی ہی زندگی ہوتی۔ جیسا آپ کہہ رہے ہیں: یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا یا میرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا۔''

پیادے نے آکر فرشی سلام کیا۔

لالہ جی کیا بات ہے۔''

پیادہ حضور یہ پڑوس میں جو اخبار والے ہیں۔ ان کے یہاں پولیس آگئی ہے۔

لالہ جی پولیس؟''

نواب شیخ آئیں۔ غضب!!

لالہ جی کیا کیا تھا ان لوگوں نے

شیخ میں تو سنتا ہوں کوکین بیچتے ہیں یہ لوگ

نواب ہوسکتا ہے چوری کا مال نکلا ہو۔

لالہ جو بھی ہو آبرو گئی، اب کون پوچھے گا، کہ بے قصور ہو یا نہیں۔ سب یہی کہیں گے کہ ان کے گھر پولیس آگئی تھی۔

اتنے میں وکیل سردار خاں آ گئے۔

سردار خاں آداب بجالاتا ہوں۔

لالہ جی آداب عرض ہے۔

سردار۔مزاج شریف۔آپ کا مزاج۔آپ کا شیخ جی۔

لالہ جی آپ کی دیا ہے۔

شیخ جی الحمدللہ۔

نواب صاحب۔آپ کی مہربانی۔آپ کا مزاج سردار خاں صاحب

سردار صاحب۔الحمدللہ

لالہ جی بھئی وکیل صاحب یہ اخبار والا کیوں پکڑا گیا؟''

سردار۔''سرکار ایک قانون بنا رہی ہے۔اس کے خلاف اس نے کچھ اپنے اخبار میں لکھا تھا''

لالہ جی تو یوں کہو بغاوت کے الزام میں پکڑے گئے۔

نواب بغاوت تو چوری اور قتل سب سے بری ہوتی ہے۔حاکم وقت کے خلاف کوئی کام کرنا،اور حاکم بھی کیسا۔جس نے قیصر جرمنی اور سلطان ٹرکی کو ابھی سال بھر ہوا جنگ کے میدان میں شکست دی تھی۔

شیخ کیوں وکیل صاحب کیا اس شخص کا دماغ چل گیا۔جو اس طرح سرکار سے بھڑ گیا۔

لالہ جی خراب ہی ہو گا کہاں راجا بھوج کہاں گنگوا تیلی۔

سردار خاں اخبار والا کانگریسی ہے۔

نواب بھئی وکیل صاحب یہ کانگرسی کیا ہوتے ہیں۔کانگریس کیا کوئی خاص مذہب ہے۔

سردار خاں کانگریسی مسٹر گاندھی کو اپنا رہبر مانتے ہیں۔

نواب۔ یہ مسٹر گاندھی کون ہیں؟۔

سردار خاں۔ ایک گجراتی ہندو ہیں۔ جو کہتے ہیں، انگریز سرکار کو ہرا کر وہ ہندوستان جیت لیں گے۔

نواب۔ کیا ان کے پاس قیصر جرمنی سے بھی بڑی توپ ہے؟

سردار خاں توپ، بندوق کچھ نہیں۔ کہتے ہیں وہ اس سرکار کو نہتا ہی ہرا دیں گے۔

یہ سن کر سب نے قہقہہ لگایا۔

نواب۔ ''اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں وہ اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں۔

نواب وکیل صاحب اب اتنا اور بتا دیجیے کہ یہ خلافت کیا چیز ہے۔

وکیل وہ ٹرکی کے خلیفہ جو لڑائی میں ہار گئے ہیں نا۔ اور انگریزوں نے جن کی حکومت چھین لی تھی، خلافت والے کہتے ہیں کہ ان کی حکومت ان کو واپس دے دو۔''

لالہ جی واہ بھئی میں سمجھتا ہوں، کہ یہ سرکار کے خلاف ہونے والی خرابی ہے۔ مگر بھئی کسی فاتح نے بھی ایسا کیا ہے۔ کہ فتح کیا ہوا **ملک** خیرات میں دے دیا ہو، جو انگریز خلافت والوں کو **ملک** دے دیں''

نواب انگریز اپنی جیتی ہوئی سلطنت واپس کر دیں۔ خوب۔ اور وہ جوان کے لاکھوں آدمی مرے اور کروڑوں روپیہ گولہ بارود کی شکل میں اڑ گیا۔ وہ ان کو کون لوٹائے گا۔

شیخ سنا ہے بڑے بڑے مسلمان خلافت میں شریک ہو رہے ہیں۔

نواب کوئی بھی شریک ہو، لیکن جب تک بات عقل میں نہیں آتی میں نہیں مانتا، یہ بھی کوئی بات ہے کہ کانگرس والے کہتے ہیں کہ بغیر لڑے بھڑے سلطنت جیت لیں

گے ۔ اور خلافت والے کہتے ہیں، کہ شور مچا کے ٹرکی کے خلیفہ کو سلطنت دلا دیں گے۔

لالہ جی یہ بھی تو وہ دیکھیں، کہ انگریزوں کی طرف فوج، توپ اور بندوق کے علاوہ اقبال بھی ہے ۔ جرمنی کے ایسے سائنس جاننے والے ملک کو کیوں کر ختم کر دیا۔ سنا ہے اب وہاں لوگ درختوں کی چھالوں اور کتے کے گوشت سے پیٹ بھرتے ہیں۔''

شیخ اور ٹرکی کے بہادر تلوار باز سپاہیوں کو بھی تو ہرا دیا۔''

نواب وکیل صاحب یہ بھی تو کھلا کہ قیصر جرمنی مسلمان ہو گیا یا نہیں ۔؟

شیخ جو بھی کچھ ہو بھائی۔ اس نے وہ، وہ بہادریاں اور وہ، وہ چالاکیاں دکھلائی ہیں، کہ چھکے چھڑا دیے، افسوس قسمت نے ساتھ نہ دیا۔''

نواب قسمت کی بدنصیبی کو صیاد کیا کرے۔''

لالہ جی اماں وکیل صاحب یہ اخبار والے جیسے بھی ہوں، مگر ہیں ہمارے پڑوسی ۔ انکے لئے کچھ ہو سکتا ہے؟''

وکیل ہاں ضمانت تو ہو سکتی ہے شاید ۔

لالہ جی کچھ سوچ کر، پھر پتہ لگائیے ۔ ہو سکے تو کچھ کیا جائے ۔

وکیل صاحب اٹھ کر باہر چلے گئے ۔ اب موقع تھا گفتگو چھیڑنے کا، اس لیے نواب صاحب نے یوں ابتدا کی۔

لالہ جی آپ کے مرغوں کا مزاج کیسا ہے۔

لالہ جی مرغ ؟ (ٹھنڈی سانس بھر کر) کیا بتلاؤں نواب آج پندرہ روز ہوئے ہیں ۔ کہ لال صاحب آئے اور ایک کاغذ دکھلانے لگے ۔ جس پر مرغ بازی کے اخراجات کی تفصیل موجود تھی۔

دو ملازم سو روپے ماہوار۔ دوائیاں اور مقویات ایک سو پچاس روپے

ماہوار متفرقات انعامات وغیرہ بیس پچیس روپے ماہوار، کاغذ دکھلا کر کہنے لگے اتنے میں تو موٹر رکھا جا سکتا ہے۔ جس سے شہر میں عزت ہو۔ میں نے سمجھایا کہ بیٹا مرغ بازی شاہوں کا شوق ہے۔ اس سے دلی، رام پور، اور حیدر آباد بلکہ لاہور تک نام ہوتا ہے۔ دور، دور سے لوگ لڑائی دیکھنے آتے ہیں۔ مرغوں کی لڑائی دیکھ کر ہماری بہادری کی آب پاشی ہوتی ہے۔ یہ ہمارے مٹے ہوئے عروج کی نشانی ہیں۔ وہ کہنے لگے اب تو یہ نکموں اور تضیع اوقات کرنے والوں کا مشغلہ ہے۔ وہ لوگ مرغوں کی ہار جیت کے تذکرے ہروقت کرتے رہتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ زمانے بھر میں یہی ہو رہا ہے۔ اتنی سخت بات سن کر میں نے گردن جھکالی۔ اب بچوں کے منہ کون لگے۔ اب ہم سب گویا نکمے ہیں۔ لیکن دل مین یہ بھی سوچا، کہ ایک زمانہ تھا۔ جب ہم ہی ہم تھے۔

لیکن اب پڑھ پڑھا کر نئی روشنی کے لوگ نکل آئے ہیں۔ جو نئی طرح کی باتیں سوچتے ہیں۔ وہ کیا جانیں مرغ کیا ہوتا ہے اور مرغ بازی کیا ہوتی ہے۔ اس طرح میری مرغ بازی ختم ہوگئی۔

نواب پھر آپ نے مرغوں کا کیا کیا؟

لالہ جی میں نے اسی دن شیخ صاحب کو بلایا، اور یہ قصہ سنا کر اب سب مرغ آپ کے حوالے،، سپردم بتو مایۂ خویش را،

تو دانی حساب کم وبیش را۔

لیکن افسوس یہ کام بھی نہ بنا،

شیخ جی ''یہ کہو کہ قسمت میں دولت نہ تھی۔ ہوا یہ کہ بیس دن کی بات ہے۔ یعنی لالہ جی والے واقعے سے کوئی پانچ چھ دن پہلے کی بات ہے۔ کہ کسی طرح ڈربے میں سانپ پہنچ گیا۔ اور اس نے میرے دونوں چہیتے مرغوں دولہا اور شمشیر کو سونگھ کر شہید کر دیا۔ آہ کلیجے پر وہ چوٹ لگی کہ دنیا تاریک ہوگئی۔ میں دن بھر روتا رہا۔ رات کو تہیہ

کرلیا، کہ اب جیتے جی کوئی شوق نہ کروں گا۔''

نواب صاحب، پھر کیا کیا آپ نے باقی مرغوں کا۔ کیا اپنے بھتیجوں کو دے دیا؟

شیخ جی بھتیجے۔ ارے صاحب ان کا حال نہ پوچھیے، وہ دونوں خلافت میں یا کانگرس میں یا کسی اور اسی قسم کی چیز میں شریک ہو گئے ہیں۔ داڑھی رکھ لی ہے، اور بہت موٹے کپڑے کے کرتے پاجامے پہنتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مرغ بازی اور بٹیر بازی اور سب بازیاں بہت بری چیز ہیں۔ ان کے نزدیک آوارہ گردی اور شہدا پن ایک طرف اور بازیاں ایک طرف۔ کوئی نیا اخبار نکلا ہے۔ اس میں ایسی ہی باتیں چھپا کرتی ہیں۔ اسے یہ لوگ خریدتے ہیں اور زور زور سے پڑھتے ہیں، تاکہ میرے کان میں بھی آواز جائے۔ میں بھی طرح دیتا رہتا ہوں اب بچوں کے منہ کون لگے۔

لالہ جی ان لوگوں نے سب بازیوں کو تو فضول خرچی قرار دے دیا ہے۔ اور ایک نئی فضول خرچی نکال لی ہے جو ان سب سے چوگنی ہے۔''

شیخ جی وہ کیا؟''

لالہ جی یہ چندے کا چلن جو چل نکلا ہے۔ پرسوں میرے لال جی نے دو ہزار روپیہ گاندھی جی کے چندے میں دیے۔ اب پوچھو ان دو ہزار سے تو مرغ بازی سال بھر مزے سے ہو سکتی تھی۔ لیکن اب میں کیا کہوں؟

شیخ جی یہ چندے کا چلن بھی خوب ہے اب تو سب کام چندے سے ہونے لگے ہیں۔

آپ نے چندے کا میلاد شریف کبھی نہیں سنا ہوگا۔ لیکن اس سال امین آباد میں چندے سے میلاد شریف ہوگا۔ کیا زمانہ ہے کبھی ہم لوگ ساجھے کی تجارت پر ہنسا کرتے تھے۔ لیکن اب تو ساجھے سے بڑی بڑی تجارتیں ہوتی ہیں۔ اور اسے کمپنی

کہا جاتا ہے۔

لالہ جی۔جی ہاں۔جی ہاں۔یہ جو قیصر باغ میں چلتی پھرتی تصویروں کا کھیل دکھلانے والا گھر بنا ہے۔اسے کسی کمپنی نے بنایا ہے۔

لالہ جی۔جی ہاں۔جی ہاں۔یہ جو قیصر باغ میں چلتی پھرتی تصویروں کا کھیل دکھلانے والا گھر بنا ہے۔اسے کسی کمپنی نے بنایا ہے۔جس میں ہزاروں آدمیوں کا چندہ شامل ہے۔''

نواب صاحب نے دونوں کی باتیں سن کر بہت گہری ٹھنڈی سانس بھری، اور سوچ میں پڑ گئے، کہ اب اغن کے لئے کیا کیا جائے۔

ملازم نے نئی سٹکیں لا کر رکھ دیں، پرانی اٹھا کر لے گیا۔خاصدان میں اور پان آگئے، لالہ جی کے دو مصاحب بڑے آغا اور ڈکشٹ جی بھی آگئے۔اور جرمنی کی بہادری پر تبصرہ ہونے لگا، ان دونو کا خیال تھا، کہ جرمنی دراصل ہارا نہیں ہے، یہ ہار بھی اس کی ایک چال ہے۔

کسی طرح انگریز اس سے غافل ہو جائیں تو یہ پھر حملہ کر دے۔اب جو وہ حملہ کرے گا تو کسی بہت ہی خطرناک ہتھیار سے حملہ کرے گا۔

لالہ جی نے کہا اگر لڑائی کچھ دنوں اور چل جاتی تو ہندوستان کا بہت فائدہ ہوتا۔

بڑے آغا یہ کیسے لالہ جی،

لالہ جی، لڑائی کے زمانے میں زنگ خوردہ کیلیں تک بکیں، پیسے بک گئیں۔ غریبوں نے اپنے گھروں کی دیواروں سے سڑی گلی کیلیں تک نکال کر بیچ ڈالیں۔ ہزاروں آدمیوں کا اس طرح بھلا ہو گیا۔''

کاروبار کے معاملہ میں یہ لوگ لالہ جی کی باتوں کو حرف آخر سمجھتے تھے۔کیونکہ انہوں نے ناکارہ لوہے کی تجارت سے لاکھوں بنا لیے تھے۔اور اس سے بارہ بنکی کے علاقے میں ایک بہت بڑا علاقہ خرید لیا تھا۔

نواب صاحب کے دل پر بانکے بہادر کی فکر ایسی چھائی ہوئی تھی، کہ انہوں نے گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ البتہ جب قیصر جرمنی کی تعریفیں ہونے لگیں، تو انہوں نے بہت زور دے کر کہا، کہ مجھے یقین ہے کہ قیصر جرمنی مسلمان ہو گیا تھا۔

چلمیں پھر بدلی گئیں اور خاصدان میں نئے پان پھر آ گئے، رات کافی آ گئی تھی۔ اس لئے لوگ اب جانے کے لئے اٹھنے ہی والے تھے، کہ ایک عجیب واقعہ رو نما ہوا۔

ایک لڑکا سر پر گٹھڑ رکھے بھاگتا ہوا دیوان خانے میں گھس آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے لاٹھی لیے ہوئے چوکیدار بھاگتا ہوا آیا۔ اور اس نے بڑھ کر لڑکے کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچنے لگا۔ تم کون ہو''

لڑکا یہ سن کر گھبرا گیا، کہ انہوں نے مجھے پہچانا نہیں۔ پھر لالہ جی کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھ کر کہنے لگا۔

میں مرزا صاحب کا لڑکا ہوں فرخ۔ اخبار والے مرزا صاحب۔ مساوات اخبار والے۔ مجھے ابا جان نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔

اچھا، اچھا سمجھ گیا میں کیا معاملہ ہے۔؟''

لڑکا یہ کاغذات ضروری ہیں۔ پولیس کے ہاتھ نہ لگنا چاہیئے۔ پولیس اس وقت گھر کی تلاشی لے رہی ہے۔ مین ان کو لے کر نابدان سے نکل کر بھاگا ہوں۔ ان کو آپ چھپا لیجیئے۔

یہ سن کر لالہ جی کا رنگ اڑ گیا۔

تو۔ میں۔ میں۔ کیا کروں، ان کا چھپانا تو جرم ہو گا۔ لے جاؤ۔ میرے یہاں سے ابھی۔ کہیں لے جا کر جلا دو۔

شیخ جی۔ واہ لالہ جی۔ ابھی پڑوس کے حق کی باتیں کر رہے تھے۔ چلو بیٹا میرے ساتھ۔ مین ان کو ابھی ٹھکانے لگوا دیتا ہوں۔ گومتی زیادہ دور نہیں ہے۔

لڑکا مگر سنیئے تو۔ یہ تو ضروری کاغذات ہیں۔ ان کو کہیں چھپا کے رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ قوم اور وطن کی خدمت ہو گی۔

شیخ جی بپھر کر کیا ان کو اپنے گھر رکھ لوں۔ کچھ الو ہوں۔ بھاگ یہاں سے بڑا آیا ہے لقمان بن کر۔

لالہ جی آپ نے ان لوگوں کو اتنا منہ کیسے لگایا؟

لالہ جی بھئی منہ لگانا کیسا پڑوسی ہیں ہم لوگ۔ یہ روزگار تو ان لوگوں نے اب شروع کیا ہے۔ مگر کیا روزگار ہے۔ سرکار کی بغاوت۔''

بھئی لڑکے اب تم جاؤ یہاں سے، اپنی گٹھڑی لے کے۔ اگر پولیس آ گئی تو۔۔۔

لڑکے نے جھک کر گٹھڑی اٹھائی اور چلنے کا ارادہ کیا۔ وہ ابھی گھوما ہی تھا کہ بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ اور داروغہ جی معہ دو کانسٹیبلوں کے اندر آ گئے۔ ان کو دیکھتے ہی لالہ جی، شیخ صاحب اور نواب صاحب سروقد کھڑے ہو گئے۔ لالہ جی تو تھر تھر کانپنے لگے، بڑی مشکل سے ان کی زبان سے نکلا:

آیئے، آیئے داروغہ جی۔''

داروغہ جی نے گھور کر لڑکے کی طرف دیکھا، اور گھوم کر لالہ جی پر ایک نظر ڈالی اور بولے:

ہوں''۔۔۔

لالہ جی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ یہ لڑکا جانے کیا اخور اٹھا لایا ہے۔ میں کہہ رہا تھا کہ لے جاؤ اسے یہاں سے۔''

ڈکشٹ جی۔ جو داروغہ جی کے ساتھ، ساتھ آئے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کب کھسک کر باہر پہنچ گئے تھے، کہنے لگے:

''صحیح فرما رہے ہیں، لالہ جی۔۔۔ داروغہ صاحب''

داروغہ جی تم سے کون پوچھ رہا ہے۔ ہاں لالہ جی تو آپ کا بیان یہ ہے کہ۔ لیکن اس وقت تو مال آپ ہی کے گھر میں ہے۔

لالہ جی حضور صحیح فرمایا، آپ نے لیکن دیکھیے تو کہ وہ لڑکے ہی کے ہاتھ میں ہے۔ گھر میں ہونے سے کیا ہوتا ہے قبضے میں تو اسی کے ہے۔

داروزہ جی کیا باتیں کرتے ہو لالہ جی۔ بھلا عدالت ایسی بات کو مان لے گی۔ یہ بغاوت کا معاملہ ہے بغاوت کا۔

لالہ جی عدالت۔ بغاوت۔ بھگوان نہ کرے، ایسی بات ہو۔ کیا بات کہتے ہیں آپ؟

ارے کوئی جا کے وکیل صاحب کو بلا لاؤ۔

ارے شیخ جی تم ہی بتلاؤ کہ کیا کروں؟

ہے، بھگوان۔۔ ارے جلدی سے لال صاحب ہی کو بلا لاؤ۔ وہ ابھی جا کے کپتان صاحب سے بات چیت کرلیں گے۔

لالہ جی کا زنان خانہ پاس ہی تھا۔ وہاں بھی خبر پہنچ گئی کہ پولیس آ گئی ہے۔ عورتیں بدحواس ہو کر مردان خانے کے پاس آ گئیں، اور رونا دھونا اور پرارتھنا کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گھر بھر کے ملازم بھی مردانے میں آ کر ایک کونے میں لگ کر کھڑے ہو گئے۔ داروغہ جی جوتا پہنے ہوئے دودھ جیسی چاندی پر ٹہل، ٹہل کر ادھر اُدھر کی الماریاں دیکھنے لگے۔ پھر بولے تلاشی لینا پڑے گی۔

اس موقع پر ڈکشٹ نے لالہ جی کے پاس جا کر کان میں کچھ کہا۔ اسے سن کر لالہ جی کے چہرے پر ذرا اطمینان کی جھلک آئی۔ مگر فوراً ہی ایک پر رنگ کی زردی چھا گئی وہ کراہتے ہوئے اٹھے، اور کراہتے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ داروغہ جی بوٹ پہنے فرش پر ٹہلتے رہے، اور مونچھوں پر تاؤ دیتے رہے۔ دس منٹ میں لالہ جی نوٹوں کی ایک گڈی لے آئے، اور کہنے لگے:

حضور یہ آپ کے ماتحتوں کا نذرانہ ہے۔ اب اس بات کو رفع دفع کر دیجیے۔

داروغہ نے کانسٹیبلوں کی طرف دیکھا، جو دروازہ کے پاس کھڑے مسرت بھری نظروں سے نوٹوں کی گڈی کو تک رہے تھے۔ اور کہا:

چلو لڑکے کو گرفتار کر کے لے چلو۔ مگر لڑکا کہاں ہے؟

ارے لڑکا کہاں ہے؟

"کدھر گیا ہے۔"

کسی نے دیکھا اسے جاتے ہوئے؟

فرخ مرزا کہیں نہ ملا۔ اس کے ساتھ گھڑی بھی غائب تھی۔ کوئی نہ بتلا سکا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ اور کیسے گیا ہے۔

نواب صاحب لالہ جی کے گھر سے لوٹے تو ان کے دل پر ایک نہیں کئی بوجھ تھے۔ جن سے وہ بہت افسردہ تھے۔ ایک بڑا بوجھ تو یہ تھا کہ میری آنکھوں کے سامنے لالہ جی پر داروغہ جی نے بے جا دباؤ ڈالا۔ اور رکشٹ جی نے لالہ جی کی گھبراہٹ سے فائدہ اٹھا کر نوٹوں کی گڈی ان کو دلوادی۔ جس میں وہ غالباً خود بھی حصہ پائیں گے۔ میں سب کچھ دیکھتا رہا، مگر کچھ نہ کر سکا۔ ان کو اس بات کا بھی دکھ تھا کہ میں بانکے بہادر کو فاقوں سے اور نواب اغن کو اس جانکاہ فکر سے نجات نہ دلا سکا۔ ان کو اس بات کی بھی فکر تھی کہ میں گھر جا کر اپنے اور اپنے بیٹے کے کھانے کا کیا بندوبست کروں گا۔ ڈیڑھ دن سے خود انہوں نے ایک نوالہ نہیں کھایا تھا، اور لڑکا جس کی بڑھوتری کے دن تھے، اس کو ڈیڑھ دن میں صرف ایک روٹی ملی تھی۔

نواب صاحب کو اگر موقعہ ملتا تو وہ لالہ جی سے کچھ ادھار ضرور مانگ لیتے۔ خاص کر اس وجہ سے کہ ان کو اپنی جگہ یقین تھا کہ اگر پریوی کونسل میں مقدمہ گیا، تو میں ضرور جیت جاؤں گا۔ صرف اتنا ثابت کرنا تھا کہ میرے باپ اور ماں میں شادی ہوئی تھی۔ اس حقیقت کو ثابت کرنا کیا مشکل ہے۔ میری ماں شریف گھرانے

کی بیٹی تھی۔ بھلا کوئی گھرانا اپنی بیٹی کو بلا شادی کے کسی شریف کے گھر رخصت کر دیتا ہے۔ کہیں بھی ایسا ہوا ہے۔ پھر ستم یہ ہے کہ ایک گمنام لونڈی کے ساتھ نکاح کو تسلیم کر کے عدالت نے لونڈی بچوں کو جائیداد پر قبضہ دلا دیا۔ یہ سب کچھ وکیلوں کی حماقت یا بے ایمانی سے ہوا تھا۔ اور ایسے وکیلوں کا انتخاب مصاحبوں نے اپنی غرض سے کیا تھا۔ یہ سب کے سب دوسرے فریق سے مل گئے تھے۔ نواب صاحب کو اپنی باتوں پر پکا یقین تھا لیکن ان کے پاس روپیہ نہ تھا کہ وہ پریوی کونسل میں اپیل کر سکتے۔ جو کچھ بچا کھچا تھا وہ گھر کی ملازمہ لے کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ تن کے کپڑے، تانبے اور چینی کے برتن دو سال تک دلالوں کی معرفت اونے پونے بک کر ختم ہو گیا تھا۔ پرانی نوابی کی یادگار اب صرف دو انگرکھے تھے، جو جاڑہ، گرمی اور برسات پہنے جاتے تھے، اور جس میں اتنے چھید تھے کہ روشنی کے سامنے لاؤ تو چھلنی معلوم ہو۔

کپڑے نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے دوستوں اور عزیزوں کے یہاں آنا جانا ختم کر دیا تھا۔ صرف ایک دو جگہیں ایسی تھیں۔ جہاں اب بھی چلے جاتے تھے۔ ان میں سے ایک لالہ جی کا گھر تھا۔ واپسی کے وقت دماغ الگ کام کر رہا تھا، اور پاؤں الگ۔ پاؤں خاموشی سے اپنے پرانے راستے پر چل رہے تھے۔ نواب چونکے تو دیکھا دل ربا کی ڈیوڑھی سامنے ہے۔ یہ فوراً پچھلے پاؤں لوٹنے لگے تو دربان نے آواز دی۔

نواب صاحب کو تسلیمات عرض کرتا ہے خاکسار۔

حضور تشریف لائیں۔ بائی صاحبہ کمرہ خاص میں تشریف رکھتی ہیں۔ مدتوں سے آپ کے لئے چشم براہ ہیں۔

نواب سوچ میں پڑ گئے کہ اب کیا کریں۔ ان کی وضع داری کا تقاضا تو یہ تھا، کہ اس وقت آتے جب جیب میں دس پندرہ روپیہ ہوں۔ اور دستور یہ رہا تھا، کہ شام

آتے تھے اور رات دس بجے واپس جاتے تھے۔ لیکن آج جیب بھی خالی تھی اور رات کے دس بھی بج رہے تھے۔

دربان نے دوسری آواز نکالی محل دارنی، نواب رفیع الشان والا قدر عالی شان تشریف لا رہے ہیں۔

اس آواز کے بعد واپسی ناممکن تھی۔

دل ربا کا سن 45 سے اوپر کا تھا۔ بال تو خضاب کی وجہ سے کالے تھے۔ لیکن چہرے پر کچھ جھریاں پڑ گئی تھیں اور بدن بھی بھاری ہو گیا تھا۔ لیکن چہرے میں دل کشی، انداز میں سبک پن اور آواز میں لوچ اب بھی باقی تھا۔ اور خوش مذاقی میں آج بھی وہ یکتا مانی جاتی تھی۔

اس کے پرانے ملنے والے اب بھی دو، دو، تین، تین روزانہ آ جاتے تھے۔ اور چار، چار، چھ، چھ گھنٹے کی نشست ہو جاتی تھی۔ اب سے دس سال پہلے دل ربا کا شمار چوک کے آفتابوں میں کیا جاتا تھا۔

لیکن جس دن نواب رفیع الشان کا علاقہ نکلا، اور نواب صاحب نے دو انگوٹھیاں، ہزار، ہزار روپیہ کی، جو وہ کسی طرح ساتھ لے آئے تھے۔ رخصتانے کے طور پر بھیجیں۔ اسی دن اس نے چوک کا کمرہ چھوڑ کر گلی میں سکونت اختیار کر لی۔

علاقہ نکلنے کے بعد نواب صاحب سال بھر تک دل ربا کے گھر نہیں آئے۔ لیکن دل ربا ان کی خدمت میں ہر ہفتے خاصدان میں پان اور کبھی، کبھی حلوے یا مربے کی قاب بھیجتی، اور ساتھ، ساتھ یہ پیام بھی:

اللہ صورت تو کبھی، کبھی دکھلا جایئے۔ مو اعلاقہ گیا تو گیا۔ آپ تو مجھ سے کیوں روٹھ گئے؟

آخر ایک دن نواب کو تاب نہ رہی اور وہ آ ہی گئے۔ نظریں ملتے ہی دونوں رونے لگے۔ دل ربا نے آنسو پونچھ کر کہا:

نواب آپ نے مجھے بھی ویسی رنڈیوں میں گن لیا، جو صرف جواہرات کے لئے محبت کرتی ہیں۔

اتنا ہی سمجھے آپ مجھے؟

چلتے وقت نواب نے خاصدان میں دس روپے رکھ دیئے۔

دل ربا ان کو دیکھ کر آب دیدہ ہوگئی، مگر کچھ بولی نہیں۔شاید اس خیال سے کہ نواب کو دکھ نہ ہو۔اس کے بعد چھٹے، چھ ماہے نواب آنے لگے۔لیکن ابکی تو پورے ایک سال بعد قدم رنجہ فرمایا تھا۔ڈیوڑھی سے گزرے تو خود ان کو بھی گھر میں نیا پن محسوس ملا۔صحن میں اب گملے چنے ہوئے تھے۔جن کے درخت کافی بڑھ چکے تھے۔ دالان کے آگے ایک سائبان ڈال دیا گیا تھا۔جس کے نیچے صوفے رکھے تھے۔ لیکن دالان کے اندر بدستور دودھ کی ایسی چاندنی اور قالینوں کا فرش تھا۔اوراوپر رنگ برنگا جھاڑ۔

دل ربا نواب کو دیکھتے ہی کھڑی ہوگئی۔لب فرش استقبال کیا۔اورعزت اور محبت سے لاکر مسند پر بٹھا دیا۔پھر خود پہلو میں آ بیٹھی،خوشی سے دل ربا کی آنکھیں اور دانت چمک رہے تھے۔

ایسی حالت میں وہ بھوؤں اور ہونٹوں پر جھوٹ موٹ کی خفگی کے بل ڈال کر کہنے لگی۔

اللہ نواب۔۔آپ کے پہلو میں۔۔۔میں کہتی ہوں کہ دل نہیں ہے۔اگر میری صورت اب اس قابل نہیں رہی ہے، کہ آپ آئیں تو کیا میری محبت بھی ایسی گئی گزری ہے کہ آپ برسوں اپنی صورت نہ دکھلائیں۔

نواب ارے دل ربا۔دل کو نہ پوچھو۔۔وہ تو مثل ماہی بے آب تڑپتا رہتا ہے۔ مگر کیا کروں ضعیفی صد عیب۔"

دل ربا جانے دیجیئے۔تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں۔

یون کہیے اب نہ میری آواز میں لوچ ہے، اور نہ پاؤں میں یارا۔ نہ موسیقی نہ رقص۔ ایسے میں یار کیوں آئے۔

یہ کہہ کر دل ربا نے ادا سے گردن دوسری طرف موڑلی۔ جڑاؤ نیکلس جگمگانے لگا۔

یار کیوں کر یار کی گلی میں جانا چھوڑ دے

کس طرح بلبل چمن سے آشیانہ چھوڑ دے‘‘

دل ربا کمال ہے نواب۔ آپ تو دونوں طرف سے وکالت کر لیتے ہیں۔ میری طرف سے بھی اور اپنی طرف سے بھی۔ ارے شکایت ت وہی ہے کہ جس دن سے میں موئی اس گلی میں آئی، جو آتے تھے انہوں نے جھانکنا تک چھوردیا،،،،، ارے کم بختو، حقہ تو لاؤ۔ ہے وہ تمبا کو نواب صاحب والا؟

ہاں ہو گا کیوں نہیں۔ ابھی پہلی ہی کو تو اس امید پر منگوایا تھا، کہ شاید یہی فال نیک ثابت ہو۔

ملازمہ فوراً حقہ لے آئی، اور سونے کی منہنال ادب سے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

دل ربا’’ ارے لیجیے آ گیا حقہ۔ شاباش۔ معلوم ہوتا ہے، نواب صاحب کا جلوہ دیکھتے ہی چلم بھرنا شروع کر دی تھی۔

دل ربا کیوں نواب صاحب۔ چلتی ہے چسکی اب بھی۔ منگواؤں؟

’’کہاں دل ربا حکیم ابن صاحب کی سخت ممانعت ہے۔

اچھا تو پھر خاصہ منگواؤں؟

’’خاصا! کیوں؟ کیا تم نے ابھی تک نوش نہیں کیا۔ میں تو بھئی کھا بھی چکا۔‘‘

دل ربا بات یہ ہے کہ آج جی ذرا ویسا ہو رہا تھا۔ اس لیے سوچی کہ اس وقت ناغہ رہے۔ لیکن اب شای دآپ کے ساتھ بیٹھوں، تو دو ایک لقمے کھالوں، آپ کو

میرے سر کی قسم۔صرف میرے خیال سے دستر خوان پر بیٹھ جایئے۔اتنا تو میرا دل رکھ لیجیئے۔

کیا اب مجھ میں اتنی کشش نہیں رہی۔

کیا کہتی ہو، دل ربا۔کوئی میری نظروں سے دیکھے۔تم تو آج بھی ویسی ہو۔ جیسی پہلے دن تھی۔مگر بھئی میں کھانا جو کھا چکا ہوں۔

''یہی سن کر تو قسمیں دے رہی ہوں، دیکھیے وہ پرانی وضع داری والی بات زبان پر نہ لایئے گا۔''

نواب۔تم تو زبان بندی کی سزا دے رہی ہو۔''

دل ربا۔''ایسا نہ کہیے۔آپ کی بندی ہوں۔

دل ربا نے دونوں کلائیاں اس طرح آگے بڑھائیں۔جیسے ان کو باندھنے جا رہا ہو، اس کی کلائیاں اب بھی بہت سڈول، ملائم اور چمکیلی تھیں۔

نواب۔ واللہ کیا گھیرا ہے۔اب نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن۔اگر تم کسی عدالت میں وکیل بن جاؤ، تو تم سے کوئی بھی پیشی نہ پا سکے۔

دل ربا۔''نواب جب پیشہ ہی چھوڑ دیا تو پیشی میں کیا جاؤں گی۔

نواب ہائے ظالم کیا بات کہہ دی۔

دل ربا میں کیا بات کہہ سکتی ہوں۔آپ کے پیش میری کیا چلے گی۔''

ہائے پھر وہی ضلع جگت۔پیش چلنا کیسا۔ان لفظوں کا مارا تو پانی تک نہیں پی سکتا۔

تب ہی آپ ہمارے گھر میں پانی تک پینے کے روادار نہیں۔''

''کیا بات میں بات پیدا کرتی ہو''

پانی کیا، زہر بھی پلاؤ تو پی لوں۔

''کون سا زہر میٹھا یا کڑوا؟

''تم تو توبہ تڑانے پر آمادہ ہو۔''

''پھر منگواؤں؟''

''اگر میری صحت عزیز نہ ہو۔''

''مجھے عزیز نہ ہوگی تو کسے عزیز ہوگی۔لال پیارا۔لال کا خیال پیارا۔

واہ، واہ۔دل ربا۔اب کیا مجھے لال بناؤ گی؟

''آپ تو زبان پکڑتے ہیں۔

''ہائے یہ نعمت اب کہاں میسر۔''

''مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے''

خادمہ نے آ کر کہا، خاصہ تیار ہے۔

دل ربا نے نواب کا ہاتھ پکڑ کر ان کو اٹھا کر دستر خوان پر لا کر بٹھا دیا۔

دستر خوان پر جو نواب صاحب آ کر بیٹھے، تو معلوم ہو گیا کہ کھانا اپنے وقت پر ہو چکا تھا، اور ان کے لئے خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے۔نواب صاحب جانتے تھے کہ دل ربا نے جب سے کمرہ چھوڑا ہے۔اس نے اپنے رات کے کھانے کا وقتا یک بجے رات کی بجائے (جیسا کہ رنڈیوں کا دستور ہوتا ہے۔) آٹھ بجے کر لیا ہے۔ دستر خوان پر بانو کے یہاں کی بالائی، نصیر کے یہاں کی شیر مالیں۔مہنگو کے یہاں کے تیخ کباب، ملا کے یہاں کے گولے اور ٹکیا کے کباب اور رامو کے یہاں کی برفیاں تھیں۔ان کے علاوہ ماش کی دھلی ہوئی دال تھی، قورمہ اور زردہ بھی تھوڑا۔تھوڑا سا تھا۔یہ دونوں چیزیں غالباً خاصے کی بچی ہوئی تھیں۔پراٹھے تازہ تازہ ڈالے جا رہے تھے۔چینی کی پلیٹیں اور ڈونگے جن میں کھانا نکالا گیا تھا۔بہت نایاب قسم کے تھے۔جن میں سینریاں اور رومانی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔یہ سب نواب کے اہتمام میں نکالے گئے تھے۔

دل ربا اپنی پلیٹ میں کھانا نکالنے کا سوانگ رچاتی رہی۔اور کہتی رہی، جانے

آج بھوک کہاں اڑ گئی ہے۔ آپ کی وجہ سے دو ایک نوالے چل بھی رہے ہیں (آپ دسترخوان پر نہ ہوتے تو ایک نوالہ بھی حلق سے نہ اترتا۔)

نواب صاحب کا اس احساس سے گلا بھر آیا، کہ دل ربا نے کسی نہ کسی طرح میرے چہرے یا باتوں سے ضرور اندازہ لگالیا۔ کہ میں بھوکا ہوں۔ اللہ، اللہ اب وہ وقت آ گیا ہے، کہ جن لوگوں کا پیٹ میں بھرتا تھا، وہ اب میرا پیٹ بھریں۔ کاش میرا علاقہ واپس مل جاتا۔

دل ربا۔ نواب صاحب، اب تو وہ زمانہ آ گیا ہے کہ اپنے آپ کو ارباب نشاط میں گنتے ہوئے شرم آنے لگی ہے۔ کچھ خبر ہے آپ کو؟ چوک میں کسی طرف ایسے کمرے بھی کھل گئے ہیں۔ جہاں تماش بین پندرہ پندرہ منٹ کے حساب سے جاتے ہیں۔ موئی رنڈیاں نہ ہوئیں، دکان کی پوریاں ہوگیں۔ کل بے چاری مرادی آئی تھی۔ وہ بہت چھینک رہی تھی۔ اور کہہ رہی تھی اب تو چوک کے کمرے پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی ہے۔

نواب سچ کہتی ہو۔ یہ جو رنڈیاں آئی ہیں۔ یہ تو ہمارے گھر کی لونڈیوں سے بھی بدتر ہیں۔ نہ سلام کرنا آئے، نہ مزاج پوچھنا آئے، خوش مذاقی کون کہے۔ چڑ چڑیاں چبارہی ہیں اور اٹھلارہی ہیں۔ آنے جانے والوں سے چونی، اٹھنی مانگ رہی ہیں۔

دل ربا۔ ” (طنزیہ مسکراہٹ سے) اچھا نواب صاحب، اب۔ سمجھی۔ یہ کہیئے۔ آج کل معلوم ہوتا ہے، ادھر کے پھیرے ہو رہے ہیں۔ پھر میرا کیال کیوں آنے لگا۔“

نواب۔ استغفر اللہ۔ کیابات کہتی ہو۔ اب مین ایسا گیا گزرا نہیں ہوں۔

دل ربا۔ ”اچھا چلیے مان گئی“

نہ ہم سمجھے نہ آپ آئے کہیں سے

پسینہ پونچھیے اپنی جبیں سے“

نواب ہائے کیا بات یاد دلا دی، یاد ہے یہ شعر کبھی میں نے پڑھا تھا۔"

دل ربا۔"(شرما کر) ہاں یاد آ گیا۔بس اسی شعر نے تو مجھے جیت لیا تھا۔ایک مرتبہ اور بھی آپ نے ایسی ہی چوٹ کی تھی ۔یاد ہے؟۔

"کچھا تا پتا بتلاؤ۔

دل ربا نے رومال سے ہونٹوں کو اس ادا سے پونچھا، جیسے کوئی شرما کر سر پر آنچل ڈالے ۔جوانی کے قصوں اور اس ادا نے نواب کے چہرے پر جوانی کی جھلک پیدا کر دی۔

دل ربا، وہ جب تک آپ شاہ مینا سے فٹن پر آ رہے تھے، اور راستے میں بھیڑ کی وجہ سے میرا چو بہلا آپ کی فٹن کے پاس رک گیا تھا۔

نواب ہاں، ہاں یاد آ گیا، کیا شعر پڑھا تھا۔وہ دیکھو۔طاق مسجد کے بھرے مانگیں، مرادیں، منتیں

، جو نہ کرنا تھا کیا۔اور دل ربا تیرے لئے سچ کہتا ہوں دل ربا۔یہی حال تھا اس زمانے میں میرا۔"

دل ربا ٹھیک ہے یہی شعر تھا۔میں سن کر تڑپ گئی۔آپ نے مجھ نگوڑی پر نہ جانے کیا کر دیا۔وہ دن ہے اور آج کا دن۔۔۔۔

نواب مگر پھر بھی تم نے میرے خطوں کا جواب نہیں دیا۔

"وہ تو آپ جانتے ہی ہیں، اللہ بخشے میری خالہ جان کو۔ان کے آداب اور طریقے ت و بہت سخت تھے، اس زمانے میں میں نواب برجیس سلطان کی پابند تھی، خالہ جان کا حکم تھا پوری طرح وفادار رہو۔مجرے محفل کی بات دوسری ہے۔گھر آنے والوں سے ہنسی مذاق بھی کسی حد تک جائز ہے۔لیکن پابندی کی حالت میں خفیہ نامہ و پیام کو وہ ارباب نشاط کی شان کے کلاف سمجھتی تھیں،،،،،، ہائے کیا زمانے تھے۔۔۔۔نواب منیر کا واقعہ معلوم ہے آپ کو؟"

''ہوا یہ کہ جس دن نواب پر قرقی آئی ہے، اسی رات کو ستارہ ناز نخروں کا طوفان برپا کر کے جڑاؤ کنگن جو شاید اس خاندان کی آخری دولت تھی لے آئی تھی۔ قرقی والوں نے نواب صاحب کو معہ اپنے خاندان کے یعنی دو، چار، چار جوڑوں سمیت محل سے باہر نکال دیا۔ اس وقت نہ ان کے دوستوں کا پتہ تھا اور نہ مصاحبوں کا۔ بے چارے سرائے میں جا کر ٹکے، خالہ جان کو جو یہ خبریں ملیں، تو وہ آ کے ستارہ سے کہنے لگیں:

بیٹی نواب نے تجھے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ اور خدا کے فضل سے تیرا صندوقچہ پٹا پڑا ہے۔ یہ دولت تیری دو پشتوں کے کھانے کے لئے کافی ہے۔ اب تو ایسا کر کہ ان کنگنوں کو واپس کر دے۔ نواب کا چار، چھ مہینے کا خرچا نکل آئے گا اور ہم پر ان کی ہائے نہ پڑے گی۔

ستارہ کہنے لگی آپ نواب کو جانتی نہیں ہیں وہ دی ہوئی چیز کبھی واپس نہیں لیں گے، اور لے بھی لی تو بڑے مصاحب حرام خور جو گدھ کی طرح ٹوٹے پڑتے ہیں۔ سب کھا جائیں گے۔

خالہ جان نے کہا یہ دونوں باتیں میں دیکھ لوں گی۔ خالہ جان نے اسی وقت ستارہ سے یہ خط لکھوایا:

میرے اچھے نواب۔ یہ موئے کنگن بڑے منحوس معلوم ہوتے ہیں، دو راتوں سے میرے سرہانے رہتے ہیں تو برے، برے خواب نظر آتے ہیں۔ کل میرا پیارا مٹھو مر گیا۔ اور میری بلی نے سارا دن دودھ نہیں پیا۔ اس لئے یہ کنگن مجھے راس نہیں آئیں گے۔ خدا کے لئے واپس لے لو۔ بلکہ میری رائے تو یہ ہے، کہ تم خود بھی نہ رکھو۔ ان کو اسی وقت لالہ شیام ناتھ کے یہاں بھکوا دو۔ ایسی منحوس چیز وہی لیتے ہیں،

تمہاری کنیز ستارہ

اماں جان نے لالہ جی سے سن لیا تھا۔ وہی خط اور کنگن لے کر نواب صاحب کے پاس گئے، اور پھر انہوں نے ستائیس سو روپے میں اسی وقت خرید بھی لیے

نواب کیا دل پایا تھا خالہ جان نے واہ، واہ۔ مگر یہ بھی جانتی ہو کہ نواب منیر نے ان ستائیس سو کا کیا کیا؟''

''کیا کیا؟

یہ قصہ مجھ سے سنو۔ وہ ستائیس سو ستائیس دن بھی نہ چلے۔ انہوں نے سرائے میں وہ رنگ رلیاں منائیں، کہ آج تک لوگوں کو یاد ہیں۔

جو بھی ہوا ہو۔ ہم سے کیا۔ ہماری تو آن رہ گئی۔ کھانا کھا کر نواب ساحب مسند پر بیٹھے ہی تھے کہ محلدار نی خبر لائی کہ راجا صاحب پہاڑ پور تشریف لا رہے ہیں۔

نواب صاحب یہ خبر سن کر زرا تشویش میں پر گئے۔ کہ اب میں کیا کروں کیا مسند خالی کر دوں؟ اتنے میں راج اصاحب آ گئے۔ دل ربا نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا، اور دیکھتے ہی بولی:

آیئے، آیئے راجا صاحب۔ وہ آئیں گھر میں ہمارے۔۔۔۔ راجا، بات کاٹ کر،، دیکھو جی کانٹوں پر نہ گھسیٹو۔''

دل ربا، راج اصاحب آپ تو ان گنے چنے لوگوں میں سے ہیں جن سے لطف ومحبت ملتا ہے۔ آپ سے ملیے آپ ہیں نواب رفیع الشان۔۔ آپ بھی کبھی، کبھی قدم رنجہ فرماتے ہیں۔ ایسی صحبتیں کہاں ملتی ہیں۔

راجا،، ارے نواب صاحب آپ کے تذکرے تو بہت سنے ہیں۔

''آداب بجالاتا ہوں''

(نواب نیم قد اٹھ کر) آداب عرض ہے۔

راجا صاحب نواب صاحب آپ کی وضع داریاں تو بہت سنی ہیں۔ اور رکھ رکھاؤ کی ہر طرف باتیں ہوتی ہیں۔

نواب چھوڑیے ان باتوں کو۔''

وہ فراق وہ وصال کہاں''

راجا صاحب کو دل ربا نے نواب صاحب کے برابر بٹھا دیا۔ راج اصاحب چھوت چھات کو بہت مانتے تھے۔اس لئے ان کے لیئے دوسرا اپیچوان منگوایا گیا۔

راجا میں نے سنا ہے آپ جیسا مرغوں کا جوہر شناس آج پورے لکھنو میں نہیں۔''

نواب میں کیا اور میری پہچان کیا۔بعض استادوں کی مہربانی سے کچھ آ گیا۔

راجا صاحب ایک گزارش ہے،نواب صاحب۔لاٹ صاحب سے کل مرغوں کی نسلوں کے بارے میں باتیں ہو رہی تھیں،تو وہ کہنے لگے کہ کوئی بڑی شہرت کا مرغ اگر مل جائے،نوشیرواں ہو تو کیا کہنا،تو وہ اسے لے کر لندن میں کسی بہت بڑے لاٹ کو بھیجیں گے۔لیکن اس کے ساتھ اس کے کارناموں کی مصدقہ تاریخ بھی ہونی چاہیئے۔نواب صاحب ایسا مرغ اگر مل جائے تو میں اس کے مالک کی خدمت میں جو فرمایئے روزانہ بھی پیش کر سکتا ہوں۔

نواب مسکرا کر،ایسا مرغ کوئی علیحدہ کیوں کرنے لگا۔لوگ تو اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں اپنی رسموں کے لئے

دل ربا سچ فرمایا آپ نے مجھے یاد ہے کہ آغا بیگو نے اپنے مرغ کے لئے اپنے خاندان کو چھوڑ دیا تھا۔

راجا صاھب جو بھی ہو،لیکن نواب صاحب اگر آپ چاہیں تو کچھ نہ کچھ ضرور کر سکتے ہیں۔

دل ربا تم سفارش کر دو۔

دل ربا نواب صاحب آپ کو میرے سر کی قسم جو بھی کر سکتے ہوں کیجیئے۔

نواب دیکھیئے راجا صاھب کوئی نہ کوئی صورت نکال لوں گا۔لکھنو کا سب سے

مشہور مرغ بانکے بہادر میاں اغن کے پاس ہے۔ اگر کسی طرح وہ اس کی جدائی برداشت کرلیں تو کیا کہنا۔

راجا وہ مرغ۔ ارے اس کے تذکرے تو لاٹ صاحب کے یہاں بھی ہو رہے تھے۔ وہ مل جائے ت وبس پھر واہ، واہ، نواب صاحب پھر میں آپ کے احسان سے سر نہ اٹھا سکوں گا۔

نواب ایسی باتیں نہ کہیئے۔ میرے بس میں جو کچھ ہے ضرور کروں گا۔

راجا صاحب سیدھے سادے سپاہی تھے۔ بات چھپانا تو ان کو آتا ہی نہ تھا۔ پیچوان کا ایک ک شلیے کر کہنے لگے:

اگر وہ مرغ مل گیا تو لاٹ صاحب بہت خوش ہوں گے، اور ہو سکتا ہے۔ آپ کو رائے بہادر کا خطاب مل جائے

نواب ایسی بات ہے؟ واللہ!! تب تو میں جان لڑا دوں گا۔ اغن کو جیسے بنے راضی کر کے رہوں گا۔ آپ رائے بہادر ہو جائیں اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟

دل ربا۔ ''آپ کی بات تو اغن کے لئے حکم ہو گی۔

نواب ہے تو وہ بھی میرا شاگرد''

راجا بڑی شبھ گھڑی میں یہاں آیا۔ اچھا دل ربا رانی ہو جائے اسی بات پر ایک ٹھمری۔''

دل ربا، راجا صاحب آواز اب کہاں چلتی ہے، جو آپ کو سناؤں۔ یہ تو سب جوانی کی باتیں ہیں۔ جوانی گئی آواز گئی۔

اک دھوپ تھی، کہ ساتھ گئی آفتاب کے''

راجا یہ تو مجھ سے پوچھو، کہ تم میں کیا کیا ہے؟ مجھے تو تمہاری سرگوشیوں ہی میں لطف آتا ہے۔

دل ربا نے سازندوں کو بلوایا، طبلچی اور سارنگیے بہت دھیمے سروں میں بجانے لگے، اور دل ربا نے گاؤ تکیے سے لگے، لگے بہت دھیمی آواز میں ٹھمری گائی، دل ربا کا ریاض تو چھ سات سال سے چھوٹا ہوا تھا، لیکن گلا ابھی تک پکا تھا۔ اور فن کی تو خیر وہ ماہر ہی تھی، گنگنانے کی سطح پر جب وہ گاتی تھی، تو آواز میں پہلے کیا ایسے سوز وگداز آجاتے تھے۔

آدھ گھنٹے یہ محفل رہی۔ پھر دل ربا نے یہ عذر پیش کیا، کہ اب دم نہیں۔ گانے بجانے کی محفل ختم ہو جانے پر دل ربا نے پوچھا۔

کہیے راجا صاحب موہنی سے میل ہوا۔

ارے کہاں اس کی ہٹ کے سامنے تو سب ہار گئے۔ بس مجروں میں صاحب سلامت ہو جاتی ہے۔ آٹھ روز کی بات ہے کہ ڈپٹی دلارے رام کے ہاں مجرا تھا۔ ظالم نے مجھ سے آنکھ ملا کر یہ غزل چھیڑی:۔

کبھی ہم میں تم میں قرار تھا

تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

دل ربا تو یہ وہی مثل، کہ چھاتی پر مونگ دلو، نواب صاحب آپ کو معلوم ہے یہ واقعہ۔

نہیں میں نے نہیں سنا۔

دل ربا بتلا دوں راجا صاحب

راجا صاحب ارے اس میں چھپانا کیا۔"

مثل مجنوں ہوا ہوں سودائی

دور پہنچی ہے میری رسوائی

ہوا یہ کہ نواب صاحب کہ میں تو محبت کا بھوکا ہوں۔ یار دوست جو لطیفہ کے ہاں اکٹھا ہونے لگے

تو میں بھی وہیں جانے لگا۔موہنی کے یہاں غیر حاضری ہونے لگی تو وہ کھٹک گئی، کئی مرتبہ پوچھا کہ راجا صاحب کیا کہیں اور آنکھ لڑ گئی ہے۔ میں نے ہر مرتبہ بات ہنسی میں اڑا دی، دراندازوں نے شاید ان کو حال بتادیا یا انہوں نے مخبروں سے پتا لگالیا۔ایک دن جب میری فتن لطیفہ کے کمرے میں کھڑی تھی، وہ آئیں اور کسی طرح میری نشست پر انہوں نے ایک پڑیا ڈال دی۔

واپسی پر میں نے جو سلیقے سے بنی ہوئی ایک پڑیا دیکھی تو حیران رہ گیا، سائیس نے کہا، کہ میں نے نہیں دیکھا، کہ کس نے یہاں پڑیا ڈالی ہے۔پھر وہ کہنے لگا، کہ آپ ہاتھ نہ لگایئے، کہ کہیں کوئی ٹوٹکا نہ ہو۔لیکن میں نے ہمت کر کے پڑیا کھول ہی ڈالی۔دیکھا تو اس میں دو گلوریاں ہیں۔ان کی بناوٹ صاف بتلا رہی تھی کہ موہنی کا ہاتھ ہے، میں نے سونگھا تو وہی ظالم خوشبو، ج بمنہ میں ان کو رکھا تو شک ہی نہ رہا۔ میں نے کہا ظالم تو تو پکی جاسوس نکلی، آئی اور آ کر کہہ گئی کہ پکڑ لیا، پھر میری جانے کی ہمت نہ پڑی۔منتظر رہا، کہ ادھر سے کوئی خیریت پوچھنے آئے۔جب چار، چھ روز گزر گئے، اور کوئی نہ آیا تو میں نے بڑے آغا کو بھیجا۔لیکن موہنی نے ان کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔اس واقع کو سال بھر ہو گیا ہے۔نامہ و پیام بند ہے۔

نواب۔افوہ ری، آن۔انہوں نے تو بیگمات کو بھی مات کر دیا۔

دلربا" بیگموں۔۔۔۔آپ لوگ تو ہماری عزت کبھی کر ہی نہیں سکتے۔جب دیکھو وہی بیگموں والی بات،،، گویا آن ہے تو ان ہی میں ہے۔

راجا کیا کہتی ہو تم کو تو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔

نواب اور دل میں بساتے ہیں۔

دل ربا، پگڑی کی طرح جب ہم لوگ پرائے ہو جاتے ہیں تو بدل ڈالتے ہیں۔

ایک گھنٹہ ٹھہر کر راجا صاحب خاصہ دان میں پچیس روپے ڈال کر چلے گئے۔

رات بہت آ گئی تھی۔اس لئے نواب صاحب نے بھی جانے کا ارادہ کیا۔لیکن

یہ شرم دامن گیر تھی کہ اپنے پاس دس روپے بھی نہیں کہ خاصدان میں رکھ دیں۔

دلربا اس طرح باتیں کر رہی تھی، جیسے ابھی سر شام ہے۔ اور نواب صاحب ابھی، ابھی آئے ہیں۔

باتوں کے دوران میں اس نے پوچھا:

نواب صاحب آپ نے چوہدری صاحب کی بات تو سنی ہو گی۔

کون چوہدری صاحب

وہی ڈھول پور والے۔ جب عدالت نے قرض خواہوں کو ڈگری دے کر ان کو نان شبینہ کا محتاج کر دیا، اور وہ سر جھکا کر عدالت سے نکلے، تو چھمن ان کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگی۔

چوہدری صاحب تالی تو دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

چوہدری صاحب نے اس بے موقع سوال پر حیران ہو کر کہا:

ہاں تو پھر۔''

''پھر یہ کہ آج تک میں نے آپ کی محبت کا امتحان لیا ہے۔ اب آپ کو میری محبت کا امتحان لینا ہو گا

کیا مطلب؟

جو کچھ آپ نے دیا ہے وہ حاضر ہے اور میں آپ کی لونڈی ہوں۔

چوہدری صاحب ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے۔،

چھمن مچل گئی، رونے لگی، اور قسم کھائی کہ اگر آپ مالک بن کر میرے ساتھ نہ چلیں گے، تو ابھی انگوٹھی کا نگینہ چبا لوں گی۔ آخر چوہدری صاحب خاموش ہو گئے اور چھمن ان کو اپنی بگھی پر لے گئی۔ تب سے چوہدری صاحب اس کی جائیداد اور دولت کے مالک ہیں۔ اور وہ ان کی خادمہ۔

نواب، ہاں اور ایسی بھی مثالیں موجود ہیں۔ لیکن سعود آباد، نور آبا، خلیل پور،

مانک نگر، جھونڈی، بیوار، نورنگ یہ سب ریاستیں کن لوگوں نے کورٹ کرائیں۔ وہ بھی تو چھمن ہی کی بہنیں تھیں۔ کورٹ کرا کے وہ دوسری ریاستوں میں مزے کرنے لگیں۔ ارے یہ تماش بینی کی دنیا ہی ایسی ہے۔''

دل ربا، ایمان سے کہیئے گا۔ آپ مجھے کس طائفہ میں گنتے ہیں؟ چھمن والے طائفہ میں یا ان موئی ٹیریوں کے طائفہ میں؟

نواب (ٹھنڈی سانس بھر کر) تمہاری شرافت تو اسی دن کھل گئی تھی۔ جب تم نے پنچ لڑاہار یہ کہہ کر لوٹا دیا تھا، کہ میں آپ کی بیوی کے گلے سے اتروا کر کوئی چیز قبول نہیں کر سکتی۔ کہیں رنڈیاں ایسا کرتی ہیں۔

دل ربا۔ اچھا اگر یہ بات ہے، نواب صاحب تو میں بھی چھمن کی طرح آپ سے پوچھتی ہوں، کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

نواب صاحب آبدیدہ ہو گئے۔ آنسو ضبط کر کے انہوں نے اٹک، اٹک کر کہا۔

چوہدری صاحب کی بات اور ہے۔''

دل ربا کچھ تو کہیئے میرا دل رکھنے کو۔

بس کرو، جانے دو۔

نواب صاحب تیزی سے نکلے اور باہر چلے آئے۔ ان کے آنسو تھے کہ کسی طرح قابو میں آتے ہی نہیں تھے۔ وہ چوک سے بچ کر گلیوں، گلیوں ہوتے ہوئے گھر آئے۔ یہاں دیکھتے کیا ہیں، کہ ایک پلنگ پر بہت بڑا خوان پڑا ہے۔ اور دوسرے پر بڑی سی گٹھڑی، شوکت بیٹھا ہوا ان کو دیکھ رہا تھا۔

نواب نے پوچھا یہ کیا ہے؟ شوکت نے کہا معلوم نہیں۔ جو شخص لایا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں بتلایا کہ کہاں سے لایا ہے، کہا کہ نواب صاحب کو سب کچھ معلوم ہے۔

نواب نے پوچھا، ان میں کیا ہے؟ شوکت نے کہا، ابھی میں نے ان کو ہاتھ

نہیں لگایا۔ نواب صاحب نے حیرت اور تجسس بھرے ہاتھوں سے دونوں چیزیں کھول کر دیکھیں۔

خوان میں حلوے مٹھائیاں، شیر مالیں وغیرہ تھیں، اور گٹھڑی میں دو، دو شالے، دو انگرکھے اور سب سے اوپر وہ دونوں انگوٹھیاں تھیں، جو نواب نے دل ربا کو دس سال پہلے رخصتانہ کے طور پر بھیجی تھیں۔ ان کی واپسی اس بات کا اظہار کر رہی تھی کہ جدائی منظور نہیں۔

شوکت دو شالوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ لیکن نواب کی آنکھوں میں جو آنسو اب تک رکے ہوئے تھے، بے اختیار بہنے لگے۔

شوکت نے گھبرا کر باپ کی طرف دیکھا، ان کے منہ سے صرف اتنا نکلا:

علاقہ واپس مل جائے تو۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ بڈھا

افسانہ نگار : راجندر سنگھ بیدی

میں نہیں جانتی۔ میں تو مزے میں چلی جا رہی تھی۔ میرے ہاتھ میں کالے رنگ کا ایک پرس تھا۔ جس میں چاندی کے تار سے کچھ کڑھا ہوا تھا، اور میں ہاتھ میں اسے گھما رہی تھی۔ کچھ دیر میں میں اچک کر فٹ پاتھ پر ہو گئی، کیوں کہ مین روڈ پر ادھر کو آنے والی بسیں اڈے پر پہنچنے، اور ٹائم کیپر کو ٹائم دینے کے لیے یہاں آ کر ایک دم راستہ کاٹتی تھیں۔ اسی لئے اس موڑ پر آئے دن حادثے ہوتے رہتے تھے۔

بس تو خیر نہیں آئی۔ لیکن اس پر بھی ایکسیڈنٹ ہو گیا، میرے دائیں طرف سامنے کے فٹ پاتھ پر مکان تھا، اور میرے الٹے ہاتھ سیمنٹ سے بنی ہوئی دیوار، جس کے اس پار فادر لوگ ایسٹر کے سلسلے میں کچھ سجا بنا رہے تھے۔ میں اپنے آپ سے بے خبر تھی، لیکن یکا یک نہ جانے مجھے کیوں ایسا محسوس ہونے لگا، کہ میں ایک لڑکی ہوں۔ جوان لڑکی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ میں نہیں جانتی، مگر ایک بات کا مجھے پتہ ہے کہ ہم لڑکیاں صرف آنکھوں سے نہیں دیکھتیں۔ جانے پرماتما نے ہمارا بدن کیسے بنایا ہے، کہ اس کا ہر پور دیکھتا، محسوس کرتا، پھیلتا اور سمٹتا ہے۔ گدگدی کرنے والا ہاتھ لگتا بھی نہیں، کہ پورا شریر ہنسنے، مچلنے لگتا ہے۔ کوئی چوری چھپے دیکھے بھی تو یوں لگتا ہے۔ جیسے ہزاروں سوئیاں ایک ساتھ چبھنے لگیں، جن سے تکلیف ہوتی ہے اور مزہ بھی آتا ہے۔ البتہ کوئی سامنے بے شرمی سے دیکھے تو دوسری بات ہے۔

اس دن کوئی میرے پیچھے آ رہا تھا، اسے میں نے دیکھا تو نہیں۔ لیکن ایک سنسناہٹ سی میرے جسم میں دوڑ گئی۔ جہاں میں چل رہی تھی وہاں برابر میں ایک پرانی شیورلے گاڑی آ کر رکی، جس میں ادھیڑ عمر کا بلکہ بوڑھا آدمی بیٹھا تھا، وہ بہت معتبر صورت اور رعب داب والا آدمی تھا۔ جس کے چہرے پر عمر نے خوب لوڈو کھیلی

تھی۔اور اس کی آنکھ تھوڑی دبی ہوئی تھی۔جیسے اسے کبھی لقوہ ہوا ہو، اور وٹامن بی اور سی کے ٹیکے وغیرہ لگوانے، شیر کی چربی سے مالش کرنے یا کبوتر کا خون ملنے سے ٹھیک تو ہو گیا ہو۔لیکن پورا نہیں۔ایسے لوگوں پر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔کیونکہ وہ آنکھ نہیں مارتے پھر بھی پکڑے جاتے ہیں۔جب اس نے میری طرف دیکھا تو پہلے میں بھی اسے غلط سمجھ گئی۔لیکن چونکہ میرے اپنے گھر میں چچا گوند اسی بیماری کے مریض ہیں، اس لئے میں اصل وجہ جان گئی، دیر تک میں اپنے آپ کو شرمندہ محسوس کرتی رہی۔اس بڈھے کی داڑھی تھی، جس میں روپے کے برابر ایک صاف سپاٹ سی جگہ تھی۔ضرور کسی زمانے میں وہاں اس کے کوئی بڑا سا پھوڑا نکلا ہو گا۔جو ٹھیک تو ہو گیا، لیکن بالوں کو جڑ سے غائب کر گیا۔اس کی داڑھی سر کے بالوں سے زیادہ سفید تھی سر کے بال کھچڑی تھے۔سفید زیادہ اور کالے کم۔جیسے کسی نے ماش کی دال تھوڑی اور چاول زیادہ ڈالے ہوں۔اس کا بدن بھاری تھا، جیسا کہ اس عمر میں سب کا ہو جاتا ہے۔میرا بھی ہو جائے گا۔۔۔کیا میٹرن لگوں گی؟ لوگ کہتے ہیں، تمہاری ماں موٹی ہے۔عجیب بات ہے نا، کہ کوئی عمر کے ساتھ آپ ہی اپنی ماں ہو جائے۔۔۔یا باپ۔۔بڈھے کے قد کا البتہ پتا نہ چلا۔کیونکہ وہ موٹر میں ڈھیر تھا۔کار رکتے ہی اس نے کہا سنو،

میں رک گئی، اس کی بات سننے کے لئے تھورا جھک بھی گئی۔

میں نے تمہیں دور سے دیکھا، وہ بولا۔

میں نے جواب دیا جی‘‘

میں جو تم سے کہہ رہا ہوں خفا نہ ہونا‘‘

کہیے، میں نے سیدھی کھڑی ہو کر کہا۔

اس بڈھے نے پھر مجھے ایک نظر دیکھا، لیکن میرے جسم میں سنسناہٹ نہ دوڑی کیونکہ وہ بڈھا تھا۔پھر اس کے چہرے سے بھی کوئی ایسی ویسی بات معلوم نہیں ہوتی

تھی، ورنہ لوگ تو کہتے ہیں بڈھے بڑے ٹھرکی ہوتے ہیں۔

تم جا رہی تھیں۔ اس نے پھر بات شروع کی، اور تمہاری یہ ناگن، دایاں پاؤں اٹھنے پر بائیں طرف اور بایاں پاؤں اٹھنے پر دائیں طرف جھوم رہی تھی۔۔۔۔

میں ایک دم کانشس ہو گئی۔ میں نے اپنی چوٹی کی طرف دیکھا، جو اس وقت نہ جانے کیسے سامنے چلی آئی تھی۔ میں نے بغیر کسی ارادے کے سر کو جھٹکا دیا، اور ناگن جیسے پھنکارتی ہوئی پھر پیچھے چلی گئی۔ بڈھا کہے جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی آہستہ کر لی اور پیچھے سے تمہیں دیکھتا رہا۔ اور آخر وہ بڈھا ایک دم بولا "تم بہت خوبصورت لڑکی ہو۔"

میرے بدن میں جیسے کوئی تکلف پیدا ہو گیا، اور میں کروٹ، کروٹ بدن چرانے لگی۔ بڈھا منتر مگدھ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نہیں جانتی تھی کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں۔ میں نے سنا ہے باہر کے دیسوں میں کسی لڑکی کو کوئی ایسی بات کہہ دے تو وہ بہت خوش ہوتی ہے۔ شکریہ ادا کرتی ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کوئی رواج نہیں الٹا ہمیں آگ لگ جاتی ہے۔ ہم کیسی بھی ہیں کسی کو کیا حق پہنچتا ہے۔ کہ ہمیں ایسی نظروں سے دیکھے اور وہ بھی یوں۔۔۔ سڑک کے کنارے،،، گاڑی روک کر،،، اور شروع ہو جائے،،، بدیس کی لڑکیوں کا کیا ہے۔ وہ تو بڈھوں کو پسند کرتی ہیں۔ آٹھارہ بیس کی لڑکی ساٹھ، ستر سال کے بوڑھے سے شادی کر لیتی ہے۔

میں نے سوچا یہ بڈھا آخر چاہتا کیا ہے؟

میں اس خوبصورتی کی بات نہیں کرتا۔ وہ بولا "جسے عام آدمی خوبصورتی کہتے ہیں۔ مثلاً وہ گورے رنگ کو اچھا سمجھتے ہیں۔

مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میرا رنگ کوئی اتنا گورا بھی نہیں، سانولا بھی نہیں، بس،،،، سچ کا ہے، میں نے۔۔۔ میں تو شرما گئی۔

آپ؟ میں نے کہا اور پھر آگے پیچھے دیکھنے لگی کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔؟

بس دندناتی ہوئی آئی اور یوں پاس سے گزر گئی، کہ اس کے اور کار کے درمیان بس انچ بھر کا فاصلہ رہ گیا۔ لیکن وہ بڈھا دنیا کی ہر چیز سے بے خبر تھا۔ مرنا تو آخر ہر ایک کو ہے۔ لیکن وہ اس وقت کی بے کار اور فضول موت سے بھی بے خبر تھا۔ جانے کن دنیاؤں میں کھویا ہوا تھا وہ؟

دو تین گھاٹی، راما لوگ وہاں سے گزر رہے تھے۔ وہ کسی نوکری چاکر کے بارے میں جھگڑا کرتے جا رہے تھے۔ ان کا شور جو ایسٹر کی گھنٹیوں میں گم ہو گیا، دائیں طرف کے مکان کی بالکنی پر ایک دبلی سی عورت اپنے بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی آئی، اور ایک بڑا سا گچھا بالوں کا کنگھی میں سے نکال کر نیچے پھینکتی ہوئی واپس چلی گئی۔ کسی نے خیال بھی نہ کیا، کہ سڑک کے کنارے میرے اور اس بوڑھے کے درمیان کیا معاملہ چل رہا ہے۔ شاید اس لئے کہ لوگ اسے میرا کوئی بڑا سمجھتے تھے۔ بوڑھا کہتا رہا ''تمہارا یہ سنولایا ہوا کندنی رنگ، یہ گٹھا ہوا بدن ہمارے ملک میں ہر لڑکی کا ہونا چاہیئے۔ اور پھر یکا یک بولا ''تمہاری شادی تو نہیں ہوئی؟''

نہیں میں نے جواب دیا

کرنا بھی تو کسی گبرو جوان سے

''جی''

اب خون میرے چہرے تک ابل، ابل کر آنے لگا۔ آپ ہی سوچیئے آنا چاہیئے تھا یا نہیں؟

لیکن اس سے پہلے کہ میں اس بدھے کو کچھ کہتی۔ اس نے ایک نئی بات شروع کر دی۔

تم جانتی ہو آج کل یہاں چور آئے ہوئے ہیں؟

''چور میں نے کہا کیسے چور''

''جو بچوں کو چرا کر لے جاتے ہیں۔۔۔ انہیں بے ہوش کر کے ایک گٹھڑی میں

ڈال لیتے ہیں۔ایک ایک وقت مین چار، چار، پانچ، پانچ۔''

مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔میں نے کہا بھی تو صرف اتنا۔''تو'' میرا مطلب ہے،، مجھے''میرا اس بات سے کیا تعلق؟''

اس بڈھے نے کمر سے نیچے میری طرف دیکھا اور بولا،، دیکھنا کہیں پولیس تمہیں پکڑ نہ لے جائے۔

اوراس کے بعد اس بڈھے نے ہاتھ ہوا میں لہرایا، اور گاڑی سٹارٹ کر کے چلا گیا۔

میں بے حد حیران کھڑی تھی،،،، چور گھڑی، جس میں چار، چار، پانچ پانچ بچے۔۔۔۔

جب ہی میں نے خود بھی اپنے نیچے کی طرف دیکھا، اوراس کی بات سمجھ میں آ گئی۔میں ایک دم جل اٹھی،،،، پاجی کمینہ، شرم نہ آئی اسے؟ میں اسکی پوتی نہیں تو بیٹی کی عمر کی تو ہوں ہی۔اور یہ مجھ سے ایسی باتیں کر گیا، جو لوگ بدلیس میں بھی نہیں کرتے۔اسے حق کیا تھا کہ ایک لڑکی کو سڑک کے کنارے کھڑی کرلے، اور ایسی باتیں کرے۔ایک عزت والی لڑکی سے۔ایسی باتیں کرنے کی اسے ہمت کیسے ہوئی؟ آخر کیا تھا مجھ میں؟

یہ سب اس نے مجھ سے ہی کیوں کہا؟

بے عزتی کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو امڈ آئے،،،، میں کیا ایک اچھے گھر کی لڑکی دکھائی نہیں دیتی۔میں نے لباس بھی ایسا نہیں پہنا جو بازاری قسم کا ہو۔قمیص البتہ فٹ تھی، جیسے عام لڑکیوں کی ہوتی ہے۔اور نیچے شلوار، کیوں یہ ایسا کیوں ہوا۔؟ ایسے کی وت و پکڑ کر مارنا اور رمار، مار کر سور بنا دینا چاہیئے۔پولیس میں اسکی رپٹ کرنی چاہیئے۔آخر کوئی تک ہے؟ اس کی گاڑی کا نمبر؟۔مگر جب تک گاڑی موڑ پر نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔میں بھی کتنی مورکھ ہوں، جو نمبر بھی نہیں

لیا۔ میرے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے، ہمیشہ ایسا ہوتا ہے، وقت پر دماغ کبھی کام نہیں کرتا، بعد میں یاد آتا ہے تو خود ہی سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ میں نے سائیکالوجی کی کتاب میں پڑھا ہے۔ ایسی حرکت وہی لوگ کرتے ہیں، جو دوسروں کی عزت بھی کرتے ہیں، اور اپنی بھی۔ اسی لئے مجھے وقت پر نمبر لینا یاد نہ آیا۔ میں روٹھی سی ہو گئی۔ سامنے سے بوائیز کالج کے کچھ لڑکے گاتے، سیٹیاں بجاتے ہوئے گزر گئے۔ انہوں نے تو ایک نظر بھی میری طرف نہ دیکھا۔۔۔ مگر یہ بڈھا؟

میں دراصل دا ور اون کے گولے خرید نے جا رہی تھی۔ میرا فرسٹ کزن نیکل سویڈن میں تھا۔ جہاں بہت سردی تھی۔ اور وہ چاہتا تھا کہ میں کوئی آٹھ پلائی کی اون کا سوئیٹر بن کر اسے بھیج دوں۔ کزن ہونے کے ناطے وہ میرا بھائی تھا لیکن تھا بد معاش۔ اس نے لکھا، تمہارے ہاتھ کا بنا ہوا سوئٹر بدن پر رہے گا۔ تو سردی نہیں لگے گی۔ مجھے گھر میں اور کوئی کام بھی تو نہ تھا۔ بی، اے پاس کر چکی تھی، اور پاپا کہتے تھے '' آگے پڑھائی سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہاں اگر کسی لڑکی کو پروفیشن میں جانا ہو تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر ہر ہندوستانی لڑکی کی طرح شادی ہی اس کا پروفیشن ہے تو پھر آگے پڑھنے سے کیا فائدہ؟۔ اس لئے میں گھر ہی رہتی اور آلتو فالتو کام کیا کرتی تھی، جیسے سوئٹر بنا۔ بھیا اور بھابھی بہت رومانٹک ہو جائیں، اور سینما کا پروگرام بنا لیں، تو پیچھے ان کی بچی بندو کو سنبھالنا، اس کے گیلے کپڑوں، پوتڑوں کو دھونا، سکھانا وغیرہ۔ لیکن بڈھے سے اس مڈبھیڑ کے بعد میں جیسے ہل ہی نہ سکی۔ میرے پاؤں میں جیسے کسی نے سیسہ بھر دیا۔ پتہ نہیں آگے چل کر کیا ہو؟ اور بس میں گھر لوٹ آئی۔

اتنی جلدی گھر لوٹتے دیکھ کر ماں حیران رہ گئی۔ اس نے سمجھا، کہ میں اون کے گولے خرید بھی لائی ہوں۔ لیکن میں نے قریب، قریب روتے ہوئے اسے ساری بات کہہ سنائی۔ اگر گول کر گئی تو وہ چار چار، پانچ، پانچ بچوں والی بات۔۔ کچھ ایسی

باتیں بھی ہوتی ہیں۔ جو بیٹی ماں سے بھی نہیں کہہ سکتی۔ ماں کو بڑا غصہ آیا، اور وہ ہوا میں گالیاں دینے لگی۔ عورتوں کی گالیاں جن سے مردوں کا کچھ نہیں بگڑتا، اور جو انہیں اور بھی مشتعل کرتی ہیں۔ آخر ماں نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا ''اب تجھے کیا بتاؤں بیٹا۔ یہ مرد سب ایسے ہوتے ہیں۔۔۔۔ کیا جوان کیا بڈھے۔۔۔۔'' لیکن ماں۔ میں نے کہا ''پاپا بھی تو ہیں۔''

ماں بولی اب میرا منہ نہ کھلواؤ''

''کیا مطلب''

دیکھا نہیں تھا، اس دن؟ کیسے رامالنگم کی بیٹی سے ہنس، ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔''

کچھ بھی ہو، ماں کے اس مردے کو گالیاں دینے سے ایک حد تک میرا دل ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ مگر بڈھے کی باتیں رہ، رہ کر میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ اور میں سوچ رہی تھی۔۔۔۔ کہیں مل جائے تو میں۔۔۔ اور اس کے بعد میں اپنی بے بسی پر ہنسنے لگی۔ ذرا دیر بعد میں اٹھ کر اندر گئی۔ سامنے قد آدم آئینہ تھا۔ میں رک گئی، اور اپنے سراپے کو دیکھنے لگی۔ کولھوں سے نیچے نظر گئی تو پھر مجھے اس کی چار، چار، پانچ، پانچ بچوں والی بات یاد آ گئی۔ اور میرے کانوں کی لویں تک گرم ہونے لگیں۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ پھر میں کس سے شرما رہی تھی۔ ہو سکتا ہے۔ بدن کا یہی حصہ جسے لڑکیاں پسند نہیں کرتیں۔ مردوں کو اچھا لگتا ہو۔ جیسے لڑکے سیدھے اور ستواں بدن کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور نہیں جانتے وہی ہم عورتوں کو اچھا لگتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد کو سوکھا سڑا ہونا چاہیئے۔ نہیں ان کا بدن ہو تو اوپر سے پھیلا ہوا۔ مطلب۔۔۔ چوڑے کندھے، چکلی چھاتی اور مضبوط بازو۔ البتہ نیچے سے سیدھا اور ستواں ہونا چاہیئے۔

اتنے میں پاپا بیچ والے کمرے میں چلے آئے، جہاں میں کھڑی تھی۔ میرے

خیالوں کا وہ تار ٹوٹ گیا۔ پاپا آج بڑے تھکے، تھکے سے نظر آرہے تھے۔کوٹ جو وہ پہن کر دفتر گئے تھے۔کاندھے پر پڑا ہوا تھا۔ٹوپی کچھ پیچھے سرک گئی تھی۔انہوں نے اندر آکر ایسے ہی کہا بیٹا'' اور پھر ٹوپی اٹھا کر اپنے گنجے سر کو کھجایا۔ٹوپی پھر سر پر رکھنے ک بعد وہ باتھ روم میں چلے گئے۔ جہاں انہوں نے قمیض اتاری۔ان کا بنیان پسینے سے تر تھا۔پہلے انہوں نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے، پھر طاق سے یودی کلون نکال کر بغلوں میں لگائی۔ایک نیپکین سے منہ پونچھتے ہوئے باہر نکل آئے۔ اور جیسے بے فکر ہو کر خود کو صوفے پر گرادیا۔ماں نے پوچھا سنکجبین لوگے۔؟۔جواب میں انہوں نے کہا''کیوں وہسکی ختم ہوگئی؟۔۔۔۔ابھی پرسوں ہی تو لایا ہوں میکن کی بوتل۔''

جب میں بوتل اور گلاس لائی تو ماں اور پاپا آپس میں کچھ بات کر رہے تھے۔ میرے آتے ہی وہ خاموش ہوگئے۔میں ڈر گئی۔مجھے یوں لگا، جیسے وہ اس بڈھے کی باتیں کر رہے ہوں۔آخری بات سے مجھے اندازہ ہوا کہ چچا اندر سے کچھ اور ہیں۔ اور باہر سے کچھ اور۔

پھر کھانا وانا ہوا۔۔۔۔جس میں رات ہوگئی۔بیچ میں بے موسم کی برسات کا کوئی چھینٹا پڑ گیا تھا۔اور گھر کے سامنے لگے ہوئے اشوک پیڑ کے پتے، خاکی، خاکی لمبوترے پتے، زیادہ ہرے اور چمکیلے ہوگئے تھے۔سڑک پر کمیٹی کی بتی سے نکلنے والی روشنی ان پر پڑتی، تو وہ چمک، چمک جاتے۔ہوا مسلسل نہیں چل رہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ وہ ایک جھونکا کر کے آرہی ہے، اور جب اشوک کے پتوں سے جھونکا آکر ٹکراتا، اور شاں، شاں کی آواز پیدا ہوتی تو یوں لگتا جیسے ستار کا جھالا ہے۔ ہمارے نانکو نے بستر لگا دیا تھا، میری عادت تھی ادھر بستر پر لیٹی، ادھر سوگئی، لیکن اس دن نیند تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی، شاید اس لئے کہ سڑک پر کی روشنیٹھیک میرے سر ہانے پر پڑتی تھی، اور جب میں دائیں کروٹ لیٹتی، تو وہ میری آنکھوں میں چبھنے لگتی،

میں نے آنکھیں موند کر دیکھا تو بجلی کا بلب ایک چھوٹا سا چاند بن گیا۔ جس میں ہالے سے باہر کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر بیڈ کو تھوڑا سا سرکا لیا۔ لیکن اسکے باوجود وہ کرنیں وہیں تھیں، فرق صرف اتنا تھا کہ اب وہ میرے اندر سے پھوٹ رہی تھیں۔ آپ تو جانتے ہیں۔ جیوتی شبد ہو جاتی ہے اور شبد جیوتی، وہ کرنیں بھی آواز میں بدل گیں۔۔۔۔ اسی بڈھے کی آواز میں!

''دھت میں نے کہا، اور اسی کروٹ لیٹے لیٹے من میں گاتری کا پاٹھ کرنے لگی۔ لیکن وہی کرنیں چھوٹے، چھوٹے گدرائے، گدرائے بچوں کی شکل میں بدلنے لگیں۔ ان کے پیچھے ایک گبرو جوان کا چہرہ نظر آ رہا تھا، لیکن دھندلا، دھندلا سا۔ وہ شاید ان بچوں کا باپ تھا۔ اس کی شکل اس بڈھے سے ملتی تھی۔۔۔۔ نہیں۔۔۔ نہیں تو۔

پھر اس نوجوان کی شکل صاف ہونے لگی۔ وہ ہنس رہا تھا۔ اس کی بتیسی کتنی سفید اور ریکی تھی۔ اس نے فوج کے لفٹینٹ کی وردی پہن رکھی تھی۔ نہیں۔۔۔۔ پولیس انسپکٹر کی نہیں۔۔۔ سوٹ ایوننگ سوٹ، جس میں وہ بے حد خوبصورت معلوم ہو رہا تھا۔ اپنی نیند واپس لانے کے لئے میں نے ٹیچر کا بتایا ہوا نسخہ استعمالکرنا شروع کیا۔ میں فرضی بھیڑیں گننے لگی، مگر بے کار تھا۔ سب کچھ بے کار تھا۔ پرماتما جانے اس بڈھے نے کیا جادو جگایا تھا، یا میری اپنی ہی قسمت پھوٹ گئی تھی۔ اچھی بھلی جا رہی تھی ہیگل کے لئے اون کے گولے خریدنے، ہیگل! دھت، وہ میرا بھائی تھا۔ پھر گولے کے اون کیموٹے، موٹے بنے ہوئے دھاگے پتلے ہوتے گئے، اور مکڑی کے جال کی طرح میرے دماغ میں الجھ گئے۔ پھر جیسے سب صاف ہو گیا۔ اب سامنے ایک چٹیل سا میدان تھا، جس میں کوئی ولی، اوتار بھیڑیں چرا رہا تھا۔ وہ بش شرٹ پہنے ہوئے تھے؟ تن درست، مضبوط اور خوبصورت لا ابالی پن میں اس نے شرٹ کے بٹن کھول رکھے تھے۔ اور چھاتی کے بال صاف اور سامنے نظر آ رہے تھے۔ جن میں سر رکھ کر اپنے دکھڑے رونے میں مزہ آتا ہے۔ وہ بھیڑیں کیوں چرا

رہا تھا؟ اب مجھے یاد ہے وہ بھیڑیں گنتی میں تہتر تھیں۔۔۔میں سوگئی۔۔۔

مجھے کچھ ہوگیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ میں بار، بار خود کو آئینے میں دیکھنے لگی، بلکہ ڈرنے بھی لگی۔ بچے بری طرح میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ اور میں پکڑے جانے کے خوف میں کانپ رہی تھی۔ گھر میں میرے رشتے کی باتیں چل رہی تھیں۔ روز کوئی نہ کوئی دیکھنے دکھانے کو چلا آتا تھا۔ لیکن مجھے ان میں سے کوئی بھی پسند نہ تھا۔ کوئی مرا، مرگھلا تھا، اور کوئی تندرست بھی تھا، تو اس نے کنویکس شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ اس نے صاحب کیمسٹری میں ڈاکٹریٹ کی ہے۔ کی ہوگی۔ نہیں چاہیئے کیمسٹری، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو میری نظر میں جچ سکے۔ وہ نظر جواب میری نہ تھی۔ بلکہ اس بڈھے کی نذر ہو چکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اب سینما، تماشہ کو بھی جانے کو میرا دل نہیں چاہتا تھا۔ حالاں کہ شہر میں کئی اچھی اور نئی پکچریں لگی تھیں۔ اور وہی ہیرو لوگ ان میں کام کرتے تھے، جو کل تک میرے چہیتے تھے، لیکن اب یکا یک وہ مجھے شی دکھائی دینے لگے۔ وہ ویسے ہی پیڑ کے پیچھے سے گھوم کر لڑکی کے پاس آتے، اور عجیب طرح کی زنانہ حرکتیں کرتے ہوئے اسے لبھانے کی کوشش کرتے۔ بھلا مرد ایسے کہاں ہوتے ہیں۔؟ عورت کے پیچھے بھاگتے ہوئے،

ان ہی دنوں میں نے اپنے آپ کو پر تج کے میدان میں پایا۔ جہاں ہند اور پاکستان کے بیچ میچ ہو رہا تھا۔ پاکستان کے گیارہ کھلاڑیوں میں سے کم از کم چار، پانچ ایسے تھے، جو نظروں کو لوٹ لیتے تھے۔ ادھر ہند کی ٹیم میں بھی اتنے ہی خوابون کے شہزادے موجود تھے۔ چار، پانچ، جن مین سے دو سکھ تھے، مجھے ہنسی آئی پاکستان کا سنٹر فارورڈ عبدالباقی۔۔۔کیا کھلاڑی تھا؟ اس کی ہاکی کیا تھی، چمبک پتھر تھی، جس کی ساتھ گیند چمٹی ہی رہتی تھی۔ ہندوستانی سائیڈ کے گول پر پہنچ کر ایسا زبردست نشانہ بٹھاتا، کہ گولی کی سب محنتیں بے کار اور گیند پوسٹ کے پار،،، تماشائی شور مچاتے، بمبئی کے مسلمان نعرے لگاتے، بغلیں بجاتے۔ یہی نہیں اتری بھارت کے

ہندوستانی بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے، ہندوستانی ٹیم کا شنگارا سنگھ تھا،،، کیا کار زلیتا تھا۔ جب اس نے گول کیا تو اس سے بھی زیادہ شور ہوا۔ اب دونوں طرف کے کھلاڑی فاؤل کھیلنے لگے۔ ایک دوسرے ک ٹخنے گھٹنے توڑنے لگے۔۔۔لیکن میچ چلتا رہا۔

پاکستانی ٹیم ہندوستانی ٹیم پر بھاری تھی، ان میں سے کسی کے ساتھ لو لگانا میرے لئے ٹھیک بھی نہیں تھا۔ لیکن ہ روہ چیز انسان کو بھڑکاتی ہے جس سے اسے منع کیا گیا ہو۔ ہندو لڑکی کسی مسلمان سے شادی کر لیتی ہے۔ یا مسلمان لڑکی سکھ کے ساتھ بھاگ جاتی ہے تو کیسا شور مچتا ہے، کوئی نہیں پوچھتا اس لڑکی سے کہ اسے کیا تکلیف تھی۔ چاہے وہ لرکی خود ہی بعد میں کہے۔ کیا ہندو، کیا مسلمان کیا سکھ، سب ایک ہی سے کمینے ہیں۔ ہندوستانی ٹیم مین ایک اسٹینڈ بائی تھا، جو سب سے زیادہ خوبصورت گبرو جوان تھا۔ اسے کھلا کیوں نہیں رہے تھے؟

کھیل کے بعد جب میں آٹو گراف لینے کے لئے کھلاڑیوں کے پاس گئی، تو اپنی کاپی اسی اسٹینڈ بائی کے سامنے بھی کر دی۔ وہ بہت حیران ہوا۔ وہ تو کھیلا ہی نہیں تھا۔ تم کھیلو گے۔ ایک دن کھیلو گے۔ سب کو مات دو گے، ٹیم کے کپتان بنو گے۔

اسٹینڈ بائی کا تو جیسے دل ہی پگھل کر باہر آ گیا۔ نم آنکھوں سے اس نے میری طرف دیکھا۔ جیسے مین جو کچھ کہہ رہی ہوں وہ الہام ہے۔ اور شاید وہ الہام تھا بھی کیونکہ وہ سب کچھ میں تھوڑا ہی کہہ رہی تھی۔ میرے اندر کی کوئی چیز مجھے ایسا کہنے پر مجبور کر رہی تھی۔ پھر میں نے اسے چائے کی دعوت دی، جو اس نے قبول کر لی اور میں اسے لے کر گے لارڈ پہنچ گئی۔ ایک سنسناہٹ تھی جو میرے پورے بدن میں دوڑ، دوڑ جاتی تھی۔ کیسے ڈر خوشی بن جاتا ہے اور خوشی ڈر۔ میں نے چندریری کی پتلی ساڑھی پہن رکھی تھی، مجھے شرم آ رہی تھی، اور شرم ہی شرم میں ایک مزہ بھی کبھی، کبھی آتا تھا۔ میرے خیال میں اس وقت دنیا مین کوئی نہیں تھا، سوائے میرے اور اس

اسٹینڈ بائی کے جس کا نام بے کشن تھا۔ لیکن اسے سب پرنٹو کے نام سے پکارتے تھے۔

ہم دونوں گے لارڈ پہنچ گئے، اور ایک سیٹ پر بیٹھ گئے۔ ایک دوسرے کی قربت سے ہم دونوں شرابی سے ہو گئے تھے۔ ہم ساتھ لگ کے بیٹھے تھے کہ الگ ہٹ گئے۔ بدنون سے کوئی ب ولیپ رہی تھی سوندھی، سوندھی سی، جو تنور میں پڑی روٹی سے اٹھتی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ ہم دونوں کے بیچ کچھ ہو جائے، پیار جیسے پیار کوئی وَلا کارت ڈش ہوتی ہے۔ چائے پیتے ہوئے وہ چور نظروں سے میرے بدن کے اس حصے کو جہاں بڈھے کی نظریں ٹکی تھیں۔ دیکھ رہا تھا۔

ہوسکتا تھا ہماری بات آگے بڑھ جاتی، لیکن پ رنٹو نے سارا قلعہ ڈھیر کر دیا، پہلے اس نے کیرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور دبایا۔ میں نے اسے پیار کی اٹھکیلی سمجھا، اس کے بعد وہ سب کی نظریں بچا کر اپنا ہاتھ میرے شریر کے اس حصے پر دوڑانے لگا، جہاں عورت مرد سے جدا ہونے لگتی ہے۔ میرا چہرہ لال ہونے لگا۔ میں باتیں بھولنے لگی، میں نے اس کا ہاتھ جھٹکا، تو اس نے مایوس ہو کر رات کو بیک بے میں چلنے کی دعوت دی۔ مین نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے غلط عورت سمجھا تھا۔ جو دھڑے پر تو آتی ہے۔ مگر سیدھے نہیں۔

گے لارڈ سے باہر نکلے تو میرے اور پرنٹو کے درمیان سوا تندرستی کے اور کوئی بات مشترک نہ تھی، میرے کھسیائے ہونے سے وہ بھی کچھ کھسیا چکا تھا۔ میں نے سڑک پر جاتے ہوئے ایک ٹیکسی کو روکا۔ پرنٹو نے بڑھ کر میرے لئے دروازہ کھولا، اور میں لپک کر اندر بیٹھ گئی۔

بیک بے، پرنٹو نے مجھے یاد دلایا۔ میں نے طوطے کی طرح رٹ دیا ''بیک بے۔۔۔ اور پھر ٹیکسی ڈرائیور کی طرف منہ موڑتے ہوئے بولی۔ ماہم۔

بیک بے نہیں۔ وہ بولا۔

نہیں میں نے کرخت سی آواز میں جواب دیا، ماہم۔

ٹیکسی چلی تو پرنٹو نے میری طرف ہاتھ پھیلایا، جو ماہم روڈ تک میرا پیچھا کرتا رہا۔

اندر یادو بھیا ایک جھٹکے کے ساتھ بھابھی کے پاس سے اٹھے،،،، میں سمجھ گئی، کیونکہ ماں کا کڑا حکم تھا، کہ میرے سامنے وہ اکٹھے نہ بیٹھا کریں۔گھر میں جوان لڑکی ہے۔ میں نے لپک کر بندو کو جھولے میں سے اٹھایا اور اس سے کھیلنے لگی۔ بندو بھی مجھے دیکھ کر مسکرائی۔جیسے اسے سب کچھ معلوم تھا۔

گھر میں گوند چچا بھی تھے جو پاپا کے ساتھ اسٹڈی روم میں بیٹھے تھے۔اور ہمیشہ کی طرح ماں کا ناک مین دم کیے ہوئے تھے، عجب تھا دیور بھابھی کا یہ آپس کا رشتہ، جب بھی ملتے ایک دوسرے کو آرے ہاتھوں لیتے۔لڑنے، جھگڑنے، گالی گلوچ کے سوا کوئی بات ہی نہ ہوتی، پھر بھی ماں زرا بھی بیمار ہوتی تو گوند ہی کو یاد کرتی۔اور بھی دیور تھے ماں کے، جن سے اس کا پائے لاگن، اور جیتے رہو کے سوا اور کوئی رشتہ نہ تھا۔وہ ماں کو تحفون کی رشوت بھی دیتے۔لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ہاں گوند چچا اکثر ماں کو ٹھگتا ہی رہتا تھا۔اور وہ لے کر الٹا ماں کی سو پشتوں پر احسان کرتے۔کئی بار ماں نے کہا گوند اسی لئے اچھا ہے کہ اس کے دل میں کچھ نہیں، اور پاپا نے جواب میں کہا، دماغ میں بھی کچھ نہیں، جس پر ماں مرنے مارنے کو تیار ہوگئی۔جب وہ گوند چچا سے اپنی دیورانی ک یبارے میں پوچھتی، کہ تم اجیتا کو کیوں نہیں لائے، ت وجواب یہی ملتا کیا کروں لا کر، تم سیاس کی چوٹی کھنچوانا ہے؟ جلی کٹی سنوانا ہے۔ماں جواب میں گالیاں دیتی، گالیاں کھاتی، اور چچا کے چلے جانے کے بعد دھاڑیں مار، مار کر روتی، اور پھر وہی۔کہاں ہے گوند اسے بلاؤ۔میرا تو اس گھر میں وہی ہے۔ اپنے پاپا کا کیا پوچھتی ہو؟

وہ تو ہیں ہی بھولے مہیش، گوبر گنیش، ان کے تو کوئی کپڑے بھی اتروا لے۔ہر

بیوی اپنے میاں کو بے وقوف سمجھتی ہے۔ اور وہ چپ رہتا ہے۔ شاید اسی میں اس کا فائدہ ہے۔

اس دن گوند چچا ڈائریکٹر جنرل شپنگ کے دفتر میں کام کرنے والے کسی مسٹر سولنکی کی بات کر رہے تھے، اور اصرار کر رہے تھے، میری بات آپ کو ماننا پڑے گی۔ تم بزنس میں ہونا۔ ماں کہہ رہی تھی، اس میں بھی کوئی سوارتھ ہوگا تمہارا۔

اس پر گوند چچا جل بھن گئے، انہوں نے چلاتے ہوئے کہا" تم کیا سمجھتی ہو؟ کامنی تمہاری ہی بیٹی ہے میری نہیں۔

اب مجھے پتا چلا کہ مسٹر سولنکی کے لڑکے ساتھ میری ہی بات چل رہی ہے اور اس کے بعد کسی کنڈم اسپنڈل کی طرح اور بھی دھاگے کھلنے لگے۔ جن کا مجھے آج تک پتا نہ تھا، گوند چچا کے منہ میں جھاگ تھی اور وہ بک رہے تھے۔ تو،، تو نے اجیتا کے ساتھ میری شادی کر دی۔ میں نے آج تک کبھی چوں چرا کی۔ کہتی تھی میرے میکے کی ہے، دور کے رشتے سے میرے ماما کی لڑکی ہے۔۔۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں؟ بولو کہاں رکھوں، زندگی کیا آنکھوں سے بتاتے ہیں۔ وہی آنکھیں اب وہ مجھے دکھاتی ہے اور تو۔ اور تجھے بھی دکھاتی ہے۔

پہلی بار میں نے گوند چچا کا بریک ڈاؤن دیکھا تھا۔ میں سمجھتی تھی وہ آورش آدمی ہیں، اور اجیتا چاچی سے پیار کرتے ہیں۔ آج یہ راز بھی کھلا کہ ان کے ہاں بچہ کیوں نہیں ہوتا۔ فیملی پلاننگ تو ایک نام ہے۔

ماں نے کہا، کامنی تمہاری بیٹی ہے۔ اس لئے تو نہیں چاہتی کہ اسے بھی کسی گڑھے میں پھینک دو۔

میرا خیال تھا، اس پر اورت و، تو میں، میں ہوگی اور چچا بائیں بازو کی پارٹی کی طرح واک آؤٹ کر جائیں گے۔ لیکن وہ الٹا قسمیں کھانے لگے۔ تمہاری سوگند بھابھی۔ اس سے اچھا لڑکا تمہیں نہیں ملے گا۔ وہ بڑودہ کی سنٹرل ریلوے ورکشاپ

میں فورمین ہے۔ بڑی اچھی تنخواہ پاتا ہے۔

میں سب کچھ سن رہی تھی، اور اندر جھلا رہی تھی،،،، ہونہ لڑکا اچھا ہے، تنخواہ اچھی ہے، لیکن شکل کیسی ہے عقل کیسی ہے؟ عمر کیا ہے؟ اس کے بارے مین کوئی کچھ کہتا ہی نہیں۔ فورمین بنتے، بنتے تو برسوں لگ جاتے ہیں۔ یہ ہمارا دیس ہے۔ پچاس سال کا مردھی بیاہنے آئے تو یہاں کی بولی میں اسے لڑکا ہی کہتے ہیں۔ اس کی صحت کیسی ہے؟۔ کہیں انکچول تو معلوم نہیں ہوتا۔ اسی دم مجھے پرنٹو کا خیال آیا۔ جو اس وقت بیک بے پر میرا انتظار کررہا ہوگا۔۔۔۔ اسٹینڈ بائی جو زندگی بھر اسٹینڈ بائی ہی رہے گا۔ کبھی نہ کھیلے گا۔ اسے کھیلنا آتا ہی نہیں۔ اس میں صبر ہی نہیں۔ پھر مجھے اس غریب پر ترس آنے لگا۔ جی چاہا بھاگ کر اس کے پاس چلی جاؤں۔ اسے تو میں نے دیکھا اور پسند بھی کیا تھا۔

لیکن اس فورمین کو جو بیک گراونڈ میں کہیں مسکرا رہا تھا۔۔۔

پھر جیسے من کے اندھیرے میں مچھر بھنبھناتے ہیں۔۔۔۔ مس گپتا سے مسز سولنکی کہلائی تو کیسی لگوں گی۔۔۔۔ بکواس!

گوند چچا کہہ رہے تھے، لڑکا تن کا اجلا ہے، من کا اجلا ہے۔ اس کی آتما کتنی اچھی ہے، اس کا اس بات سے پتا چلتا ہے، کہ وہ بچوں سے پیار کرتا ہے۔ بچے اس پر جان دیتے ہیں۔ اس کے اردگرد منڈلاتے ہیں۔ ہی، ہی ہوہو، ہا، ہا کرتے رہتے ہیں۔ اور وہ بھی ان کے ساتھ غی، غی، غوں غوں، غاں غاں۔۔۔۔

بس میں اندر کے کسی سفر سے اتنا تھک چکی تھی، کہ رات مجھے ایک سپاٹ، بے رنگ، بے خواب سی نیند آئی۔ ایسی نیند جو لمبے رت جگوں کے بعد آتی ہے۔

دو ہی دن میں وہ لڑکا ہمارے گھر پر موجود تھا۔ ارے! یہ سب اندازے کتنے غلط نکلے۔۔۔۔ وہ ہاکی ٹیم کے سب لڑکوں۔۔۔۔ کیا کھیلنے والے اور کیا اسٹینڈ بائی۔۔۔۔ سب سے زیادہ گبرو، سب سے زیادہ جوان تھا۔ اس نے صرف کسرت

ہی نہیں کی تھی۔ آرام بھی کیا تھا۔ اس کا چہرہ اندر کی گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ رنگ کندنی تھا۔۔۔۔میری طرح مضبوط دہانہ، دانتوں کی بار جیسے بے شمار گنے چوسے ہوں۔ گاجر مولیاں کھائی ہوں، شاید کچے شلغم بھی، وہ ایک طرف گھبرا رہا تھا۔ اور دوسری طرف وہ اپنی گھبراہٹ کو بہادری کی اوٹ میں چھپا رہا تھا۔ آتے ہی اس نے مجھے نمستے کی، میں نے بھی جواب میں نمستے کر ڈالی۔ پھر اس نے ماں کو پرنام کیا، جب وہ میری طرف نہ دیکھتا تھا تو میں اسے دیکھ لیتی تھی، یہ اچھا ہوا کہ کسی کو پتا نہ چلا کہ میری ٹانگیں کپکپانے لگی ہیں، اور دل دھڑام سے شریر کے اندر ہی کہیں نیچے گر گیا ہے۔ آج کل کی لڑکی ہونے کے ناطے مجھے ہسٹریا کا ثبوت نہ دینا تھا۔ اس لئے ڈٹی رہی۔ بیچ میں مجھے خیال آیا کہ بے کار کی بغاوت کی وجہ سے میں نے تو اپنے بال بھی نہیں بنائے تھے۔

اس کے ساتھ اس کی ماں بھی آئی تھی۔ وہ بچھی جا رہی تھی، جیسے بیٹوں کی شادی سے پہلے مائیں بچھتی ہیں۔ مجھے تو یوں لگا جیسے لڑکا نہیں، اس کی ماں مرمٹی ہے۔ اور جانے مجھ میں اپنے مستقبل کا کیا دیکھ رہی ہے۔ اس کی اپنی صحت خراب تھی، اور وہ اپنی کبھی کی خوبصورتی، اور تن درستی کی باتیں کر کے مجھے اپنے بیٹے کے لئے مانگ رہی ہے۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے اسے اپنی ماں پر بھروسہ نہیں۔ وہ بھکارن کہہ رہی تھی لڑکوں کی خوبصورتی کس نے دیکھی ہے۔؟ لڑکے سب خوب صورت ہوتے ہیں۔ بس اچھے گھر کے ہوں کماؤ ہوں۔ میری ماں کے کہنے پر وہ کچھ شرماتا ہوا میرے پاس آکر بیٹھ گیا، اور باتیں کرو کے حکم پر مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو مین چپ رہی، پھر جب بولی تو صرف یہ چاہت ہوا کہ میں گونگی نہیں ہوں۔ سفید قمیض، سفید پتلون اور سفید بوٹ پہنے ہوئے وہ کوئی کرکٹ کا کھلاڑی معلوم ہو رہا تھا۔ ماں کے اشارے پر میں نے اس سے پوچھا آپ چائے پئیں گے؟

جی اس نے چونک کر کہا، اور پھر جیسے میری بات دھرتی کے پورے کرے کا

چکر کاٹ کر اس کے دماغ میں لوٹ آئی، اور وہ بولا آپ پئیں گی۔

میں ہنس دی۔ میں نہ پیوں تو کیا آپ نہیں پئیں گے۔ آپ پئیں گی تو میں بھی پی لوں گا۔

چائے بنانے کے لئے اٹھی تو سامنے آئینے پر میری نظر گئی۔ وہ مجھے جاتے دیکھ رہا تھا۔ میں نے ساڑھی میں اپنا بدن چھپایا۔ بس کچھ ہی دن میں میں پکڑی گئی۔ میری شادی ہوگئی۔ میرے گھر کے لوگ یوں تو بڑے آزاد خیال ہیں۔ لیکن ویدی پر بٹھاتے ہوئے انہوں نے جیسے مجھے بوری میں ڈال رکھا تھا۔ تاکہ میرے ہاتھ پاؤں پر کسی کی بھی نظر نہ پڑے۔ میں پردہ پسند کرتی ہوں، لیکن صرف اتنا، جس میں دکھائی بھی دے اور شرم بھی رہے۔ زندگی میں ایک بار ہی تو ہوتا ہے، کہ وہ دبے پاؤں آتا ہے، اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے گھونگھٹ کو اٹھاتا ہے۔ جسے بیچ میں اٹھائے بنا پرماتما بھی نہیں ملتا۔

شادی کے ہنگامے میں میں نے تو کچھ دیکھا نہیں، کون آیا، کون گیا، بس چھوٹے سولنکی میرے من میں سمائے ہوئے تھے۔ میں نے جو بھی کپڑا، جو بھی زیور پہنا تھا، جو بھی افشاں چنی تھی، ان ہی کی نظروں سے دیکھ کر، جیسے میری اپنی نظریں ہی نہ رہی تھیں۔ میں سب سے بچنا، سب سے چھپنا چاہتی تھی، تاکہ صرف ایک کے سامنے کھل سکوں۔ ایک پر اپنا آپا وار سکوں۔ جب برات آئی تو میری سہیلیوں نے بہت کہا، بالکونی پر آجاؤ، برات دیکھ لو، لیکن میں نے ایک ہی نہ پکڑی، میں نے ایک روپ دیکھا تھا، جس کے بعد دوسرا روپ دیکھنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

آخر میں نے سسرال کی چوکھٹ پر قدم رکھا۔ سب میرے سواگت کے لئے کھڑے تھے، گھر کی سب عورتیں سب مرد،،،، بچوں کی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ اور وہ مجھے گھونگھٹ میں سے دھندلے، دھندلے دکھائی دے رہے تھے، سب رسمیں ادا ہوئیں، جیسی ہر شادی میں ہوتی ہیں۔ لیکن جانے کیوں مجھے ایسا لگتا تھا۔

میرا گھونگھٹ اور میرا ، براور، گھر کے اشٹ دیو کو ماتھا ٹکانے کے بعد میری ساس مجھے اپنے کمرے میں لے گئی، تاکہ میں اپنے سسر کے پاؤں چھوؤں، ان کے چرنوں کو ہاتھ لگاؤں ۔انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا، اور بولے ''سو تم آ گئیں بیٹی؟

میں نے تھوڑا چونک کر اس آواز کے مالک کی طرف دیکھا، اور ایک بار پھر ان کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ کچھ اور بھی آنسو ہوتے تو میں ان قدموں کو دھو، دھو کر پیتی ۔

حسب نسب

افسانہ نگار : قرۃ العین حیدر

لمبے چوڑے سیلے ہوئے غسل خانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا، پٹنک کے جھال، پال تیرے، اونچے حمام، مٹکے، پپوکی، رنگ برنگی صابن دانیاں، بیسن، ابٹن، جھانوے، لوٹے، آفتابے، مگے، کھونٹیوں پر غرارے اور میلے دوپٹوں کا انبار۔ آنولوں، رتھوں سے بھری طشتریاں، اندھیرا خندوس مواعلی بابا چالیس چور کا غار۔ لیکن یہی غسل خانہ چھمی بیگم کی دکھی زندگی میں وقت بے وقت جائے پناہ کا کام دیتا تھا۔اسی کے ہر شیشے والی کھڑکی کا رخ چنبیلی والے مکان کی طرف تھا۔اسی کے شیشے کا رنگ ذرا سا ناخن سے کھرچ کر چھمی بیگم نے باہر جھانکنے کا انتظام بھی کر کھا تھا۔ چھمی بیگم کے لاڈلے ابن عم اجو بھائی چنبیلی والے مکان میں رہتے تھے، پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو اس طرح تکتیں جیسے شاہ جہاں اپنے قید خانے میں سے تاج محل کو دیکھا کرتا تھا۔

اوسط درجے کے اس زمیندار خاندان کے آبائی گھر کے دو حصے تھے، باہر والا مردانہ، جس کے صحن چمن میں چنبیلی کی گھنی جھاڑیاں تھیں۔ "چنبیلی والا مکان کہلاتا تھا۔زنانے حصے کے آنگن میں املی کا سایہ دار درخت تھا، اس لئے محلے دارا سے املی والا مکان کہتے تھے۔دونوں آنگنوں کے درمیانی دیوار میں آمدورفت کے لئے ایک کھڑکی کھلی تھی،

چھمی بیگم کے ابا اور اجو بھائی کے ابا ایک ساتھ رہتے تھے، چھمی بیگم کی پیدا ہوتے ہی اجو بھائی سے منگنی ہو چکی تھی ۔نو دس سال کی عمر میں منگیتر سے پردہ کرا دیا گیا تھا، اجو بھائی بلا کے کھلنڈرے اور خوبصورت تھے، اکلوتے لاڈلے بیٹے اور دو گھروں کا واحد چراغ تھے۔اس لئے تو وہ جی بھر کے بگڑے، پتنگ بازی، کبوتر

بازی۔ یہ بازی وہ بازی۔ لیکن بڑے ابا اور ابا کو اطمینان تھا کہ بیاہ ہوتے ہی سدھر جائیں گے۔ چھمی بیگم تو ہوش سنبھالتے ہی انہیں اپنا مجازی خدا سمجھنے لگی تھی، ماں باپ کی اکلوتی وہ بھی تھیں۔ اور ان کے ناز بھی کم نہ اٹھائے جاتے تھے۔ ضدی، غصیلی، اور طنطنے والی چھمی بیگم جب سولہ سال کی ہوئیں، تو شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ دونوں طرف دھوم دھام سے تیاریاں ہونے لگیں، کہ اچانک موت نے اس سکھی اور خوشحال گھرانے کی بساط ہی الٹ دی، اس سال شاہ جہان پور میں جو ہیضے کی وباء پھیلی۔ اس میں پندرہ دن کے اندر، اندر چھمی بیگم کے ابا اور اماں دونوں چٹ، پٹ ہو گئے۔ چھمی بیگم پر قیامت گزر گئی۔ لیکن ابھی تایا اور تائی کا سایہ سر پر سلامت تھا۔ سب سے بری بات یہ کہ اجو بھائی سے بیاہ ہونے والا تھا۔ چھمی بیگم ماں باپ کا سوگ منانے کے بعد پھر مستقبل کے سہانے خواب دیکھنے میں مصروف ہو گئیں۔

شادی کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دی گئی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ بڑے ابا نئی تاریخ مقرر کریں۔ ان کا بیٹھے بٹھائے ہارٹ فیل ہو گیا۔

بڑے ابا کے مرتے ہی اجو بھائی نے کہا، کہ وہ چند مقدموں کے معاملات میں لکھنو جا رہے ہیں۔ اور

مصاحبوں کے ساتھ اڑنچھو ہو گئے۔ اب املی والے مکان مین رہ گئیں بڑی اماں، جو بالکل ہی باؤلی ہو رہی تھیں۔ اور چھمی بیگم۔ مردانہ بالکل سونا ہو گیا۔ ڈیوڑھی پر پرانے ملازم دھمو خاں ڈنڈا سنبھالے بیٹھے رہ گئے۔ اندر سلامت بوا اور ان کی روتی ناک سنکتی لڑکیاں کھان اپکانے مین جتی رہتیں۔ گھر کی حفاظت کے لئے بڑی اماں نے بریلی سے ایک بوڑھے رشتے دار للن خانکو بلا بھیجا۔ جو چنبیلی والے مکان کے دالان میں کھٹیا ڈال کر پڑ رہے۔

اجو بھائی لکھنو گئے تو وہیں کے ہو رہے۔ ہر خط میں ماں کو لکھ بھیجتے، کہ تاریخ

بڑھ گئی ہے۔ مہینے دو مہینے میں آجاؤں گا۔ پورے چھ مہینے بعد آئے تو بڑی اماں نے شادی کا ذکر چھیڑا۔ بولے جب تک زمینوں کے معاملات نہیں سمٹتے، میں شادی نہیں کروں گا۔اس کے بعد پھر واپس لکھنؤ چلے گئے۔

جبھی سے چھمی بیگم تاریک غسل خانے کے کونے میں میلے کپڑوں کے ڈھیر پر بیٹھ کر چپکے، چپکے رونے لگیں۔

اب چھمی بیگم انیس سال کی ہو چکی تھیں۔اجو بھائی نے شاید طے کرلیا تھا کہ لکھنؤ ہی میں رہیں گے۔لوگوں نے آکر بتایا کہ خوب رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ چھمی بیگم نہ جانے کیسا نصیب لے کر آئی تھیں۔ایک دن بڑی اماں پر دل کا دورہ پڑا اور وہ چل بسیں۔

اب چھمی بیگم تن تنہا رہ گئیں۔آنگن میں الو بولنے لگے۔مزید حفاظت کے خیال سے اندھے دھندے ملن خان چنبیلی والے مکان سے املی والے مکان میں منتقل ہو گئے۔ادھر دالان میں وہ پڑے کھانستے رہتے۔ادھر دھمو خاں دیوڑھی میں کھانستے رہتے۔

اجو بھائی ماں کے مرنے پر آئے اور تیجا کر کے واپس چلے گئے۔کس طرح انہوں نے بیچ منجدھار میں چھمی بیگم کا ساتھ چھوڑا۔اللہ، اللہ جب وہ سوچتیں تو کلیجہ منہ کو آتا اور پھٹنے لگتا۔مہینے کے مہینے لکھنؤ سے دو سو روپے کا منی آرڈر آجاتا، یا کبھی کبھار ملن خاں کے نام خیر خبر پوچھنے کا خط۔

ملن خان کی بیوی اور بیٹی بھی بریلی سے آگئی تھیں۔لیکن اپنی تنک مزاجی کی وجہ سے چھمی بیگم کی ان دونوں سے ایک دن نہ بنی۔دن بھر ان رشتہ داروں سے لڑنے جھگڑنے کے بعد یا آپ ہی آپ تلملانے اور کلسنے کے بعد چھمی بیگم پھر غسل خانے میں گھس جاتیں، اور روتیں۔شاہ جہانی شیشے میں سے چنبیلی والے مکان کو تکا کرتیں۔یہ زندگی بھی کیسی زندگی ہے۔وہ سوچتیں۔ابھی سب کچھ ہے ابھی کچھ بھی

نہیں۔ کل کی بات معلوم ہوتی ہے، کہ اس گھر میں کتنی رونق تھی، دالان میں آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ صحن میں مونڈھے پڑے ہیں۔ گیس کے ہنڈے سنسنا رہے ہیں۔ ابا اور بڑے ابا کے دوستوں کی محفل جمی ہے۔ مشاعرے ہو رہے ہیں۔ قوال گا رہے ہیں۔ اجو بھائی کے دوست احباب آ جاتے تو وہ کھڑکی کے پاس آ کر کھنکارتے، اور ایک مخصوص آواز میں آہستہ سے پکارتے۔

ارے بھئی چھمو ذرا چائے تو بھجوا دو۔

اس بھرے پرے گھر کو کس کی نظر کھا گئی۔

اپنی اس شدید یاس اور ناامیدی کے باوجود چھمی بیگم کو یقین تھا، کہ ایک نہ ایک دن اجو بھائی واپس آئیں گے۔ چنبیلی والا مکان پھر آباد ہوگا۔

جمعے کے جمعے وہ مردانہ مکان میں جاتیں۔ ڈھمو خاں اور سلامت بوا کی لڑکیوں کے ساتھ مل کر باغ کے جھاڑ جھنکار کی صفائی کرواتیں۔ دالان کے جالے صاف کیے جاتے۔ اندر کے کمرے مقفل تھے۔ دروازے کے شیشے میں سے جھانک کر وہ بڑے ابا، ابا اور اجو کے کمرے پر نظر ڈالتیں اور سر ہلاتیں۔ ٹھنڈی آئیں بھرتیں واپس آ جاتیں۔

چھمی بیگم تیس سال کی ہوگئیں، بال وقت سے پہلے سفید ہو چلے، اب انہوں نے چنبیلی کے باغ کی دیکھ بھال بھی چھوڑ دی۔ دل دنیا سے اچاٹ سا ہو گیا۔ لیکن غصے اور طنطنے کا عالم وہی رہا۔ لیکن اب عمر کی پختگی کے ساتھ اس میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

ان کی اس تمکنت اور طنطنے کے لئے وجوہات کچھ کم نہ تھیں، ماں باپ خالص اصل روہیلے پٹھان۔ دادا پر دادا ہفت ہزاری نہ سہی، ایک ہزاری یا دو ہزاری (یا گھوڑے جو کچھ بھی وہ ہوتے تھے) ضروری رہے ہونگے۔ سارے کنبے کا سرخ و سپید رنگ اور پٹھانی خودداری اور غصہ اس حقیقت کا کھلا ثبوت تھا، کہ اس

خاندان میں کھیل کبھی نہ ہوئی، ماضی کے ان جغادری روہیلہ سرداروں کے نام لیوا، اس کنبے کے حسب ونسب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔ اس فکر میں وہ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئیں۔ محلے کی عورتوں سے ملنا جلنا بھی بند کر دیا۔ بیواؤں کے سفید کپڑے پہننے لگیں۔ ان کا زیادہ تر وقت مصلے پر گزرتا۔ اکثر دوپہر کے سناٹے میں سلامت بوا آنگن کی کھڑکی میں بیٹھ کر زردہ پھانکتے ہوئے بڑی ڈراونی آواز میں آپ ہی آپ بربڑاتی رہتیں۔

باری تعالیٰ فرماتا ہے۔ مجھے دووخت اپنے بندوں پر ہنسی آتی ہے۔ ایک جب جسے میں بنا رہا ہوں، اسے کوئی بگاڑنے کی کوشش کرے۔ بس دووخت۔ چھمی بیگم دہل کر ڈانٹتیں۔ لیکن سلامت بوا اطمینان سے اسی طرح بڑبڑاتی رہتیں۔

اس روز نوچندی جمعرات تھی۔ چھمی بیگم غسل خانے میں نہا رہی تھیں۔ سردیوں کا زمانہ تھا۔ حمام کے نیچے سلگتے انگارے کب کے بجھ چکے تھے۔ اور چھمی بیگم کو کپکپی سی چڑھ رہی تھی۔ جلدی سے بال بوا کی سڑیلی نواسی نیز ور سے غسل خانے کے دیمک للکیو اڑی کنڈی کھڑکائی۔

آپا۔ اے آپا، جلدی نکلو۔

ارے کیا ہے باؤلی لڑکی؟

چھمی بیگم نے جھنجھلا کر آواز دی۔

آپا وہ چنبیلی والے مکان میں آپ سے کہا گیا ہے کہ چار پانچ جنوں کے لئے چائے بھجوادو۔ جلدی سے۔

کیا،،،، کیا؟ چھمی بیگم ک واپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ انہوں نے جلدی سے شاہ جہانی شیشے سے آنکھ لگادی۔

صحن کا پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ باہر دو تانگے کھڑے تھے۔ دو تین مزدور سامان اتروا رہے تھے۔ ایک سیاہ فام لیکن تیکھے نقوش والی عورت سرخ جارجیٹ کی ساڑھی

پہنے ہری بنارسی شال میں لپٹی دالان میں موڑھے پر اطمینان سے گھٹنے ہلا ہلا کر نوکروں کو احکام دے رہی تھی۔ ایک اس کی ہم شکل تیرہ، چودہ سال کی لڑی شکل والی اچھال سکہ سی لڑکی کاسنی شلوار قمیض پہنے فرش پر اکڑوں بیٹھی ایک بکس کھولنے میں مصروف تھی۔ اتنے میں اندر سے اجو بھائی، ہمیشہ کی طرح بانکے چھبیلے اجو بھائی دالان میں آئے۔ جھک کر اس لال چڑیل سے کچھ کہا۔ وہ قہقہ لگا کر ہنسی۔ چھمی بیگم کی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا۔ نیم تاریک غسل خانہ اب بالکل ہی ایک اندھا کنواں بن گیا۔ انہوں نے جلدی سے ایک کھونٹی پکڑی۔۔۔ لڑکھڑاتی ہوئی باہر آئیں۔ اور بے سدھ سی ہو کر اپنے بستر پر گر گئیں۔

بات یہ تھی کہ اجو بھائی جنہوں نے برسوں سے لکھنؤ والی کلو کو اپنے گھر میں ڈال رکھا تھا۔ اب با قاعدہ نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ کاسنی شلوار والی لڑکی اشرفی کلو اپنے ساتھ لائی تھی۔ اجو بھائی کی نہیں تھی۔

شام کو اجو بھائی پردہ کروائے بغیر درانہ زنانہ میں چلے آئے۔ اور دالان میں پہنچ کر پکارا۔ ارے بھئی چھمو آؤ اپنی بھابھی سے مل لو۔!

چھمی بیگم کانپ کر رہ گئیں۔ پلنگ سے اٹھ کر پھر غسلخانے میں جا گھسیں اور اندر سے چٹخنی

چڑھا دی۔ اجو بھائی زرا چور سے جیدالان کے ایک در میں کھڑے رہے۔ کلو ان سے پیچھے کھڑی تھی۔ دونوں میاں بیوی چند منٹ تک اسی طرح چپ چاپ کھڑے رہے۔ اور پھر سر جھکا کر چنبیلی والے مکان میں واپس چلے گئے۔

اس دن کے بعد سے چھمی بیگم کی دنیا ہی بدل گئی۔ اب وہ سارا دن قران شریف ہی پڑھا کرتیں، اجو نے انہیں اتنے سال ہوا میں معلق رکھ کے ان کی زندگی تباہ کر کے کسی اور سے شادی کر لی۔ اس ناقابل برداشت صدمے سے زیادہ دہشت انہیں۔ اس بات سے تھی کہ انہوں نے کلو بائی طوائف سے شادی کر کے خاندان کا

حسب ونسب برباد کر دیا۔

چھمی بیگم اس جرم کے لئے انہیں قیامت تک معاف نہیں کرسکتی تھیں۔کلو نے کئی بار دوستی کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا۔اکثر وہ آنگن کی کھڑکی میں آکر آہستہ سے کہتیں۔ بیٹا کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتادیجیے۔ کبھی کوئی خاص کھانا پکتا تو نوکر کے ہاتھ سینی میں بھجواتیں۔لیکن چھمی بیگم نے دھمو خاں کا حکم دے رکھا تھا کہ چنبیلی والے مکان سے کوئی چڑیا کا بچہ بھی اس طرف آئے تو اس کی ٹانگیں توڑ دو۔

گھر واپس آنے کے بعد دوسرے مہینے اجو بھائی نے دو سو روپے ملن خاں کے ہاتھ بھجوائے، جو وہ اب تک لکھنؤ سے بھجوایا کرتے تھے۔لیکن اب صورت حال بدل چکی تھی،

چھمی بیگم کھڑکی میں جا کر للکاریں۔

جمعہ خاں مرحوم کی بیٹی اور شبو خاں مرحوم کی بھتیجی چکلے سے آیا ہوا ایک پیسہ بھی اپنے اوپر حرام سمجھتی ہے۔ملن خاں! غیرت والے پٹھان ہو تو جا کر یہ دو سو روپے دینے والے کے منہ پر دے مارو۔

رجز پڑھ کر انہوں نے کھڑکی کا دروازہ بند کر لیا۔اور اس میں موٹا قفل ڈال دیا۔

اب چھمی بیگم اپنے زیور بیچ کر گزر بسر کرنے لگیں۔زیور ختم ہو گئے تو گھر کا پرانا قیمتی سامان کباڑیے کے ہاتھ فروخت کر ڈالا۔لیکن بھوک ایک دائمی مرض ہے۔ جس کا وقتی علاج کافی نہیں۔اور چھمی بیگم کو دھمو خاں، ملن خاں اور ان کے چینگو پوٹوں کا پیٹ بھی بھرنا تھا۔

انھوں نے گھر میں قران شریف اور اردو پڑھانے کے لئے بچیوں کا مکتب کھول لیا۔ محلے والوں کی سلائی کرنے لگیں۔ جب محنت کرتے، کرتے بیمار پڑ گئیں۔اور بلبلا کر بخار چڑھ آیا تو سلامت بوا ہڑ بڑا گئیں۔اور غصے سے بولیں۔۔ بی بی کیا آن پر جان دے دو گی۔لیکن چھمی بیگم پر غنودگی طاری تھی۔سلامت بھاگ

بھاگی چنبیلی والے مکان پہنچیں۔

کلو فوراً سر پر برقعہ ڈال گلی کے راستے اندر آئیں۔ ڈاکٹر بلایا گیا، کلو ساری رات نند کی پٹی سے لگی بیٹھی رہی۔ اجو بھائی نے کئی بار آکر دکھیاری چچازاد بہن کی حالت دیکھی۔ لیکن اب بھی شاید اس بے انصافی کا احساس نہیں ہوا جو انہوں نے چھمی بیگم کے ساتھ کی تھی۔ کیونکہ بقول سلامت بوا، اس کالی کلوٹی نے انہیں الو کا گوشت کھلا رکھا تھا۔

چھمی بیگم کو جونہی ہوش آیا۔ آنکھیں کھولیں اور کلو کا متفکر چہرہ سامنے دیکھا۔ ان پر غم و غصہ کا بھوت طاری ہو گیا۔ کلو ان کے پٹھانی خون سے بے حد خوف زدہ تھی۔ فوراً کان دبا کر اپنے گھر واپس بھاگ گئی۔

بیشتر طوائفوں کی طرح جو شادی کر کے بے حد وفا شعار بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ کلو بھی بڑی پتی ورتا عورت تھی۔ اور اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ چھمو بیگم انہیں کنبے کی بہو اور اپنی بھاوج سمجھ کر املی والے مکان میں داخل کر لیں۔ لیکن اس کی یہ تمنا کبھی نہ پوری ہوئی۔

دس سال نکل گئے۔ اجو بھائی کو چھمی بیگم کے رشتے کی بھی فکر تھی۔ لیکن چھمی بیگم ادھیڑ ہو چکی تھیں اب ان سے شادی کون کرے گا؟۔

چھمی بیگم ان سے اور کلو سے شدید پردہ کرتی تھیں۔ اسی طرح مدرسہ چلا کر گزر کر رہی تھی۔ کہ ملک تقسیم ہو گیا۔ آدھا شاہ جہان پور سمجھو خالی ہو گیا۔ ان کے مکتب کی ساری لڑکیاں اپنے، اپنے ماں باپ کے ساتھ پاکستان چلی گئیں۔

چھمی بیگم کے ہاں دو روٹیوں کے لالے پڑ گئے۔ اسی زمانے میں شامت اعمال کہ کسی کام سے اجو بھائی دلی گئے۔ اور فسادوں میں وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ جب ان کی سناونی آئی تو کلو پچھاڑیں کھانے لگی۔ چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ آنگن کی کھڑکی پر ٹکے مار، مار کر ماتھا لہولہان کر لیے۔

بیٹا۔۔۔۔بیٹا،،،،دروازہ کھولیے۔۔۔۔ہائے بیٹا میں کہیں کی نہ رہی۔

چھمی بیگم دالان کے تخت پر بے خبر سو رہی تھیں۔ بین سن کر جاگ اٹھیں۔ گھبرا کر دیوار کی کیل سے ٹنگی کنجی اتاری۔تالا کھولا۔کلو بال بکھرائے بھتنی کی طرح چیخ رہی تھی۔

ارے لوگو میرا سہاگ لٹ گیا۔ہائے بیٹا میری مانگ اجڑ گئی۔

اس نے آگے بڑھ کر چھمی سے لپٹنا چاہا۔وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئیں۔نیند سے بوجھل آنکھیں ملیں،اور اچانک ان کی سمجھ میں بات آگئی۔تب بھی وہ کھڑکی میں بیٹھ گئیں۔سفید دوپٹہ منہ پر رکھ لیا۔سسک، سسک کر رونے لگیں،اور روتے، روتے بولیں۔

اری مردار تو تو آج بیوہ ہوئی ہے۔میں بد بخت تو سدا کی بیوہ ہوں۔

اجو بھائی کے چہلم کے بعد ہی کلو نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔اس کی لڑکی اشرفی کا اجو بھائی مرحوم نے چند سال پہلے اپنے کسی مصاحب سے نکاح کروا دیا تھا۔لکھنو سے آئی۔چنبیلی والے مکان کے ساز و سامان پر قبضہ کیا۔اور سب چیزیں چھکڑوں پر لاد کر چلتی بنی۔

چھمی بیگم غسل خانے کے شیشے میں سے بے نیازی کے ساتھ فانی دنیا کے یہ سارے تماشے دیکھتیں۔

چنبیلی والے مکان پر کسٹودین کا تالا پڑ گیا۔کیونکہ چھمی بیگم عدالت میں یہ کسی طرح ثابت نہ کر سکیں، کہ اجو بھائی پاکستان نہیں گئے۔بلکہ بلوے میں مارے گئے ہیں۔خود کسی آسیب کی طرح وہ املی والے مکان میں موجود رہیں۔

ملن خاں اور دھمو خاں بڑھاپے اور فاقہ کشی کی وجہ سے مر گئے۔سلامت بوا پر فالج گر گیا۔ان کی لڑکیاں اور داماد پاکستان چلے گئے۔چھمی بیگم سلائی کر کے پیٹ پالتی رہیں۔تن تنہا مکان میں رہتے اب انہیں ڈر نہیں لگتا تھا۔کیونکہ سر سفید ہو چکا

تھا۔ یہ تجلد محلے کی بڑی بوڑھی کہلائیں گی۔

کچھ عرصہ پہلے چنبیلی والے مکان میں ایک سکھ شرنارتھی ڈاکٹر آن بسے۔ کبھی، کبھی سردارنیاں آنگن کی کھڑکی میں آن بیٹھتیں، اور وہ اور چھمی بیگم اپنے دکھ سکھ کی باتیں کرتیں۔ ڈاکٹر صاحب کی لڑکی چرجیت کی شادی نئی دلی میں کسی سرکاری افسر سے ہوئی تھی،

اب کی بار وہ میکے آئی تو اس نے ماں سے کہا، کہ اس کے شوہر کے مسلمان افسر اعلیٰ کی بیگم کو استانی کی ضرورت ہے جو گھر پر رہ کر بچوں کو اردو اور قران پاک پڑھائے۔ میں تو چھمی ماسی سے کہتے ہوئے ڈرتی ہوں انہیں جلال آجائے گا۔ آپ کہہ کر دیکھیے۔

بڑی سردارنی نے چھمی بیگم سے اس ملازمت کا ذکر کیا۔ سمجھایا بجھایا۔۔ بہن جی اس تنگ دستی اور تنہائی میں کب تک بسر کرو گی۔ دلی چلی جاؤ صبیح الدین کے ہاں بڑھاپا آرام سے کٹ جائے گا۔

چھمی بیگم کا غصہ کب کا دھیما پڑ چکا تھا، جوش خروش طنطنے اور جلال میں کمی آگئی تھی۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی، کہ اگر کل کلاں کو مر گئی تو سرہانے یاسین شریف پڑھنے والا تو کوئی ہونا چاہیئے۔

قصہ مختصر چھمی بیگم برقعہ اوڑھ صرف ایک بکس اور لوٹا ساتھ لے کر گھر سے نکلیں، جو اب تک بالکل کھنڈر ہو چکا تھا۔ اور جس کے کھنڈر ہونے کا اب انہیں کوئی غم نہیں تھا۔ کیونکہ وہ تیاگ اور سنیاس کی سطح پر پہنچ چکی تھی،

وہ ریل میں بیٹھ کر دلی پہنچیں۔ جہاں ریلوے اسٹیشن پر بیگم صبیح الدین کار لے کر خود انہیں لینے پہنچی۔ اور گھر لے گئیں۔

اسی روز سے چھمی بیگم بنت جمعہ خاں زمین دار شاہ جہان پور مغلانی بی بن گئیں۔

چھمی بیگم نے پورے بارہ سال سفید براق دوپٹہ ماتھے سے لپیٹے صبیح الدین

کے گھر میں گزار دیئے۔ بچے جنہیں وہ قرآن شریف اور اردو پڑھانے آئی تھیں، بڑے ہو گئے تھے۔ بڑا لڑکا بی، اے کے بعد اپنے چچا کے پاس پاکستان بھیج دیا گیا، منجھلی لڑکی بھی کراچی چلی گئی۔ چھوٹی لڑکی کالج پہنچ گئی۔ اب بیگم صبیح الدین کو چھمی بیگم کی ضرورت نہ تھی۔ صبیح الدین ریٹائر ہو کر اپنے وطن مرزاپور جانے والے تھے۔ دلی روانہ ہونے سے پہلے بیگم صبیح الدین نے انہیں اپنی دوست بیگم راشد علی کے ہاں رکھوا دیا۔

راشد صاحب بھی حکومت ہند کے اعلیٰ افسر تھے۔

چھمی بیگم صبیح الدین کے ہاں بڑے آرام سے رہی تھی۔ ان سے گھر کے بزرگوں کا سا برتاؤ کیا جاتا تھا۔ انہیں تینوں بچوں سے بے حد محبت ہو گئی تھی۔ غصہ بھی بہت کم آتا تھا۔ آتا بھی تھا تو پی جاتی تھیں۔ کیونکہ ناز اٹھانے، خفگی برداشت کرنے والے سب اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ کبھی کبھی کلو کا خیال بھی آجاتا اور سوچتیں نہ جانے اب کس حال میں ہو گی۔ یا شاید وہ بھی مر کھپ گئی ہو آج کل زندگیوں کا کیا بھروسہ؟

بیگم راشد علی، بیگم صبیح الدین کی طرح دردمند اور دین دار خاتون تو نہ تھیں۔ لیکن عزت انہوں نے بھی چھمی بیگم کی بہت کی، یہاں وہ گھر کے ایک فرد کی حیثیت سے رہتی تھیں۔ راشد علی صاحبان کے بارعب پروقار شکل وصورت اور اعلیٰ نسبی سے بہت متاثر تھے۔ بیگم راشد علی کے بچے بہت خورد سال تھے ان پر حیدرآبادی آیا مامور تھی۔ چھمی بیگم ہاؤس کیپر بن گئیں۔ گھر سنبھالنے کے لئے بیگم راشد کو چھمی بیگم کی بے حد ضرورت تھی۔ کیونکہ ان کا اپنا زیادہ وقت کلبوں، پارٹیوں اور سرکاری تقریبات میں گزرتا تھا۔ پانچ برس چھمی بیگم نے بیگم راشد کے یہاں بھی کاٹ دیئے۔ جب راشد صاحب کا تبادلہ واشنگٹن ہونے لگا، تو ان کی بیگم کو چھمی بیگم کی فکر ہوئی۔

ایک دہ وہ اپنے الوداعی لنچ کے لئے روشن آرا کلب گئی ہوئی تھیں۔ اور چھمی بیگم سے کہتی گئیں کہ فلاں وقت کار لے کر منی کو میرے پاس لے آیئے گا،

جب چھمی بیگم روشن آرا کلب پہنچیں، لنچ ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ چھمی بیگم بچے کی انگلی پکڑے سبزے پر ٹہلتی رہیں۔

چھمی بیگم اب پردہ نہیں کرتی تھیں، اور ساڑھی پہنتی تھیں۔ اس نگوڑی دلی میں اب انہیں پہچاننے والا کون تھا، سامنے برامدے میں ایک طرف رمی کی محفل جمی ہوئی تھی، ایک بے حد فیشن ایبل پینتالیس سالہ خاتون حقاقہ وقاقہ خاتون کے ساتھ پانچ چھ مردوں کے ساتھ قہقہے لگا کر تاش کھیلنے میں مصروف تھی،

سترہ برس کی زندگی نئی دلی میں گزار کر چھمی بیگم اس نئی اعلیٰ سوسائیٹی اور ہندوستانی خواتین کی جدید طرز زندگی کیعادی ہو چکیں تھیں۔ اس لئے چھمی بیگم اطمینان سے گھاس پر ٹہلنے لگی۔

چند منٹ بعد اس خاتون نے چھمی بیگم کو ذرا غور سے دیکھا، اپنے ایک ساتھی سے کچھ کہا۔ ایک مرد وا تاش کی میز سے اٹھ کر چھمی بیگم کے پاس آیا اور کہا بڑی بی زرا ادھر آیئے۔

چھمی بیگم متانت سے برامدے میں پہنچیں۔ اجنبی خاتون نے پوچھا یہ بچی کس کی ہے۔ اور وہ کس کی ملازمہ ہے۔ چھمی بیگم نے بتایا،،،، خاتون نے کہا وہ بمبئی میں رہتی ہیں اورانہیں بھی ایک قابل اعتماد بڑی بی کی تلاش ہے۔ اگر وہ اپنے جیسی کسی بڑی بی کو جانتی ہیں تو بتائیں۔ چھمی بیگم فوراً اپنے دل میں اس رب کریم کالاکھ شکر بجالائیں جو رزق کا ایک دروازہ بند کرتا ہے۔ تو دوسرا کھول بھی دیتا ہے۔ پھر انہون نے اسی وقار سے جواب دیا کہ وہ تو خود جلد ہی اپنی موجودہ ملازمت سے سبک دوش ہونے والی ہیں۔

میری بیگم ابھی آتی ہونگی ان سے بات کرلیجیئے گا۔ اتنا کہہ کر وہ بیگم راشد کے

انتظار میں وہیں برامدے کے ایک درسے ٹک گئیں۔

جب بیگم راشد لنچ روم سے باہر نکلیں، ت ومیز سے اٹھ کر اجنبی خاتون نے اپنا تعارف کرایا، اور چھمی بیگم کے متعلق ان سے بات کی۔ وہ بھی بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے اپنے گھر ک اپتا لکھ کر چھمی بیگم کو دے دیا۔ لیکن بیگم راشد نے زرا متفکر ہو کر پوچھا، خالہ تم اتنی دور کا سفرا کیلے کر لو گی۔

چھمی بیگم نے فوراً اقرار میں سر ہلا دیا۔ چھمی بیگم کو اب زندگی میں کسی بات کے لئے نہیں کہنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے رضیہ بانو سے تنخواہ کا فیصلہ بھی نہ کیا۔ کیونکہ انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے لئے ایک ہی تنخواہ مقرر کر لی تھی، چالی سروپے ماہوار اور کھانا۔ چالی سروپے ان کی ذاتی ضروریات کے لئے ضرورت سے زیادہ تھے۔ کپڑے ہمیشہ انہیں اپنی بیگموں سے مل جاتے تھے۔ عرصہ ہوا انہیں معلوم ہو چکا تھا، کہ کپڑے لتے گہنے، پاتے جائیداد، املاک، رشتے ناطے، دوستی محبت سب بے معنی اور فانی چیزیں ہیں۔

بیگم راشد علی اور چھمی بیگم برآمدے سے اترنے لگیں، تو رضیہ بیگم نے فوراً بیگ کھول کر ڈیڑھ سو روپے کے نوٹ چھمی بیگم کے حوالے کر دیئے۔

سفر خرچ اور دوسرے اخراجات۔ انہوں نے ذرا بے پروائی سے کہا، بیگم راشد کو اس دریا دلی پر حیرت ہوئی۔ لیکن انہین کو دمعلوم تھا کہ بمبئی میں ایک سے ایک بڑی سیٹھانی موجود ہے۔ چھمی بیگم نے خاموشی سے نوٹ صدری کی جیب میں اڑس لیے۔ انہوں نے اب زندگی کے انوکھے واقعات پر متعجب ہونا بھی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر و مسز راشد علی کے امریکہ روانہ ہونے سے دو دن پہلے چھمی بیگم نے بھی ٹرین میں سوار ہو کر بمبئی کا رخ کیا،

بمبئی سنٹرل پہنچ کر وہ پہلی بار ذرا گھبرائیں، کیونکہ نئی دلی کی پر سکون کوٹھیوں میں انہوں نے اب تک بہت محفوظ اور مامون زندگی گزاری تھی۔ اللہ کا نام لے کر وہ

پلیٹ فارم سے باہر نکلیں، قلی کے سر سے دری میں لپٹا ہوا بستر اور ٹین کا بکسا اتروایا۔ اپنا لوٹا دستی پنکھا اور پندنیا ہاتھوں میں سنبھال کر ٹیکسی کی۔ سردار جی کو پتا بتایا۔ ''گلزار۔ جارڈن روڈ۔''

چند منٹ میں ٹیکسی ایک بلند و بالائی عمارت کی برساتی میں جا کر رکی۔ چھمی بیگم نے بوڑھے سردار جی کو کرایہ ادا کیا۔ جو راستے میں ان سے دنیا کے حالات پر تبادلہ خیالات کرتے آئے تھے۔

اسی وقت دو بے حد سمارٹ لڑکیاں لفٹ سے نکل کر سردار جی کی ٹیکسی میں بیٹھ گئیں۔ سردار جی نے خاموشی سے فلیگ گرایا، اور پھاٹک سے باہر نکل گئے۔ کسی قدر غیر منظم اور میکنکل زندگی اس شہر کی تھی۔

چھمی بیگم نے صدری کی جیب سے میلا سا کاغذ کا ٹکڑا نکال کر چندھیائی آنکھوں سے پڑھا۔ گیارھویں منزل، فلیٹ نمبر ۳۔ اسٹول پر بیٹھے ہوئے چوکیدار نے اکتائے ہوئے انداز میں کاموشی سے اٹھ کر ان کا سامان لفٹ میں رکھ دیا۔ لفٹ آٹومیٹک تھا۔ چھمی بیگم بہت گھبرائیں۔ چوکیدار جلدی سے اندر آیا اور چھمی بیگم کو گیارھویں فلور تک پہنچا کر واپس نیچے چلا گیا۔

اب چھمی بیگم اپنے سامان سمیت طویل گیلری میں اکیلی کھڑی تھیں، پھر ان کی نظر نزدیکی دروازے پر پڑی، جس کے اوپر نمبر ۳ لکھا تھا۔ دروازے پر ایک اور آہنی جالی دار دروازہ چڑھا ہوا تھا، جو اندر سے مقفل تھا، جیسے بینکوں کے دروازے ہوتے ہیں۔ چھمی بیگم نے آگے بڑھ کر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ چند لحظوں بعد ایک بھوری آنکھ نے اندرونی کواڑ کا جالی دار سوراخ کا پٹ ہٹا کر جھانکا۔ چھمی بیگم کو دفعتاً، برسوں بعد اپنے غسل خانے کی کھڑکی کا کھرچا ہوا شیشہ یاد آ گیا۔ جس میں سے انھوں نے پہلی بار اس منحوس چڑیل کو دیکھا تھا، جو ان کے بھرے پرے کنبے کو چٹ کر گئی، مزید توقف کے بعد دونوں دروازے کھلے، اور ایک غصیلا سا گورکھا باہر نکلا،

اس نے مشکوک اور بے رحم نظروں سے چھمی بیگم کو دیکھا۔

چھمی بیگم ڈر سی گئیں، لیکن پھر یاد آیا کہ وہ بھی پٹھان ہیں۔ سر اٹھا کر وقار سے کہا۔

''بیگم صاحب سے کہو چھمی بیگم دلی سے آ گئی ہیں۔''

مالوم ہے تم دلی سے آیا ہے۔ اندر آ جاؤ۔'' گورکھے نے خشکی سے جواب دیا۔ اور باہر نکل کر ان کا بستر اور بکس اٹھایا۔ اس کے پیچھے پیچھے چھمی بیگم اندر آ گئیں، تو اس نے کھٹ سے دونوں دروازے مقفل کر دیئے۔

اب چھمی بیگم ایک نیم تاریک، ایر کنڈیشنڈ، بے حد عالی شان ڈرائینگ روم میں کھڑی تھیں، ایسا شان دار ڈرائینگ روم، تو نہ بے چارے صبیح الدین کا تھا۔ اور نہ ہی راشد علی صاحب کا تھا۔ ایک طرف کی دیوار پر سیاہ پردہ پڑا ہوا تھا۔ جو ذرا سرکا ہوا تھا۔ اور اس کے پیچھے دیوار نصب سنیما کی چھوٹی سی اسکرین نظر آ رہی تھی۔ کمرے کے دوسرے حصے میں بار تھی۔ بیگم صاحبہ ہیں؟

''میم صاحب سو رہا ہے۔

اور صاحب؟۔ ملازمت شروع کرنے سے پہلے گھر کے صاحب کے انٹرویو سے وہ ہمیشہ جھجکتی تھیں۔

گورکھے نے کوئی جواب نہ دیا، اور ڈرائینگ روم سے نکل کر ایک گیلری کی طرف چلا، چھمی بیگم اس کے پیچھے، پیچھے دونوں طرف دیکھتی ہوئی۔ گیلری میں دو رویہ چار دروازے تھے، جو سب اندر سے بند تھے۔

آگے چل کر گیلری بائیں طرف کو مڑ گئی۔ یہاں باورچی خانہ اور نوکروں کے دو مختصر سے کمرے تھے۔ جن کے باہر بالکنی تھی۔

نوکروں کے استعمال والے زینے میں بھی اندر سے تالا پڑا تھا۔ ایک صاف ستھری اور روشن خالی کوٹھری میں جا کر گورکھے نے بکس بستر دھم سے زمین پر رکھ دیا،

اور اسی طرح چپ چاپ باہر چلا گیا۔

چھمی بیگم نے پندنیا بڑے طاق کے تختے پر رکھ کر، اپنی نئی جائے پناہ، نئے ٹھکانے پر نظر ڈالی، کونے میں لوہے کا ایک پلنگ پڑا تھا۔ انہوں نے دل میں سوچا یہ بہت چبھے گا۔

دیواروں پر پچھلے شوقین مزاج ملازم کی چپکائی ہوئی فلم ایکٹریسوں کی تصویریں مسکرا رہی تھیں۔

کوٹھری میں حبس طاری تھا، چھمی بیگم نے کھڑکی کھولی، تو اچانک سمندر آنکھوں کے آگے آ گیا۔ نیلا، وسیع، بیکراں سمندر ٹھاٹھیں مارتا ہوا، غیر متوقع، زندگی کے واقعات کی طرح، اچانک انہوں نے سمندر کبھی نہ دیکھا تھا۔ دفعتاً خیال آیا، اس کار ساز کے قربان جاؤں۔ سمندر تک پہنچ گئی۔ اب انشا اللہ حج بھی کر آؤں گی۔ اسی سمندر کے اس پار مکہ مدینہ ہے یہ سوچ کر ان کا جی بھر آیا۔

کوٹھری سے ملحق نوکروں کا غسل خانہ تھا، چھمی بیگم نے بکسا کھولا کپڑے نکالے، غسل خانے میں گئیں، اپنے آبائی مکان کا وہ طویل وعریض نیم تاریک غسل خانہ، مامائیں، اصیلیں وہ برسوں کی کوشش کے بعد بھلا چکی تھیں۔ کہ انسان پیہم تبدیلیوں کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ورنہ مر جائے۔

نہا، دھو، کپڑے بدل وہ کوٹھری میں آئیں تو سارا گھر سنسان پڑا تھا۔ نوکر نہ چاکر، صاحب دفتر گئے ہوں گے۔ میم صاحب سو رہی تھیں۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اب انہیں چائے کی طلب ستانے لگی۔ ساری عمر شدید ذہنی اور جذباتی صدمے سہتے رہنے سے چھمی بیگم کی تیزی، طراری کب کی ہوا ہو چکی تھی۔ اور وہ بڑھاپے کی وجہ سے سٹری، بہتری بھولی بھگی ہو کر رہ گئی تھیں۔ سادگی سے سوچا، اب کچن میں جا کر چائے بنا لوں،

سنسان باورچی خانے میں پہنچیں تو وہاں گیس کے چولھے نظر آئے، جو وہ

استعمال کرنا نہ جانتی تھی۔ ذرا جھنجھلا کر گیلری میں آئیں، ج سکے چار دروازوں میں سے ایک اب کھل چکا تھا۔ اور اس پر پڑا بیش قیمتی پردہ دکھائی دے رہا تھا۔

ان کے پیروں کی چاپ سن کر پردے کے پیچھے سے کسی نے آواز دی۔

کون ہے؟

چھمی بیگم ہوں، دلی سے آئی ہوں۔ انہوں نے اسی سادگی سے جواب دیا۔

اوہو۔ آ گئیں، آ جاؤ۔

یہ پردہ سرکرا اندر گئیں۔ ایک بالکل شاہانہ خواب گاہ میں وسیع وعریض امریکن چھپر کٹ پر رضیہ بیگم نائٹ گون پہنے نیم دراز تھیں۔ انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہا تھا۔ چھمی بیگم کو ان کا یہ ننگا پہناوا ذرا بھی پسند نہ آیا۔ لیکن سوچا بھئی اپنا، اپنا دستور ہے، اس شہر کے یہی رنگ ڈھنگ ہیں۔ رضیہ بانو کا سگریٹ بھی انہیں اچھا نہ لگا۔ بیگم صبیح الدین اور بیگم راشد دونوں سگریٹ نہیں پیتی تھیں۔ بہر حال انہوں نے برد باری سے کہا

''سلام علیکم''

''آ جاؤ بوا، بیٹھو۔'' رضیہ بانو نے فرش کی طرف اشارہ کیا۔

جب سے چھمی بیگم سر پر برقعہ ڈال کر حق حلال کی روزی کمانے باپ دادا کی دہلیز سے باہر نکلی تھیں۔ آج تک انہیں بوا کسی نے نہیں کہا تھا۔ صبیح الدین صاحب اور راشد صاحب دونوں کے ہاں انہیں چھمی خالہ یا پھر صرف خالہ کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ وہ تمکنت سے دیوان کے کنارے ٹک گئیں۔

رضیہ بانو کے سرہانے دو ٹیلی فون رکھے تھے۔ ایک سفید ایک سرخ۔ سفید والے کی گھنٹی بجی۔ رضیہ بیگم نے ریسور اٹھا کر آہستہ، آہستہ انگریزی میں کچھ باتیں کیں۔ ہاتھ بڑھا کا سائیڈ سے بڑی سی مجلد نوٹ بک اٹھائی، اس میں کچھ لکھا، پھ رریسور اٹھا کر سرخ رنگ کے ٹیلی فون کا ایک نمبر ملایا، اور آہستہ سے کہا۔

مادھو،،،،،، چار نمبر نائن تھرٹی۔،،اور فون بند کر دیا۔

چھمی بیگم خاموش بیٹھی آرائش دیکھتی رہی۔ مرمریں مجسمے، بڑی بڑی تصویریں۔ ریڈیوگرام، طول طویل سفید رنگ کا وارڈ روب، اتنے میں پردہ سرکا۔ ایک طرح وارلڑکی ہاؤس کوٹ پہنے ہوئے اندر آئی۔ گیلری کے بند دروازوں میں سے ایک کھلا۔ کمرے میں زور سے ہائی فائی (Hi Fi) کی آواز سنائی دی۔ لڑکی نے رضیہ بانو سے کچھ گٹ مٹ کی، الٹے پاؤں واپس گئی اور گیلری والا دروازہ پھر بند ہو گیا۔

اللہ رکھے کتنے بچے ہیں؟ چھمی بیگم نے دریافت کیا۔

''میرے ہاں کوئی اولاد نہیں۔ یہ میری بھانجیاں میرے ساتھ رہتی ہیں'' رضیہ بانو نے مختصر جواب دے کر پھر مجلد نوٹ بک کھول لی۔

کالج میں پڑھتی ہوں گی''۔ چھمی بیگم نے کہا

''کون رضیہ نے بے خیالی سے پوچھا۔

بھانجیاں آپ کی؟

''ہوں''

''اللہ رکھے آپ کے میاں بزنس کرتے ہیں۔؟

چھمی بیگم کو معلوم تھا بمبئی میں سب بزنس کرتے ہیں۔

ہیں؟، کیا؟'' رضیہ بانو نے نوٹ بک سے سر اٹھا کر ذرا ناگواری سے پوچھا۔''

میاں۔؟ میاں مر گئے۔''

انا للہ وانا الیہ راجعون۔'' چھمی بیگم کے منہ سے نکلا۔ لمحے بھر کے لئے اجو بھائی اللہ بخشے کی موت کا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ ہر موت کی خبر پر ہرا ہو جاتا تھا۔ کوئی کیا جان سکتا تھا، کہ چھمی بیگم نے اپنی ساری عمر کیسے بے پایاں اندوہ میں مبتلا رہ کر اسے کس طرح ضبط کر کے گزار دی۔

صبر،شکر۔صبر شکر۔

چوڑی دار پا جامہ پہنے ایک اور مجسم قیامت نوجوان لڑکی لہراتی بل کھاتی کمرے میں آئی ۔رضیہ بانو نے انگریزی میں اس سے کچھ کہا۔

لڑکی اسی طرح لہراتی مسکراتی باہر چلی گئی۔

اب رضیہ بانو چھمی بیگم کی طرف متوجہ ہوئیں،جنھیں چائے کی طلب میں جمائیاں آنے لگی تھیں۔

رضیہ بانو نے ایک تکیہ کہنیوں کے نیچے دبا کر کہنا شروع کیا۔"بوا"

(چھمی بیگم پھر کلبلائیں) آپ نے بہت اچھا کیا جو میرے ہاں چلی آئیں۔ میں نے پہلی نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ آپ بے سہارا اور دکھی ہیں۔اب آپ اس گھر کو اپنا گھر سمجھیے۔ میں ہمیشہ یہ چاہتی ہوں، کہ کوئی بزرگ بی بی میرے ہاں رہیں۔ بڑا سہارا سا رہتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ کوئی بزرگ بی بی میرے گھر میں نماز اور قران پڑھتی رہیں۔ برسوں سے میرے پاس ایک حیدرآبادی بڑی بی تھیں۔وہ بے چاری پچھلے سال حج کرنے گئیں،تو وہیں انتقال ہو گیا،،،،، اچھا رضیہ بانو نے پہلو بدل کر بات جاری رکھی۔

میں اب آپ کو یہ بتانا چاہتی ہوں بوا کہ یہ بمبئی شہر میدان حشر ہے۔طرح طرح کی باتیں،طرح طرح کے لوگ،آپ کسی بات پر کان نہ دھریئے۔بس اپنے کام سے کام رکھیئے۔ کچن کی نگرانی کرلیجیے۔ باقی وقت اپنے نماز روزے میں گزاریئے۔

اب آپ کے لئے محنت کا نہیں آرام کا وقت ہے۔

قران شریف پڑھیئے۔میرے حق میں دعائے خیر کرتی رہا کیجیئے۔ باقی یہ کہ لڑکیوں،،،،،میری بھانجیوں کے لئے دوسری آیا موجود ہے۔ابراہیم خانساماں کا نام ہے، بش سنگھ گورکھا ہے۔ مادھو میرا ڈرائیور ہے۔لیکن بلا کسی ضروت کے

جھگڑوں قضیوں میں نہ پڑیے۔

میں خود چھمی بیگم نے کہنا چاہا۔لیکن بانو نے ان کی بات کاٹ دی۔

میری اللہ کے فضل سے بہت بڑی بزنس ہے'' کچھ توقف کے بعد اضافہ کیا۔

ایکسپورٹ،امپورٹ جانتی ہیں،ایکسپورٹ،امپورٹ؟''

جی ہاں چھمی بیگم نے سر ہلایا۔صبیح الدین صاحب محکمہ تجارت کے افسر تھے،اور اس طرح کے الفاظ ان کے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔رضیہ بانو چھمی بیگم کو بہت سمجھدار اور نیک دل بی بی معلوم ہوئیں۔اور خدا پرست بھی۔چھمی بیگم نے ان کا باریک نائٹ گون اور سگریٹ نوشی معاف کر دی۔

میں عورت تن تنہا اتنا بڑا کاروبار چلا رہی ہوں۔اس کی وجہ سے دس طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔بھانجیاں بھی آج کل کی لڑکیاں ہیں۔ان کے دوست احباب بھی آتے رہتے ہیں۔پھر میری بزنس کی وجہ سے دو مرتبہ پولیس ریڈ کر چکی ہے۔

پولیس؟چھمی بیگم نے ذرا دہل کر دہرایا۔

رضیہ بانو ہنس پڑیں،ڈریئے نہیں یہاں بڑے بڑے تاجروں کو پولیس اور انکم ٹیکس والے پریشان کرتے ہیں۔میں اکیلی عورت دسیوں دشمن پیدا ہو گئے۔کسی نے پولیس کو جا کر خبر کر دی،بس دوڑی آ گئی،اسی وجہ سے میں نے باہر لوہے کا دروازہ لگوالیا ہے۔تو آپ سے کہنا یہ ہے کہ جب باہر کی گھنٹی بجے،تو آپ پہلے سوراخ میں سے دیکھ کر اطمینان کر لیجیے۔کبھی،کبھی پولیس والے سادہ کپڑوں میں بھی آجاتے ہیں۔

چھمی بیگم سفر کی تکان اور چائے کی طلب میں نڈھال ہوئی جا رہی تھیں۔اٹھ کھڑی ہوئیں اور بولیں۔''بی بی گیس کا چولھا کیسے جلتا ہے،؟

رضیہ بانو نے سرہانے ایک برقی بٹن دبایا۔ایک منٹ میں ابراہیم باورچی

دروازے میں نمودار ہو گیا۔

''ابراہیم یہ ہماری نئی بوا ہیں۔ان کے لئے چائے تو بنادو جھٹ پٹ۔''

چھمی بیگم جلدی سے اٹھ کر ابراہیم کے پیچھے کچن کی طرف روانہ ہوگئیں۔

ظہر عصر ،مغرب ساری نمازیں پڑھ کر وہ پھر بالکونی میں جا کھڑی ہوئیں۔گھر میں کرنے کے لئے کچھ کام ہی نہ تھا۔رضیہ بانو بن سنور کر باہر جا چکی تھیں۔''دو بھانجیوں''کے کمروں میں روشنی جل رہی تھی۔تیسری بھانجی غائب تھی''

تینوں چاروں ملازم بھی فلیٹ میں نہ تھے۔اس لئے گھنٹی بجی تو بجتی ہی چلی گئی۔ چھمی بیگم نئی دلی کی عادت کے مطابق فوردروازہ کھولنے کے لئے ڈرائینگ روم کی طرف لپکیں،اورجلدی سے اندروالا دروازہ کھول دیا۔باہر کا آہنی دروازہ اس وقت پہلے سے ایک طرف کو سرکا ہوا تھا۔

اورجس طرح صبیح الدین صاحب اورراشد صاحب کی کوٹھیوں میں ڈرائینگ روم کی دہلیز پر آکر مہمانوں سے بہت اخلاق سے کہتیں تھیں ''تشریف لائیے۔''

دوفربہ مارواڑیاورایک معطرامیر زادہ اندرداخل ہوا۔امیر زادہ سیدھا بار کی طرف چلا گیا۔فربہ مارواڑی دھم سے ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔صبیح الدین صاحب کے ہاں بھی اکثر اس وضع قطع کے کاروباری اپنی غرض سے آیا کرتے تھے۔معطر نوجوان کودیکھ کر البتہ ذراتعجب ہوا،پھر سوچا

اس شہر کا یہی دستور ہوگا۔ابھی وہ یہی طے کررہی تھی کہ معزز مہمانوں سے چائے ک ےلیے پوچھیں یا کافی کے لئے،کہ سونے کے بٹنوں اورہیرے کی انگوٹھیوں والے فربہ تر مارواڑی نے ڈٹ کر پوچھا،میڈم کدھر ہے؟

چھمی بیگم بخوبی جانتی تھیں،کہ بیگم کوانگریزی میں میڈم کہتے ہیں۔

سلیقے سے جواب دیا۔میڈم باہر گئی ہیں۔

''سالا چھوکری لوگ کدھر گیا۔؟

چھمی بیگم کو غصہ آ گیا، یہ صحیح ہے کہ اہل بمبئی تمیز دار اور اہل خاندان نہیں، لیکن یہ گالی گلوچ کیا معنی؟ انہوں نے ہونٹ پچکا کر پوچھا۔ ''بیگم صاحب کی بھانجیاں؟

اتنے میں دروازہ کھلا اور رضیہ بانو سرعت سے خود اندر آ گئیں۔ چھمی بیگم سے کہا بوا تم اپنی کوٹھری میں بیٹھو، آرام کرو۔

جی اچھا، انہوں نے جواب دیا۔ ان کی گیلری میں سے گزر جانے کے بعد ایک بھانجی کے کمرے سے ایک صاحب نکل کر باہر چلے گئے۔

چھمی بیگم نے اپنی کوٹھری میں جا کر بستر اکھولا۔ جائے نماز نکالی، وضو کیا۔ نقلیں پڑھنے لگیں۔ اور اس رب ذوالجلال کا شکر ادا کیا، جسے اپنے بندوں پر صرف دو وخت ہنسی آتی ہے۔ اور اسی پاک پروردگار نے ان کے باپ دادا کی لاج، ان کے حسب ونسب کی عزت رکھ لی، اور ایک بار پھر ایک شریف گھرانے کی حق حلال کی کمائی میں ان کا حصہ بھی لگا دیا۔''

جینی

افسانہ نگار : شفیق الرحمٰن

ہوائی جہاز پر سوار ہوتے وقت مجھے کچھ شبہ ہوا۔ نیلے لباس والی لڑکی سے پوچھا تو اس نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ جب ہم جہاز سے اترے تو مجھے یقین ہوگیا، اور میں نے پائپ پیتے آکسفورڈ لہجے میں انگریزی بولتے ہوئے پائیلٹ کو دبوچ لیا۔ ہم مدتوں کے بعد ملے تھے۔ کالج میں دیر تک اکٹھے رہے۔ کچھ عرصہ تک خط و کتابت بھی رہی، پھر ایک دوسرے کے لئے معدوم ہوگئے۔

اتنے دنوں کے بعد اور اتنی دور اچانک ملاقات بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی، طے ہوا کہ یہ شام کسی اچھی جگہ گزاری جائے، اور بیتے دنوں کی یاد میں جشن منایا جائے۔ میں نے اپنا سفر ایک روز کے لئے ملتوی کر دیا۔

جب باتیں ہو رہی تھیں، تو میں نے دیکھا، کہ وہ کافی حد تک بدل چکا ہے۔ مٹاپے نے اس کے تیکھے خدوخال کو مبہم بنا دیا تھا، اس کی آنکھوں کا وہ تحسین نگاہوں کی وہ بے چینی، وہ ذہین گفتگو سب مفقود ہو چکے تھے۔ وہ عامیانہ سی گفتگو کر رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ اپنی زندگی اور ماحول سے اس قدر مطمئن ہے، کہ اس نے سوچنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ دیر تک ہم پرانی باتیں دہراتے رہے۔

سہ پہر کو وہ مجھے ایک اینگلو انڈین لڑکی کے ہاں لے گیا، جسے وہ شام کو مدعو کرنا چاہتا تھا، لڑکی نے بتایا کہ شام کا وقت وہ گرجے کے لئے وقف کر چکی ہے۔ ہم ایک اور لڑکی کے ہاں گئے۔ اس نے بھی معذرت چاہی، کیونکہ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر تیسری کے گھر پہنچے، اگرچہ دوسرے کمرے سے خوشبوئیں بھی آ رہی تھیں۔ اور کبھی

کبھار آہٹ بھی سنا

ی دے جاتی تھی۔ لیکن دروازہ نہیں کھلا۔ وہ ایک اور شناسا لڑکی کے ہاں جانا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے منع کر دیا تھا کہ کوئی ضرورت نہیں، اور پھر اگر کوئی اور ساتھ ہوا تو اچھی طرح باتیں نہ کر سکیں گے۔ واپس آ کر اس نے ٹیلی فون پر کوشش کی، تیسری لڑکی گھر پہنچ چکی تھی، لیکنشام کو اس کی امی اسے نانی جان کے ہاں لے جا رہی تھیں۔

شام ہوئی تو ہم وہاں کے سب سے بڑے ہوٹل میں گئے۔ رقص کا پروگرام بھی تھا۔ اس نے پینا شروع کر دی۔ میرے لئے بھی انڈیلی، اور اصرار کرنے لگا۔ یہ اس کی پرانی عادت تھی۔

میں نے گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے چھوا، کچھ دیر گلاس سے کھیلتا رہا۔ پھر ٹہلتا، ٹہلتا دریچے تک گیا، ایک بڑے گملے میں انڈیل کر واپس آ گیا۔ اس نے دوسری مرتبہ انڈیلی، مجھے بھی دی، میں پھر اٹھا، اور اپنا حصہ کھڑکی سے باہر پھینک آیا۔

وہ اپنی روزانہ زندگی کی باتیں سنا رہا تھا۔ کمپنی کی لڑکیوں کے متعلق جو نہایت طوطا چشم تھیں، شراب کے متعلق جو دن بدن مہنگی ہوتی جا رہی تھی۔ اپنے معاشقوں کے متعلق، جو اسے بے حد پریشان رکھتے تھے۔ اس کی بیوی بھی اسی شہر میں رہتی تھی۔ لیکن وہ اس سے مہینوں نہ ملتا، جب کبھی گھر جاتا تو وہ اتنے سوال پوچھتی کہ وہ عاجز آ جاتا۔ اتنا نہیں سمجھتی، کہ ایک ہواباز کی زندگی کس قدر خطرناک زندگی ہے۔ اگرچہ یہ زندگی اس نے خود منتخب کی تھی۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں، کہ دفعتاً ہم نے اس لڑکی کو رقص گاہ میں دیکھا، جسے اس وقت گرجے میں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ آئی تھی، اس کے بعد وہ لڑکی آ گئی، جس کی طبیعت ناساز تھی۔ پھر معلوم ہوا، کہ تیسری لڑکی بھی ہمارے سامنے رقص کر رہی ہے۔ اپنی امی یا نانی جان کے ساتھ نہیں، ایک دوسرے ہواباز کے ساتھ۔

وہ اپنی قسمت کو کوسنے لگا۔ نہ جانے یہ لڑکیاں ہمیشہ اسی کو کیوں دھوکا دیتی ہیں۔ ہمیشہ ٹرخا دیتی ہیں۔ آج تک کسی لڑکی نے اسے دل سے نہیں چاہا، یہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔

وہ گلاس پر گلاس خالی کیے جا رہا تھا۔ میرے حصے کی ساری شراب گملوں اور پودوں کو سیراب کر رہی تھی۔ اسے حیرت تھی، کہ مجھ جیسا لڑکا جو کالج کو دنوں میں سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا۔ اب ایسا شرابی ہو گیا کہ اتنی پی چکنے کے بعد بھی ہوش میں ہے۔ اس کے خیال میں ایسے شخص کو پلانا قیمتی شراب کا ستیاناس کرنا تھا۔

پھر ان اجنبی چہروں میں ایک جانا پہچانا مانوس چہرہ دکھائی دیا۔ یہ جینی تھی، جو رقص کا لباس پہنے ایک ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ ابھی، ابھی آئی تھی، ہم دونوں اٹھے، ہمیں دیکھ کر جینی کا مسکراتا ہوا چہرہ کھل اٹھا، وہ بڑے تپاک سے ملی، تعارف ہوا،،،، ،، میرے خاوند سے ملیئے ،،،،، اور یہ دونوں میرے پرانے دوست ہیں۔

میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کے خاوند کو مبارک

باددی،، اور کہا کہ وہ دنیا کا سب سے خوش قسمت انسان ہے۔

میں نے اسے غور سے دیکھا، وہ چالیس سے اوپر کا ہو گا۔ اچھا خاصا سیاہ رنگ، دھندلی تھکی، تھکی آنکھیں، بے حد معمولی شکل پستہ قد، اگر وہ جینی کا خاوند نہ ہوتا، تو شاید ہم اس کی شکل دوسری مرتبہ نہ دیکھتے۔ لیکن جینی کی مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کے سوا اور کسی کی طرف دیکھتی ہی نہ تھیں۔ وہ اس کی تعریفیں کر رہی تھی، کہ وہ قریب کی بندرگاہ کا سب سے بڑا بیرسٹر ہے۔ اس علاقے میں سب سے مشہور شخص ہے۔ میں نے جینی کو رقص کے لئے کہا، میں نے محسوس کیا کہ وہ بے حد مسرور ہے۔ اس قدر مسرور شاید میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اس کے چہرے کی چمک دمک ویسی ہی ہے۔ اس کے ہونٹوں کی وہ دل آویز اور مخمور مسکراہٹ جوں کی توں ہے۔ وہ مسکراہٹ جو اس قدر مشہور تھی۔ جسے مونا لیزا کی مسکراہٹ سے تشبیہ دی جاتی تھی،،

،،نہایت پر اسرار اور نا قابل فہم مسکراہٹ ۔جس کی گہرائیوں کا کسی کو علم نہ ہو سکا جو ہمیشہ راز ہی رہی ۔

اور یہی مسکراہٹ میں نے سال ہا سال سے دیکھی تھی ۔اس مسکراہٹ سے میں مدتوں شنا سا رہا۔جینی کے خاوند کے دوست آ گئے اور مقامی باتیں ہونے لگیں۔کچھ دیر بعد میں اور میرا دوست اٹھ کر واپس اپنی جگہ چلے آئے ، جہاں بوتل اس کی منتظر تھی۔

میں نے اس سے جینی کے متعلق باتیں کرنا چاہیئے ۔لیکن اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔وہ ان تین لڑکیوں کے لئے اداس تھا، جو اسے دھوکا دے کر دوسروں کے ساتھ چلی آئی تھیں۔آج یہ پہلی مرتبہ نہیں ہوا۔پہلے بھی کئی مرتبہ ہو چکا تھا۔اور لڑکیاں اجنبی نہیں تھیں۔پرانی دوست تھیں، اور اس کے ساتھ باہر جا چکی تھیں، اس سے بیش قیمت تحائف لے چکی تھیں۔در اصل اب ایسی ٹھوکریں اسے ہر جگہ سے لگ رہی تھیں۔ایس ، برج ، سٹاوہ ہر جگہ ہار رہا تھا۔ایک ادنیٰ فلم کمپنی کی ایکسٹرا لڑکی ، جس کے لئے اس نے سمندر کے کنارے مکان لیا، اسے چھوڑ کر کسی بوڑھے سیٹھ کے ساتھ چلی گئی۔اور میں دزدیدہ نگاہوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا، جہاں جینی تھی، وفورِ مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔اس کی آنکھیں روشن تھیں۔وہی آنکھیں جو کبھی غمگین اور نم ناک رہا کرتی تھیں ۔اب مسرور تھیں۔رخسار جن پر مدتوں آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ کر بکھرتی رہیں۔اب تاباں تھے۔وہ کھلی ہوئی مسکراہٹ شاہد تھی کہ دل سے اس شدید الم کا احساس جا چکا ہے۔ج و جینی کی قسمت بن چکا تھا۔اس خوشی میں اب غم کی رمق تک نہیں دکھائی دیتی تھی۔

لیکن اتنی زائد مسرت کیسی تھی؟ یہ انبساط کیسا تھا؟۔اور اس پر اسرار مسکراہٹ کے پیچھے کیا تھا؟

میں صرف اس کے چہرے کو دیکھ سکتا تھا۔اس کی روح بہت دور تھی، وہاں تک

میری نگاہیں نہیں پہنچ سکتی تھیں ۔ کیا وہاں کوئی عظیم طوفان بپا تھا؟ ۔اذیت کن، کرب ناک، شدید طلاطم ۔یا جلتے ہوئے شعلوں کی تپش نے بہت کچھ بھسم کر دیا تھا۔ یا وہاں سب کچھ یخ ہو چکا تھا۔ برف کے تودوں کے سوا کچھ بھی نہ رہا تھا۔ اس کا جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا۔

وہ لگاتار اپنے خاوند کے ساتھ رقص کرتی رہی ۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کئی مرتبہ وہ بالکل میرے قریب سے گزرے ۔ اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرائی، پھر جیسے وہ مسکراہٹ پھیلتی گئی ۔ اس نے ماضی اور حال کی حدوں کو محیط کر لیا۔ وہ سب تصویریں سامنے آنے لگیں جو ذہن کے تاریک گوشوں میں مدفون تھیں ۔

میں نے برسوں پہلے آپ کو یونیورسٹی کے مباحثے میں دیکھا تھا۔ میرے ساتھ میرا پرانا رفیق اور ہم جماعت جی بی تھا۔ وہ ان دنوں بہترین مقرر تھا۔ سٹیج پر ہمیشہ فاتح کی طرح جاتا اور فاتح کی طرح لوٹتا تھا۔ اس کی تقریر ختم ہوئی تو ایک لڑکی سٹیج پر آئی، گھنگھریالے بال، جھکی ہوئی آنکھیں، لبوں پر محجوب مسکراہٹ، ملا جلا انگریزی اور ہندوستانی لباس پہنے ۔

ہال میں سرگوشیاں ہونے لگیں، ہمیں بتایا گیا کہ یہ نئی نئی کہیں سے آئی ہے ۔ اس کا نام کچھ اور ہے لیکن اسے لیلیٰ کہتے ہیں ۔ شاید اسکی ملیح رنگت اور گھنگھریالی اور پریشان زلفوں کی وجہ سے ۔

کچھ دیر وہ شرماتی رہی اور بول نہ سکی ۔ پھر ذرا سنبھل کر اس نے جی بی کی تقریر کی مخالفت شروع کی، ایسے، ایسے نکتے لائی کہ سب حیران رہ گئے ۔ جی بی کی تقریر بالکل بے معنی معلوم ہونے لگی ۔

جب وہ سٹیج سے اتری تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں، پھر معلوم ہوا کہ پہلا انعام جی بی اور اس لڑکی میں تقسیم کیا جائے گا ۔ لیکن جی بی نے ججوں سے درخواست کی، کہ

انعام کی وہی حقدار ہے۔ اور اسی کو ملنا چاہیئے۔ جی بی کے رویے کو سراہا گیا۔ ہجوم میں ہیجان پھیل گیا۔ مدتوں کے بعد ایک لڑکی انعام جیت رہی تھی۔ وہ بھی ایسی لڑکی جو بالکل نو وارد تھی۔ جب لیلیٰ سٹیج پر چاندی کا بڑا سا وزنی کپ لینے آئی تو اس کی پریشان زلفیں اور پریشان ہو گئیں، نگاہیں اور جھک گئیں۔ جب اس سے اتنا بڑا کپ نہ سنبھالا گیا تو جی بی نے لپک کر چوبی حصہ خود اٹھا لیا۔ لیلیٰ نے جھکی ہوئی نگاہوں سے جی بی کو ایک مرتبہ دیکھا۔

اس بھولی بھالی الھڑ لڑکی سے ہمارا تعارف یوں ہوا۔ اس کے بعد ملاقاتوں کا تانتا بندھ گیا۔ جی بی کالج کا ہیرو تھا۔ لڑکوں اور استادوں میں ہر دل عزیز، کالج میں سب سے ذہین، چست، ہنس مکھ، اور خوش پوشاک۔ بڑے امیر والدین کا اکلوتا بیٹا۔ اس کی کار پروفیسروں کی کار سے بھی بڑھیا تھی۔ جہاں ادبی تقریب ہوتی مجھے اور جی بی کو مدعو کیا جاتا۔ ہمارے کہنے پر لیلیٰ کو بھی بلایا جاتا،،،،،، لیلیٰ کے خدوخال حسین نہیں تھے۔

اگر اسے نقادانہ طور سے دیکھا جاتا تو وہ حسین ہرگز نہ تھی۔۔۔۔۔ لیکن اگر حسین خدوخال کے بغیر بھی کوئی خوبصورت ہوسکتا ہے، تو وہ لیلیٰ تھی۔ اس کی لہراتی ہوئی زلفیں، جھکی ہوئی شرمیلی آنکھیں، مسکراتے ہوئے ننھے منے ہونٹ، ملیح، چمپئی رنگت، اور نہایت معصوم باتیں،،،،،، سب مل کر نرالی جاذبیت پیدا کر دیتے۔ بعض اوقات تو وہ بہت پیاری معلوم ہوتی۔

وہ ہوسٹل میں رہتی تھی سب سے الگ تھلگ۔ کبھی ہم نے اسے کسی کے ساتھ نہیں دیکھا۔ اس کے والدین کے متعلق طرح طرح کی افواہیں سننے میں آتیں۔ ان کے خاندان میں انگریزی اور پرتگالی خون کی آمیزش تھی۔ اس کی والدہ جنوبی ہندوستان کی تھی۔ اس لئے نہ اس کا کوئی خاص مذہب تھا، نہ کوئی نسل، لیلیٰ کا نام بھی عجیب سا تھا۔ اس کا لباس بھی ملا جلا ہوتا۔ وہ اپنے والدین کے ذکر سے احتراز کر

تی۔ یہ مشہور تھا کہ ان کی خانگی زندگی نہایت ناخوشگوار ہے۔ وہ ہمیشہ جدا رہتے ہیں، ایک دفعہ ان کا تنازعہ عدالت تک پہنچ چکا ہے۔

پھر کسی نے یونہی کہہ دیا کہ لیلیٰ جی بی کی طرف دیکھتی رہتی ہے، یہ افواہ بنی اور پھر عام ہوگئی۔ ہر جگہ اس نئے معاشقے پر تبصرے ہونے لگے۔ سب نے دیکھا کہ لیلیٰ کے دل کا راز عیاں ہو چکا ہے۔ وہ جی بی کو چاہتی ہے۔ طرح طرح کے بہانوں سے وہ اسے ملتی۔ جانے پہچانے راستوں سے ایسے گزرتی کہ جی بی اسے نظر آجاتا۔ جی بی کو دیکھ کر اسے دنیا جہاں کی نعمتیں مل جاتیں۔ یہ نوزائیدہ محبت اس کی زندگی میں طرح طرح کی تبدیلیاں لے آئی۔ وہ مسرور رہنے لگی۔ ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لینے لگی۔ اس کا اجنبی لہجہ درست ہوتا گیا۔ اس کی گفتگو میں مٹھاس آگئی۔

لیکن جی بی کچھ اتنا متاثر نہیں ہوا۔ اس کے لیئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کتنی ہی مرتبہ اسے محبت خراج کے طور پر ملی تھی۔ وہ لیلیٰ سے ملتا، اسے ملنے کے موقع دیتا، خوب باتیں کرتا، شوخ اور چنچل قسم کی گفتگو، جس کا وہ عادی تھا۔

چاندنی رات میں دور ایک باغ میں تقریب ہوئی۔ لڑکیوں کے ساتھ لیلیٰ بھی آئی۔ جی بی ہمارے ساتھ نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ایک انگریز لڑکی کو لے کر آئے گا۔ جس کا شہر بھر میں چرچا تھا۔ جو نوجوانوں کی گفتگو کا محبوب ترین موضوع تھی۔ یہ اس کی نئی محبوبہ تھی۔

جی بی دیر میں آیا۔ کار سے وہ اکیلا اترا۔ وہ لڑکی اس کے ساتھ نہیں تھی، وہ مایوس اور کھویا سا تھا۔ اور فوراً واپس جانا چاہتا تھا۔ لیکن اسے اجازت نہ ملی۔ وہ تو ایسی محفلوں کی جان تھا۔ جب وہ اپنا سانیٹ سنا رہا تھا۔ تو لیلیٰ اسے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، جیسے آئینہ میں خود اپنا عکس دیکھ رہی ہو۔ جیسے خود اپنی روح کو کسی اور روپ میں دیکھ رہی ہو۔ جی بی نے خلاف توقع غم آمیز اشعار سنائے۔ جن میں شکوے تھے، التجائیں تھی۔ وہ اشعار کسی خاص ہستی کے لئے تھے جو وہاں نہیں تھی۔

لیلیٰ نے کئی مرتبہ اس سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن وہ بدستور خاموش رہا۔ میں نے اسے ٹوکا، ایک طرف لے جا کر ڈانٹا بھی۔ لیکن جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ ہم دونوں اکیلے کھڑے تھے کہ لیلیٰ آ گئی۔ جی بی کچھ دیر اس کی طرف یونہی دیکھتا رہا۔ پھر اس کا ہاتھ پکڑا اور ایک اونچے سرو کے پیچھے لے گیا۔ وہ مبہوت بنی، چپ چاپ چلی گئی۔ جی بی نے اسے بازوؤں میں لے کر چوم لیا۔ پہلے بوسے پر وہ کانپ اٹھی۔ ان جانی لذت سے مغلوب ہو کر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر جی بی کے سینے سے لگا دیا۔ وہ اسے پھیکے ہونٹوں سے چومتا رہا۔ ایسے الفاظ اس کے ہونٹوں سے نکلتے رہے جو لیلیٰ کے لئے نہیں، کسی اور کے لئے تھے۔ اس کے بازوؤں میں لیلیٰ نہیں کوئی اور بے وفا حسینہ تھی۔ جس کے لئے وہ بے تاب تھا۔

لیلیٰ شدت احساس سے آنکھیں بند کیے خاموش کھڑی رہی۔ وہ جی بی اور اس کے بوسوں کی دنیا سے دور نکل گئی تھی۔ وہ شعر و نغمے کی وادیوں میں جا پہنچی۔ جہاں اس کے سہمے ہوئے خوابوں کی دنیا آباد تھی۔ جہاں فضاؤں میں اس کی معصوم امنگیں تحلیل ہو چکی تھیں۔ جہاں کیف و خمار چھائے ہوئے تھے۔ جہاں صرف رعنائیاں تھیں اور محبت پاشیاں!

اس کے بعد لیلیٰ کی نئی زندگی شروع ہوئی۔ اس کی دنیا میں ہر چیز پر نیا نکھار آ گیا۔ جو پہلے محض تخیل تھا، وہ تخلیق ہو گیا، غنچے چٹکے، خوش الحان طیور چہچہانے لگے۔ رنگ برنگے پھولوں کی خوشبوؤں نے ہوائیں بوجھل کر دیں۔ زمین سے آسمان تک قوس و قزح کے رنگ مچلنے لگے، ہر شے کا خوابیدہ حسن جاگ اٹھا۔ اس کے بعد نہ دنیا رہی اور نہ زندگی، محض خواب تخیل اور حقیقت کی حدوں پر چھا گیا۔

بہت دیر کے بعد لیلیٰ اس خواب سے چونکی۔ دفعتاً اس پر اس بھیانک حقیقت کا انکشاف ہوا، کہ وہ جی بی کے لئے محض ایک کھلونا تھی۔ جی بی کو اس سے محبت نہ تھی۔ اور وہ جی بی کے لئے ان متعدد لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ جو اس کا تعاقب کر

تی تھیں۔بغیر کسی صلے کے اسے چاہتی تھی۔

جب بات بہت مشہور ہو گئی، تو جی بی کترانے لگا۔ اس نے تقریبوں میں آنا بند کر دیا۔لیلیٰ کو دیکھ کر کار تیز کر دیتا، اس کی طرف سے منہ پھیر لیتا۔

اپنی پہلی محبت کی شکست پر لیلیٰ کو یقین نہ آیا۔اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔اس صدمے کو اس نے اپنی روح کی گہرائیوں میں چھپا لیا۔لیکن اس کی محبت جوں کی توں رہی۔ وہ اس سے ملنے کے بہانے تلاش کرتی اسے خط لکھتی، تحائف بھیجتی۔

وہ دوسرے کالج میں تھی۔ پھر بھی کسی نہ کسی طرح جی بی کو ہر روز دیکھ لیتی۔

ایک روز سب نے لیلیٰ کے خطوط کو نوٹس بورڈ پر دیکھا۔ یہ وہ محبت بھرے خطوط تھے جو اس نے جی بی کو لکھے بہت سے لڑکے یہ خطوط دیکھنے گئے میں بھی گیا سب نے مزے لے لے کر خطوط کو پڑھا دلچسپ فقرے نقل کیے۔ خوب ہنسے بھی۔

بعد میں جب مجھے کچھ خیال آیا تو میں نے جی بی کو برا بھلا کہا، اسے یہ حرکت ہرگز نہیں کرنی چاہئے تھی۔ وہ کہنے لگا کہ لیلیٰ نے اسے اس قدر بدنام کر دیا ہے۔ کہ اب وہ اس کے نام سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس سے ملتا ضرور رہا ہے لیکن کسے علم تھا کہ معمولی سا مذاق ایسی شکل اختیار کر لے گا، اور وہ مفت میں بدنام ہو جائے گا۔محض لیلیٰ کی وجہ سے بقیہ لڑکیاں اس سے دور دور رہنے لگی ہیں۔

جی بی میرا گہرا دوست تھا، ہم دونوں ہم عمر تھے۔ہمارے خیالات یکساں تھے، میں خاموش ہو گیا۔دیر تک خطوط کا چرچا رہا، لیلیٰ کئی دن کالج نہیں آئی، تنہا گوشوں میں بیٹھ کر رویا کرتی۔اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔۔۔۔جو کچھ اسے کہا گیا اس نے خاموشی سے برداشت کیا۔

جی بی نے لیلیٰ کی سہیلیوں کی منتیں کیں، کہ اسے سمجھائیں، کسی طرح اسے دور رکھیں۔اس نے ان راستوں سے گزرنا چھوڑ دیا جہاں لیلیٰ کے نظر آنے کا احتمال

ہوتا۔ اپنے کمرے کی وہ کھڑکیاں مقفل کر دیں، جو سڑک کی طرف کھلتی تھیں، جن کی طرف لیلیٰ گزرتے ہوئے دیکھ لیا کرتی تھی۔

ایک دن مجھے ترس آ گیا میں جی بی سے خوب لڑا، جہاں ہم اتنی لڑکیوں سے ملتے رہتے ہیں وہاں لیلیٰ سے ملنے میں کیا ہرج؟ وہ بولا۔۔۔۔۔تمہیں معصومیت اور سادگی پسند ہے۔ مجھے نہیں۔ مجھے ناپختہ اور الھڑ لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر آنسو نکل آتے ہیں۔ خوش ہوئیں تو رونے لگیں، غمگین ہوئیں تو آنسو بہانے لگیں۔ دنیا کی کسی چیز کا بھی انہیں علم نہیں ہر چیز خود بتانی پڑتی ہے۔ اور میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ مجھے تجربہ کار اور کھیلی ہوئی لڑکیاں زیادہ پسند ہیں۔

جی بی کے اس رویے کا یہ اثر ہوا کہ لیلیٰ اس سے ڈرنے لگی۔ وہ اسے دور دور سے دیکھتی کہیں سامنا ہو جاتا تو وہ کترا کر نکل جاتی۔ دوسروں سے جی بی کے متعلق پوچھتی رہی۔ کئی مرتبہ خود میں نے اسے جی بی کے بارے میں باتیں بتائیں۔ اس کی تصویریں بھی دیں، جس پر وہ مجھ سے خفا ہو گیا۔

پھر جی بی کو کچھ عرصے کے لئے اپنی تعلیم چھوڑ دینی پڑی، اس کے کچھ رشتے دار دوسرے ملک میں بہت بڑے تجار تھے۔ اس سلسلے میں جی بی کے والد اسے باہر بھیجنا چاہتے تھے۔ اور ان کے لئے تعلیم اتنی اہم نہ تھی۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہوا، ایک شام کو ہم اداس بیٹھے تھے، کہ میں نے اسے لیلیٰ سے آخری بار ملنے کو کہا۔ اس نے انکار کر دیا۔ جب میں نے پرانی دوستی کا واسطہ دیا تو وہ راضی ہو گیا۔ میں نے لیلیٰ کو بتایا تو اسے یقین نہ آیا، اس نے آنسو خشک کیے اپنا بہترین لباس پہنا۔ سہیلیوں سے مانگ کر زیور پہنے، ان کے مشورے سے سنگھار کیا۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ اور دل میں آرزوئیں لیے اپنے محبوب سے ملنے گئی۔ اس رات جی بی پیے ہوئے تھا۔ تا کہ وہ لیلیٰ سے پیار بھری باتیں کر سکے۔

اس نے لیلیٰ سے بہت سی باتیں کیں، اسے ہمیشہ مسرور رہنے کو کہا۔ جلد لوٹ

آنے کے وعدے کیے۔لیلیٰ کا ایک بار پھر فردوس گم شدہ کی جھلک دکھائی دی، جسے محبت کے پہلے بوسے نے تخلیق کیا تھا۔لیلیٰ نے اقرار کیا کہ وہ ہمیشہ خوش رہے گی۔ اوراس کا انتظار کرے گی۔اوراگراس کی وجہ سے جی بی کو کوئی تکلیف پہنچی ہے تو وہ سزا کی طلب گار ہے۔اگر جی بی حکم دے تو وہ کہیں دور چلی جائے۔اگر وہ چاہے تو لیلیٰ مرجائے،جدا ہوتے وقت اس نے اپنا رومال جی بی کو نشانی کے طور پر دیا، یہ رومال جی بی نے مجھے دے دیا، کہنے لگا شاید تمہارے پاس محفوظ رہے۔ورنہ میں تو اسے کہیں ادھر ادھر پھینک دوں گا۔رومال سے بھینی بھینی خوشبو آرہی تھی۔ایک کونے میں سرخ دھاگے سے ننھا سا دل بنا ہوا تھا۔جسے لیلیٰ نے خود کاڑھا تھا۔

جی بی کے چلے جانے پر لیلیٰ ذرا بھی غمگین نہ ہوئی۔اس کے وعدوں کو دل سے لگائے انتظار کرتی رہی۔یہ انتظار طویل ہوتا گیا۔پتے زرد ہو کر گر پڑے۔پھول مرجھا گئے۔ٹہنیاں لنج منج رہ گئیں،خزاں آگئی۔وہ نہ آیا۔جھکڑ چلے،سوکھے پتے اڑنے لگے۔گردوغبار نے آسمان پر چھا کر چاندنی اداس کر دی۔تاروں کو بے نور کر دیا۔وحشتیں پھیل گئیں۔۔۔۔۔وہ نہ آیا۔

کونپلیں پھوٹیں، ہریالی پیلی پیلی سرسوں پھولی، رنگین تتلیاں اڑنے لگیں، غنچے مسکرانے لگے، پرندوں کے نغموں سے ویرانے گونج اٹھے، غنچے مسکرانے لگے، بہار آ گئی لیکن وہ نہ آیا۔

دن لمبے ہوتے گئے، لمبی، لمبی جھڑیاں لگیں۔سفید بگلوں کی قطاریں سیاہ گھٹاؤں کو چیرتی ہوئی گزر گئیں۔نیلے بادل آئے اور برس کر چلے گئے۔جھیلوں کے کنارے قوس قزح سے رنگین ہو گئے۔۔۔۔لیکن وہ پھر بھی نہ آیا۔

بہت دنوں تک لیلیٰ کھوئی سی رہی۔بہت دیر کے بعد وہ سب کچھ سمجھ سکی۔جب جی بی لوٹا تو وہ سنبھل چکی تھی۔جی بی اکیلا نہیں آیا، اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی تھی۔گوری چٹی فربہ عورت جو کسی لکھ پتی کی بیٹی تھی۔

جس کا گول مول چہرہ کسی قسم کے اظہار سے مبرا تھا۔ جس کے دل میں جذبات کے لئے جگہ نہ تھی۔ جو اس ٹھوس اور مادی دنیا میں پیدا ہوئی، اور اسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی۔

ایسے اونچے اور امیر گھرانے میں شادی ہو جانے پر سب نے جی بی کو مبارک باد دی۔ اس کی قسمت پر رشک کیا۔

میں لیلیٰ کو بھی جانتا تھا، اور جی بی کو بھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ دونوں رقص گاہ میں تھے۔ جی بی میرا پرانا دوست تھا۔ ج و میرے ساتھ بیٹھا تھا اور پی رہا تھا۔ اور یہ لیلیٰ وہ جینی تھی، جو میرے سامنے اپنے خاوند کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔

لیلیٰ کو بدستور چھیڑا جاتا۔ طعنے دیے جاتے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے۔ ایک روز ہم نے سنا کہ وہ کالج چھوڑ کر چلی گئی۔ کچھ دنوں تک اس کا انتظار کیا گیا، لیکن وہ واپس نہ آئی۔ آہستہ آہستہ اس کی باتیں بھولتی گئیں۔ کچھ عرصے بعد لیلیٰ کا ذکر ایک پرانی بات ہوگئی۔

ایک دن وہ کہیں سے آ کر کالج میں داخل ہوئی۔ اب وہ بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اب وہ شرماتی لجاتی سہمی ہوئی لیلیٰ نہ تھی۔ بلکہ شوخ و بے باک جینی تھی۔ یہ نیا نام اس نے خود اپنے عیسائی نام سے چنا تھا۔ وہ کالج کے قریب ہی ایک عیسائی کنبے میں رہتی۔ صبح صبح جب گردن اونچی کیے نگاہیں اٹھائے سائیکل پر آتی، تو لڑکے ٹھٹھک کر رہ جاتے۔ ہر وقت اس کے ہونٹوں پر بے باک مسکراہٹ ہوتی تھی۔

یونین کا جلسہ ہے تو جینی تقریر کر رہی ہے۔ ڈراما ہے تو وہ ضرور حصہ لے گی۔ مباحثہ ہے تو جینی اچھے اچھوں کی دھجیاں اڑا دے گی۔ اس کی دلیری اور صاف گوئی سے لوگ ڈرتے تھے۔

جینی کی نے باکی کو سراہا جانے لگا۔ اور سب اسے عزت کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

ڈے یونین کا صدر تھا۔ وہ دبلا پتلا سا بنگالی لڑکا تھا۔ اس میں صرف یہ خوبی تھی کہ وہ کئی سال سے یونین کا صدر تھا۔ میری اس کی جان پہچان تب سے ہوئی جب وہ ہوسٹل میں میرا پروسی بنا۔ اس کی شاعرانہ باتیں، اس کے انوکھے نظریے، اس کا حساس پن، وائلن پر غم ناک نغمے،،،،، یہ سب مجھے اچھے معلوم ہوئے۔ لیکن مجموعی طور پر بطور انسان کے میں نے اسے کبھی پسند نہیں کیا، ویسے اس میں کوئی نمایاں خوبی یا خامی نہ تھی، شاید یہ اس کا اجڑا سا حلیہ، اس کی آنکھوں کی مجرمانہ بناوٹ، اس کے چہرے کا فاقہ زدہ اظہار تھا، جو ہمیشہ مجھے اس سے دور رکھتا۔

کبھی کبھی اسے بھی شام کو ہمراہ لے جاتا۔ اس طرح اس کی جینی سے ملاقات ہوئی۔ غالباً ڈے کی سب سے بڑی خوبی اس کا انکسار تھا۔ اسے اپنی کمزوریوں کا ہمیشہ احساس رہتا، بعض اوقات وہ اس قدر کسر نفسی سے کام لیتا کہ اس پر ترس آنے لگتا۔ یوں معلوم ہوتا جیسے وہ رحم کا طالب ہے۔

شروع شروع میں شاید جینی کو اس کی یہی ادا بھا گئی۔

وہ جینی میں ضرورت سے زیادہ دل چسپی لینے لگا، پھر جیسے جینی بھی اس کی جانب ملتفت ہوتی گئی۔ جب وہ وائلن پر درد بھرے نغمے سناتا تو اس کی نگاہیں جینی پر جم جاتیں۔ نغمے کی پرواز نہایت مختصر ہوتی۔ ڈے کی انگلیوں سے لے کر جینی کے دل تک،،،،،

جب وہ دونوں فلسفے کی کتابیں ہاتھ میں لیے بحث میں مصروف ہوتے، تو اکثر بہک جاتے، آنکھوں آنکھوں میں کچھ اور گفتگو ہونے لگتی۔

ان دونوں کی دوستی اشاروں اور کتابوں کی حدود سے نکل کر کھلم کھلا ملاقاتوں تک پہنچ چکی تھی۔ جینی کو بنگالی موسیقی سے لگاؤ ہو چکا تھا۔ وہ بنگالی زبان سیکھ رہی تھی۔ جب وہ بالوں میں پھول لگا کر ساڑھی کو ایک خاص وضع سے پہن کر نکلتی، تو بالکل بنگالی لڑکی معلوم ہوتی۔

کالج کی کئی لڑکیاں اسے دیکھ، دیکھ کر بالوں میں پھول لگانے لگیں۔

ان دنوں ہم ڈرامہ کھیل رہے تھے، دوپہر سے ری ہرسل شروع ہو جاتی، شام بھی اکٹھے گزرتی، اکثر میں اسے گھر چھوڑنے جاتا، اس کے کمرے کی زیبائش خوب ہوتی۔ کسی روز تو یوں معلوم ہوتا، جیسے کمرہ نہیں جنگل ہے۔ دیواروں پر گہرے سبز وال پیپر تھے۔ جس پر درخت اور گھنی جھاڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ گل دانوں میں لمبی، لمبی گھاس اور بڑے بڑے پتے ہیں۔ سبز قمقمے روشن ہیں۔ فرش پر بچھے ہوئے قالینوں کے نقش ونگار، دیوار سے ٹنگی ہوئی تصویریں، سبزی مائل پردے، گملوں میں رکھے ہوئے پودے،،،، یوں معلوم ہوتا، جیسے درندوں کی یہ تصویریں ابھی متحرک ہو جائیں گی۔ پر کسی روز سب کچھ زرد ہوتا۔ دیواریں، پردے، غلاف، قالین، قمقموں کے شیڈ۔ گل دانوں میں صحرائی پھول اور خشک ٹہنیاں ہوتیں، انگیٹھی کے سامنے ریت کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے۔ خیالات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے۔ تصور میں لق دق صحرا ابھرنے لگتا۔ تاروں کی چھت تلے حدی خوانوں کا نغمہ گونجنے لگتا۔

پھر کسی روز برف باری کے نظارے سامنے آ جاتے۔ یہی آرائش کبھی طوفان زدہ سمندر کی یاد دلا دیتی۔ جھاگ اڑاتی ہوئی چھنگاڑتی لہریں، ہوا کے تند و تیز تھپیڑے، اور آندھیوں میں کانپتا ہوا سفینہ،،،،،،

اس کے گھر میں کبھی ایک جیسا گل دستہ میں نے کبھی دو مرتبہ نہیں دیکھا۔ گل دان میں بڑے بڑے پھول بھی ہیں۔ شوخ پھول بھی ہیں، لیکن صرف ننھی منی کلیاں نمایاں ہیں۔ باقی سب رنگ آپس میں گھل مل کر کھو گئے ہیں۔ کبھی غنچے، کلیاں، پھول سب کہیں جا چھپے ہیں۔ صرف خوش نما وضع کے پتے سامنے آ گئے ہیں۔ اس کے ترتیب دیئے گئے گل دستوں کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوتی۔ کہ ایسے حسین وجمیل پھول بھی آسمان تلے کھلتے ہیں۔ جنہیں گلشن میں ہوا پہچانتی تک نہیں۔

ایک پروفیسر کی تبدیلی پر باغ میں پارٹی ہوئی، طے ہوا کہ وہیں شام کو بارہ دری

میں ایک چھوٹا سا ڈرامہ بھی کھیلا جائے گا۔ جینی کو المیہ پارٹ ملا، وہ دن اس نے اکیلے گزارا، کسی سے بات نہیں کی۔ دن بھر اداس رہی۔ لیمپوں کی روشنی میں ڈرامہ شروع ہوا۔ جینی نے اپنا گانا بالکل آخر میں رکھا۔ لیمپ بجھا دیئے گئے۔ سب نے دیکھا درختوں کے جھنڈ سے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ وہ ایک بنگالی نظم گا رہی تھی۔ جس میں چودھویں کے چاند کو مخاطب کیا گیا تھا۔ ڈے وائلن بجا رہا تھا۔ وہ سادا سا گیت اور وائلن کا تھرتھراتا ہوا نغمہ، اس کی انگلیوں کی جنبش، جسم کے لوچ اور گھنگھرو کے تال پر چاند تارے ناچنے لگے۔ پھر جیسے مندروں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ دیو داسیاں سنگھار کیے کنول کے پھول تھامے آ گئیں۔ پجاریوں کے سر جھک گئے، فضاؤں میں تقدس برسنے لگا۔ چراغوں سے دھواں اٹھا، دھند بن کر چھا گیا۔ سب کچھ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صرف جینی رہ گئی، اور اس کا محبوب،،،،،، پجاری اور دیوتا۔

یہ غنائیہ باغ کی اس چاندنی رات میں ختم نہیں ہوا، ساز اور لے دیر تک ہم آہنگ رہے۔ ڈے نے ان پیار بھرے جذبات کا اظہار کر دیا۔ جنہیں وہ دیر سے چھپائے بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی بے پایاں محبت کا یقین دلایا، یہ بھی کہا کہ مرتے دم تک وہ جینی سے اسی شدت سے محبت کرتا رہے گا۔ اس نے اپنے والدین کو سب کچھ لکھ دیا ہے۔ عنقریب اس کی والدہ آئیں گی اور جینی سے ملیں گی۔ پھر وہ جینی کو رسم کے مطابق وہ سنہرا ہار دے گا۔ جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا ہو گا۔ ان دونوں کو ایک بہت بڑی قوت نے آپس میں ملا دیا ہے، آرٹ نے وہ دونوں آرٹسٹ ہیں۔ انسان فنا ہو جاتے ہیں رٹ فنا نہیں ہوتا، آرٹ جاوداں ہے۔

میں نے اس کے کمرے میں ساز دیکھے۔ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانی موسیقی سیکھ رہی ہے۔ مغربی موسیقی سے وہ شناسا تھی۔ میں نے اسے جانے پہچانے نغمے گاتے سنا تھا۔ پیانو پر اس کی انگلیاں خوب چلتیں۔ کئی مرتبہ یوں ہوا کہ ریڈیو پر آرکسٹرا سمفنی بجا رہا تھا، اور جینی مجھے سمجھا رہی ہے، کہ سمفنی ایک نغمہ نہیں کئی نغموں کا مرکب

ہے۔ایسے نغمے جومختلف کیفیتوں کوظاہر کرتے ہیں۔اور یہ کیفیتیں بغیر کسی تسلسل کے آتی ہیں۔رنج ومسرت،انبساط وحسرت آشامیاں،شک وسوسے،امید وبیم،اعتراف غم۔ہماری مسرتیں کبھی رنج کی آمیزش سے خالی نہیں ہوتیں۔اس طرح غم کی گھٹائیں اکثر بہجت کی کرنوں سے جگمگا اٹھتی ہیں۔انسان کے دل میں کوئی جذبہ مکمل اور دیرپا نہیں ہوتا۔یہ کیفیتیں بدلتی رہتی ہیں۔تبھی سمفنی میں اتنے اتار چڑھاؤ آتے ہیں۔اورکئی کئی گتیں ساتھ،ساتھ چلتی ہیں۔

میں نے اسے ہندوستانی راگ راگنیوں کے کچھ ریکارڈ دیے،جنہیں اس نے بڑے شوق سے سنا،اسے یہ نغمے نہایت دل کش معلوم ہوئے۔اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ یہ سب راگ مختلف جذبوں اور کیفیتوں کوظاہر کرتے ہیں۔

میں نے درباری کی تشریح کی کہ جیسے بہت بڑا ہال ہے۔سامنے تخت پر بادشاہ بیٹھا ہے۔قندیلیں روشن ہیں۔فانوس جگمگا رہے ہیں۔دور دور تک امراءاور وزراء بیٹھے ہیں۔پر ہول خاموشی طاری ہے۔موسیقار کوبلایا جاتا ہے۔ایسے ماحول میں شوخ موسیقی بے ادبی میں شمار ہوگی۔غمگین موسیقی بھی موزوں نہیں۔ہلکی پھلکی موسیقی سے بھی موسیقار گریز کرے گا۔وہ اپنے جوہر دکھانا چاہتا ہے۔۔۔۔ان سب چیزوں کومدنظر رکھ کروہ جوچیز چنے گا،وہ درباری ہے۔

جینی سنتی رہی،پھر ایک روز اس نے مجھے چند تصویریں دکھائیں،جواس نے خود بنائی تھیں۔اسے مصوری کا شوق ضرور تھا۔لیکن یونہی معمولی سا،یہ اس کی پہلی کوشش تھی،ان تصویروں میں اس نے ذہنی تاثرات برش کے ذریعے کاغذ پر منتقل کیے تھے۔وہ تاثرات جومختلف راگنیاں سن کراس نے محسوس کیے،نغمے اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ہندوستانی موسیقی اس کے لئے بالکل نئی چیز تھی۔جوگیا کی تصویر میں تاحدافق ننھے ننھے خودرو پھول کھلے ہوئے تھے،چھوٹے،چھوٹے رنگ برنگے پھول،جن میں کلیاں بھی شامل تھیں۔اورادھ کھلے ہوئے غنچے بھی۔پتیوں پر

شبنم کے قطرے چمک رہے تھے۔ پس منظر دور افق کے پرے برفانی چوٹیاں تھیں۔ اونچی، اونچی برف سے لدی چوٹیاں۔۔۔۔ جن سے نورانی شعائیں منعکس تھیں۔ پودوں کے سائے شبنم کے چمکیلے قطرے اور جگمگاتی چوٹیاں،،،، سب اس امر کے شاہد تھے، کہ سورج ابھی ابھی نکلا ہے۔ اور سارے نظارے پر ایک اداس سی دھند پھیلی ہوئی ہے۔ ہلکی ہلکی نوزائیدہ دھند جس نے فضا میں اس رنگ و بو کے اس طوفان کے باوجود ایک غمگین تاثر پیدا کر دیا تھا۔

دوسری تصویر مالکوس کی تھی، اس میں سمندر کی لہروں کو پیانو کے پردے سے کھیلتے ہوئے دکھایا تھا۔ سفید اور سیاہ پردوں کی لڑیاں لہروں پر تیر رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایک اونچی سی لہر آتی، تو سارے پردوں کو یک لخت بلندیوں پر لے جاتی۔ راگ کی روانی اور زیر و بم کو لہروں کی کھیل سے ظاہر کیا گیا تھا۔

چھایا نٹ کی تصویر منظوم موسیقی کی تصویر تھی۔ جس میں مچلتے ہوئے شوخ نغمے مرتعش تھے۔ ہر جنبش میں بلا کا لوچ تھا۔ مخمور کر دینے والی مستی تھی۔

جینی انکار کرتی رہی۔ لیکن میں نے ان تصویروں کو نمائش میں رکھوا دیا۔ ایک روز ہم نمائش میں تھے۔ کسی نے یونہی جینی کا نام لے دیا۔ چند لمحوں میں ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ سب جینی کے مداح تھے جو اس کے فن کی تعریفیں کرنے لگے۔ اس روز معلوم ہوا کہ جینی مشہور ہوتی جا رہی تھی۔ قریب ہی بہت بھیڑ ہو رہی تھی۔ ایک چینی پہلوان کی کشتی تھی۔ سانگ یا کچھ ایسا ہی نام تھا۔ لوگ دور دور سے اسے دیکھنے آئے تھے۔ اسے ہجوم نے گھیر رکھا تھا۔ جہاں وہ اس قدر ہر دل عزیز ثابت ہو رہا تھا، وہاں اس کے حریف کو

جو مقامی پہلوان تھا، کوئی پوچھتا ہی نہ تھا۔ کشتی شروع ہوئی۔ غل مچ گیا۔ کچھ دیر برابر کا مقابلہ رہا۔ پھر دفعتاً۔ مقامی پہلوان نے سانگ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر سر سے اونچا اٹھا لیا، اور زمین پر دے مارا۔ سانگ بے ہوش ہو گیا۔ اسی ہجوم نے

جواس کی تعریفیں کر رہا تھا۔ اس پر آوازے کسنے شروع کر دیئے۔ اس پر اشتہار اور کاغذ کے ٹکڑے پھینک کر اکھاڑے میں تنہا چھوڑ دیا۔ سانگ ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا تھا کہ جینی مسکراتی ہوئی گئی۔ اور اس سے باتیں کرنے لگی۔ اسے پسینہ پونچھنے کے لئے اپنا چھوٹا سا معطر رومال دیا۔ جسے اس نے شکریے کے ساتھ لے لیا۔ جینی کی پیاری مسکراہٹ اور دل کش باتوں نے اسے موہ لیا۔ ان باتون میں ایسی حلاوت تھی کہ سانگ کو اپنی زبوں حالت کا احساس نہ رہا۔ ساری شام ہم نے اکھٹے گزاری

جب وہ رخصت ہوا تو اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔ اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

ڈے کے والدین آگئے۔ وہ ہوسٹل سے چلا گیا۔ اس کی والدہ نے جینی کو دیکھا، جینی کو ان کے گھر بلایا گیا۔ لیکن یہ آنا جانا بہت جلد ختم ہو گیا۔ ایک روز ڈے جینی سے ملا اور جی بی کے متعلق پوچھنے لگا۔ جینی نے شروع سے آخر تک ساری کہانی سنا دی۔ سب کچھ بتا دیا۔ ڈے اس پر برس پڑا۔ یہ باتیں اس سے پوشیدہ کیوں رکھی گئیں۔ اسے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ جی بی کے علاوہ اور بھی نہ جانے کتنے عاشق ہو نگے۔ اب اسے کیونکر یقین آ سکتا تھا۔ کہ جینی کی محبت صادق ہے۔ یہ تو محض ڈھونگ تھا۔ کھیل تھا۔ اب اس کھیل کو فوراً ختم ہو جانا چاہیئے۔

میں نے سنا ڈے کو سمجھایا، کہ جن دنوں وہ جی بی سے ملا کرتی تھی، ڈے بنگال سے آیا بھی نہ تھا۔ بھلا وہ ڈے پر اتنی دور کیسے عاشق ہو سکتی تھی۔ اور وہ بھی بلا دیکھے یا سنے۔ اور پھر وہ خود جینی کے علاوہ اور کئی لڑکیوں سے محبت جتا چکا تھا۔ جینی جانتی تھی پھر بھی اس نے باز پرس نہ کی۔ لیکن ڈے نہیں مانا، اس کے خیال میں ہر مرد کا فطری حق ہے، کہ خود دنیا بھر کی لڑکیوں سے چھلیں کرتا پھرے، لیکن لڑکی سے یہ توقع رکھے کہ وہ زندگی بھر اسے چاہے گی۔ اسی کی منتظر رہے گی۔ بچپن ہی میں اسے الہام ہو جائے گا، کہ فلاں مرد اتنے سال بعد اسے چاہنے آئے گا۔ جو خود ہرجائی ہو گا۔ اور

چاہنے سے پہلے لڑکی کی گزشتہ زندگی کی کرید کر اپنی تسلی کرے گا۔

جینی نے اسے سارے وعدے یاد دلائے، جو اس نے قسمیں کھا کھا کر کئے تھے۔ وہ محبت بھری باتیں یاد دلائیں، جو ہزاروں بار دہرائی گئی تھیں۔ وہ خواب بتائے جو اس نے اکٹھے دیکھے تھے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ تو جیسے کسی بہانے کی تلاش میں تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے جینی میں بے شمار نقص نکل آئے۔ نہ اس کا کوئی خاندان تھا، نہ مذہب۔ سوسائیٹی میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ اس کے خون میں آمیزش تھی۔ اس کی تربیت ایسے خاندان میں ہوئی، جن کی زندگی ہمیشہ ناخوشگوار رہی۔ جن میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ بہت غریب تھے۔ اور پھر جینی کچھ اتنی خوبصورت بھی نہ تھی۔ اس سے کہیں حسین اور بہتر لڑکیاں ڈے کو مل سکتی تھیں۔ ایک حسین اور بہتر لڑکی تو ڈے کی والدہ نے ڈھونڈ بھی لی تھی۔ لڑکی کے والد رائے بہادر تھے۔ لڑکی کے ساتھ لاکھوں کی جائیداد دے رہے تھے۔ انھوں نے ڈے کو انگلستان بھیجنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

شادی کی تاریخ مقرر ہوئی میرے نام بھی رقعہ آیا۔ میں خاموش رہا۔ جب جینی کے نام رقعہ آیا تو مجھے بہت طیش آیا۔ طیش میں آ کر میں نے کئی منصوبے باندھے۔ سب سے پہلا منصوبہ ڈے کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا تھا۔ لیکن جینی کے کہنے پر میں خاموش رہا۔

شادی پر ہم دونوں گئے۔ جینی شادی کا تحفہ لے کر گئی، سب کے سامنے یہ تحفہ کھولا گیا۔ ڈے کی بیوی کے لئے سنہرا ہار تھا۔ جس میں دل کی شکل کا لاکٹ پرویا ہوا تھا۔

اگلے مہینے جینی نے کالج چھوڑ دیا اور گھر چلی گئی۔

ایک پارٹی میں میرا تعارف ڈے کی بیوی سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ اسے دنیا میں اگر کسی چیز سے نفرت تھی تو وہ آرٹ سے تھی۔ یہ سارے مصور، موسیقار، شاعر اسے

زہر دکھائی دیتے تھے۔ اور سب سے زیادہ چڑ اسے ان امیر لوگوں سے تھی، جو اس قسم کی فضولیات میں پڑ کر اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ بھلا ستار یا وائلن سیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب صبح سے شام تک ریڈیو پر ساز بجتے رہتے ہیں۔ مصوری سیکھنے کی کیا تک ہے، جب بازار میں ہر قسم کی تصویریں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ اگر کسی نے الفاظ کو توڑ مروڑ کر کچھ شعر گھڑ لیے تو اس پر آنسو بہانے کی کیا تک یا بے قابو ہو جانے کی کیا ضرورت ہے؟

آخری امتحان پاس کر کے میں کالج سے چلا آیا۔ مصروفیتوں نے آن دبوچا۔ ملک کے مختلف حصوں میں پھرتا رہا۔ مدتوں تک میں نے جینی کے متعلق نہیں سنا۔

پھر ایک دن ایک پرانا دوست ملا۔ میں نے جینی کا ذکر کیا۔ تو اس نے باتیں سنائیں کہ وہ پہلے سے بالکل بدل چکی ہے۔ ہر جگہ یہی مشہور ہے کہ وہ محبت کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک معاشقہ ختم ہوا ہے، تو دوسرا عنقریب شروع ہو گا۔ کالج چھوڑ کر اس نے ملازمت کر لی۔ بالکل آزادانہ طور پر رہتی ہے۔ ہر شام اس کے ہاں لوگوں کا جمگھٹا رہتا ہے، قسم قسم کے لوگ آتے ہیں۔ نہایت عجیب و غریب ہجوم ہوتا ہے۔ خوب افوائیں اڑتی ہیں، لوگ شیخیاں مارتے ہیں۔ ہم نے یہ کیا وہ کیا۔

میرے کوٹ کے کالر سے جو بال چسپاں ہے وہ جینی کا ہے۔ یہ تصویر جینی نے مجھے دی تھی۔ میرے رومال پر جو سرخی ہے وہ جینی کے ہونٹوں کی ہے۔

پچھلے سال سیلاب آیا، لوگ بے گھر ہو گئے، قحط پڑا، جینی نے کچھ لڑکوں، لڑکیوں کو ساتھ لیا، گاؤں گاؤں پھر کر مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کی۔ امیروں سے فلرٹ کر کے چندہ اکٹھا کیا، اپنی صحت اور آرام کا خیال نہ رکھا، رات دن محنت کی۔ کئی مرتبہ بیمار ہوئی، کچھ اوباش قسم کے لوگ محض جینی کی وجہ سے محتاجوں کی امداد پر تیار ہو گئے۔ اسے چھیڑا، تنگ کیا۔ ایک شام کو بہانے سے اپنے ساتھ لے گئے، اسے شراب پلانی چاہی۔ جینی نے گروہ کے سرغنے کے بال نوچ لیے۔ اس کا منہ

طمانچوں سے لال کر دیا۔وہ ایسے گھبرائے کہ جینی کو واپس چھوڑ گئے۔

پھر کسی نے جینی کی تصویر اخباروں میں نکلوا دی۔اس کی تعریف بھی شروع کر دی۔سب نے یہی سمجھا کہ اس سستی شہرت کی غرض سے جینی نے لوگوں کی مدد کی تھی۔

پھر ایسا اتفاق ہوا کہ ایک تبادلے نے مجھے جینی کے قریب پہنچا دیا۔ محض چند گھنٹوں کی مسافت تھی۔ ہر دوسرے تیسرے ہفتے میں اسے ملنے جاتا سچ مچ اب وہ پرانی جینی نہیں رہی تھی پہلے سے کہیں تندرست اور چست معلوم ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر تازگی تھی، نکھار تھا، ہونٹوں میں رسیلا پن اور رخساروں پر سرخی آ چکی تھی۔ اب وہ ایک شعلہ فروزاں تھی، وہ طرح طرح سے میک اپ کرتی، شوخ و بھڑکیلے لباس پہنتی، جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، قسم قسم کی خوشبوئیں، وہ ہر موضوع پر بلا دھڑک گفتگو کر سکتی تھی۔کلبوں اور رقص گاہوں میں اسے باقاعدگی سے دیکھا جاتا تھا۔ہفتے بھر کی شامیں پہلے ہی مختلف مصروفیتوں کے لیئے وقف ہو جاتیں۔ پرانی سیدھی سادی جینی کی جگہ میں اس شوخ وشنگ جینی کو دیکھ کر چڑ سا گیا۔یہ جذبہ محض رشک وحسد کا جذبہ تھا۔شاید میں برداشت نہیں کر سکتا تھا، کہ گفتگو کرتے وقت مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ جانتی ہے۔ ہر بحث میں وہ ہرا دے۔ تاش کھیلتے وقت میں بغلیں جھانکنے لگوں۔رقص گاہ میں بعض دفعہ مجھے ایک لڑکی بھی نہ ملے۔اور اس کے لئے بیسیوں لڑکے بے قرار ہوں۔وہ ایسی چیزوں کا ذکر کرتی رہے، جن کا مجھے شوق تو ہو۔لیکن ان تک پہنچ ذرا مشکل ہو۔شام کو اس کے ہاں لوگوں کا ہجوم ہوتا۔

ان میں زیادہ تعداد عشاق کی ہوتی، جو طرح طرح سے اپنی محبت کا اظہار کرتے۔شادی شدہ حضرات اپنی غمگین ازدواجی زندگی کا رونا رویا کرتے، کہ کس طرح قدرت نے ان کو دغا دی۔اور نہایت بد مذاق اور ٹھس طبیعت کی رفیقہ پلے

باندھ دی۔ اب ان کے لئے دنیا جہنم سے کم نہیں۔ اب یہ عذاب برداشت نہیں ہوسکتا۔ خودکشی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ لیکن اس سیاہ خانے مین انہیں امید کی ایک نورانی کرن نظر آتی ہے،،،،،، وہ ہے جینی۔

پر مغز اور ذہین قسم کے لوگ اکثر سیاسیات اور ادب پر بحث کرتے، کارل مارکس، فارائیڈ اور مولانا روم کے تذکرے چھیڑتے۔ سیاست دانوں کی غلطیاں گنواتے، مشاہیر پر تنقیدیں کرتے، بے لوث اور سچی محبت کا دم بھرتے۔ لیکن موقع پاکر عشق بھی جتادیتے۔

ایک طبقہ نفاست پسند اور نازک اندام لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ ہر وقت اپنی کمزوریاں گنواتے رہتے، اپنی بیاریوں کا ذکر کرتے، اپنے آپ کو بے حد ذلیل اور کم تر سمجھتے۔ بار، بار جینی سے پوچھتے۔۔۔۔ اگر تمہیں برا معلوم ہوتا ہو، تو میں آئندہ نہ آیا کروں۔ اگرچہ ایسا کرنے سے مجھے قلبی، جگری، اور روحانی صدمہ پہنچے گا،،،، مگر ہر شام کو آدھمکتے۔

کئی ایسے شرمیلے بھی تھے، جو چھپ چھپ کر خطوط لکھتے۔ جینی پر نظمیں کہہ کہہ کر اسے بدنام کرتے، سامنے آتے تو شرما شرما کر برا حال ہو جاتا۔

سب سے گھٹیا وہ عاشق تھے جو خود کو جینی کا بھائی کہتے۔ بھائیوں کی سی دلچسپی لیتے۔ اس کی حفاظت اور بہبودگی کے خواہاں ہوتے۔ لیکن دل میں کچھ اور سوچتے رہتے۔

مجھے یہ تماشا دیکھ کر غصہ آتا۔ آخر یہ لڑکی چاہتی کیا ہے؟ یہ سب کے سب پسند آنے سے تو رہے، سارے ہجوم کو برخاست کر کے ان میں سے ایک دو سے ملتی رہا کرے۔ میرا ارادہ بھی ہوا، کہ اسے ٹوکوں، پھر سوچا بھلا میں اس کا کیا لگتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں اسے ذرا پہلے سے جانتا ہوں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک شخص کی جانب ملتفت ہوتی جارہی ہے۔ یہ

شخص بالکل عجیب تھا۔ پہلے پہل تو میں اسے سمجھ ہی نہ سکا۔ یہی سوچتا کہ آخر اس کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اسے قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا۔ کہ اس کی زندگی کا واقعی ہی کوئی مقصد نہیں۔ اسے کسی چیز پر یقین نہیں تھا۔ محبت نفرت، زندگی، موت، انسان، خدا۔ سب سے منکر تھا۔ بات بات پر بحث کرنے کے لئے تیار ہو جاتا۔ سب اس سے کتراتے تھے۔ اسے کامریڈک ینام سے پکارا جاتا تھا۔ محض جینی کی وجہ سے میں اس سے ملتا۔ ورنہ میرے دل میں اس کے لئے نفرت تھی۔ یہ نفرت شاید اسی دن پیدا ہوئی۔ جب ہم نے پہلی اور آخری بحث کی، کامرید ہمیشہ عورتوں کو برا بھلا کہا کرتا تھا۔ نکتہ چینیاں کرتا۔ ایک روز میں نے اختلاف کیا۔ عورت کی زندگی کی ان گنت مجبوریاں جتلائیں۔ لڑکی کی پیدائش کو نامبارک سمجھا جاتا ہے۔ لڑکوں کے مقابلے میں اس کی پرورش میں کوتاہی برتی جاتی ہے۔ بھائی اسے ڈانٹتے دھمکاتے ہیں۔ اس کا حصہ چھین لیتے ہیں۔ اس کے دل میں احساس کمتری پیدا کر دیتے ہیں۔ ذرا بڑی ہونے پر کنبے اور پڑوسیوں کی تنقید شروع ہو جاتی ہے۔ دوپٹے کا ذرا سر سے اتر جانا خاندان کی ناک پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ذرا سی بھول اسے زندگی بھر کے لئے مجرم بنا دیتی ہے۔ کالج میں اسے فلسفہ سکھایا جاتا ہے۔ مساوات اور آزادی کے سبق دیے جاتے ہیں۔ لیکن جب شادی کا سوال آتا ہے، تو اس سے کوئی نہیں پوچھتا، اسے وہی کرنا پڑتا ہے جو چند خشک مزاج بزرگ چاہتے ہیں۔ لیکن لڑکوں کی زندگی بالکل مختلف ہے۔ وہ بڑی آسانی سے جھوٹی قسمیں کھا کر لڑکیوں کو دھوکا دے سکتا ہے۔ محبت کا واسطہ دے کر سب کچھ منوا لیتے ہیں۔

پھر چند خاندانی مجبوریوں کی بنا پر انہیں بڑی آسانی سے دھتکار دیتے ہیں۔ اور سلیٹ کی طرح بار بار دھل جاتا ہے۔ ان کا ماضی کوئی معنی ہی نہیں رکھتا۔ ان کے لئے بیاہ شادی کھیل ہے۔ لیکن لڑکیوں کے لئے شادی نئی مصیبت کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ بیوی بن کر بچوں کی پرورش، معاشی بے بسی، ذرا ذرا سی بات کے لئے خاوند کی

طرف دیکھنا پڑتا ہے۔عمر رسیدہ ہو جانے پر اولاد بے مصرف سمجھتی ہے۔مذاق اڑاتی ہے۔۔۔۔

کامریڈ کو میری باتیں بالکل فضول معلوم ہوئیں۔

وہ یہی کہتا رہا، کہ ویسے مرد عورت برابر ہیں۔لیکن مرد کا مرتبہ دماغی اور جسمانی لحاظ سے بلند ہے۔اس نے دونوں کے دماغ کی بناوٹ اور روزن کا ذکر بھی کیا۔مرد کے لئے لمبے قد اور مضبوط بازوؤں کا حوالہ بھی دیا۔

اس کے بعد میری اور اس کی کبھی بحث نہیں ہوئی۔

پتہ نہیں اس کا ذریعہ معاش کیا ہے۔وہ رہتا کہاں تھا؟۔اس کی گزشتہ زندگی کہاں اور کیسے گزری، بس یہ مشہور تھا کہ وہ جینی کا مداح ہے۔

جینی ان دنوں بڑی ٹھوس قسم کی کتابیں پڑھتی۔مشکل مضامین کی بے حد خشک اور سنجیدہ کتابیں، جب وہ دونوں باتیں کرتے تو بہت کم لوگ سمجھ سکتے۔کہ کس موضوع پر گفتگو ہو رہی ہے۔ان دونوں کی دوستی کا یہ پہلو مجھے بہت اچھا معلوم ہوتا، جینی کی مدلل اور ذہین باتیں ظاہر کرتیں۔کہ وہ ذہنی ارتقا کی منزلیں بڑی تیزی سے طے کر رہی ہے۔

ہم پکنک پر رہے، اس تاریخی عمارت کو ہم نے بارہا دیکھا تھا۔لیکن جب جینی نے ہمیں ایک خاص زاویے سے دیکھنے کو کہا، تو یوں معلوم ہوا جیسے اس باغ اور عمارت کو آج پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔کامریڈ اچھل پڑا،صرف ایک آرٹسٹ کی آنکھ اس زاویے کو دیکھ سکتی تھی، جب قصے کہانیاں ہو رہی تھیں۔تو ایک لڑکا اپنا ارمان سنانے لگا۔اسے ایک لڑکی دور دور سے دیکھا کرتی تھی۔اشارے ہوتے، پتھر سے لپٹے ہوئے خطوط آتے، عہد و پیمان ہوتے۔لیکن وہ فاصلہ اتنے کا اتنا تھا۔نہ وہ خود قریب آتی نہ آنے دیتی۔تنگ آ کر اس نے چھت پر جانا چھوڑ دیا۔کئی دنوں بعد وہ چھت پر گیا تو لڑکی نے بڑی منت سماجت کی۔

اس نے صاف کہہ دیا کہ اگر اب بھی قریب نہ آنے دیا تو وہ چھت پر آنا چھوڑ دے گا۔ بڑی مشکلوں کے بعد وہ رضامند ہوگئی۔ بار، بار یہی کہتی کہ آپ وعدہ کیجیئے۔ مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں گے۔ اس نے وعدہ کیا تو مانی۔ یہ اسے ملنے گیا لڑکی نہایت حسین تھی، لیکن اس کی آنکھ میں نقص تھا۔ وہ بھینگی تھی۔

اس پر بڑے قہقہے پڑے۔ ہنستے، ہنستے لوگ دوہرے ہوگئے۔ لیکن جینی کاموش رہی اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ دیر تک وہ چپ چاپ رہی۔ مجھے بھی اس کہانی نے اداس کر دیا۔ یہ کہانی ہرگز مضحکہ خیز نہ تھی۔

باغ کے گوشے میں ایک کنواں تھا۔ جس کے متعلق مشہور تھا کہ اس میں جھانک کر جو خواہش کی جائے، پوری ہو جاتی ہے۔ سب نے کچھ مانگا۔ جب جینی کی باری آئی، تو اس نے کہا مجھے کسی سے کچھ نہیں چاہیئے۔ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ کوئی ارضی یا سماوی طاقت مجھے کچھ نہیں دے سکتی۔ بس مجھے ایک زندگی ملی ہے اور مجھے زندہ رہنا ہے۔

کامریڈ عش، عش کر اٹھا۔ کہنے لگا جینی کا یہ نظریہ صیح ترین نظریہ ہے۔ ایسی دنیا میں جہاں لوگ اب تک بارش کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس سے بہتر نظریہ نہیں ہو سکتا۔ کوئی کسی کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ تقدیر اور قسمت فضول چیزیں ہیں۔ ہر شخص اپنے گرد بچھے ہوئے جال میں گرفتار ہے۔ اپنے حالات سے مجبور ہے۔ زندگی کے اٹل ارادے، شدید جذبے، سب حوادث کے غلام ہیں۔ ہم اس لئے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ کہ اتفاق نے ہمیں ملا دیا۔ اس طرح ہم محض اتفاق سے ایک دوسرے کی رفاقت سے محروم ہیں۔ جنہیں ملتے تو شاید گہرے دوست بن جاتے، پھر ایک روز وہی کامریڈ جو افلاطونی دوستی اور خلوص کے گن گایا کرتا تھا، جینی کو اپنے ساتھ لے گیا۔ انہوں نے اکٹھے چائے پی، پکچر دیکھی۔ چھوٹے موٹے تحفے خریدے، جب ٹیکسی میں دونون واپس آ رہے تھے، تو اس نے جینی کو چومنے کی

کوشش کی۔

جینی نے ٹیکسی ٹھہرائی۔ جتنے روپے کامریڈ نے اس پر صرف کیے تھے، اس کے منہ پر مارے۔اور پیدل واپس چلی آئی۔

کامریڈ کئی روز تک غائب رہا پھر معافی مانگنے آیا، جینی ان یکہا مجھے طیش نہیں یا مایوسی ہوئی ہے۔ میں تمہیں ان سب سے مختلف سمجھتی تھی، میرا خیال تھا تم اس ہجوم میں سے نہیں ہو۔لیکن تم میں اور ایک عام انسان میں فرق نہیں

کامریڈ نادم تھا، بولا، ، ، ، میرے نظریے خواہ کیسے ہوں، میں انسان بھی ہوں۔تم میں اتنی زبردست کشش ہے کہ میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی کرتا۔میں نے کبھی تمہارے چہرے کو غور سے نہیں دیکھا، تمہاری بے چین روح کو دیکھا ہے۔ اور یہی روح مجھے عزیز ہے۔اگر تمہارے خدوخال بہتر ہوتے اور تم زیادہ خوبصورت ہوتیں، تو تمہاری زندگی مختلف ہوتی، اگر تم کسی بہتر گھرانے میں پیدا ہوئی ہوتیں، ت وتمہاری زندگی مقابلۃ آسان ہوتی، لیکن تم اتنی صلاحیتوں کی مالک نہ ہوتیں، تمہاری روح اتنی حسین نہ ہوتی۔

جینی عورت تھی کامریڈ کے رنگینفقروں نے اسے موہ لیا، اس کیآنکھیں جھک گئیں، دل دھڑکنے لگا۔رخسار سرخ ہو گئے۔ جب کامریڈ نے بازو پھیلائے ت وجینی نے مزاحمت نہیں کی۔اس کے بعد کامریڈ کی گفتگو کا انداز بدل گیا، محبت ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کا نام نہیں، بلکہ دونوں کے ایک سمت میں دیکھتے رہنے کا نام ہے۔

محبت میں اگ ررفاقت کی آمیزش ہوت ووہ بلندیوں تک جا پہنچتی ہے، ، ، ، اس قسم کی باتیں بار بار دہرانا۔

کبھی کبھی وہ مجھے کافی دل چسپ معلوم ہوتا، اس کی چند چیزیں مجھے پسند تھیں۔ اس کی صحرانوردیاں، بے چین طبیعت سیلانی پن، ، ، لیکن اس کے شکست خوردہ

نظریے، بلا وجہ کا حزن، تلخ خیالات برے معلوم ہوتے۔ وہ قنوطی تھا اور اذیت پسند۔ اس نے کبھی زندگی کا مقابلہ نہیں کیا۔ مصیبت کو آتے دیکھ کر وہ ہمیشہ کترا جاتا۔ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا۔ دنیا بھر کا ستایا ہوا۔ اس کا ارادہ تھا عمر بھر اسی طرح سر گرداں رہے۔ اس کی منزل کہیں نہیں۔

میرا تبادلہ ہوا تو جینی مجھے چھوڑنے اسٹیشن پر آئی، جدا ہوتے وقت میں نے رومال مانگا ''رومال لے کر کیا کرو گے؟ رومال تمہاری شوخ مسکراہٹوں کی یاد دلاتا رہے گا۔ بولی تم ہر مرتبہ رومال ہی کیوں مانگتے ہو۔ بتایا کہ اس کی مخمور کن خوشبو اور ننھے سے دل کی وجہ سے۔

اگلے سال مجھے کسی نے بتایا کہ کامریڈ جینی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ وہ بالکل ویسے کا ویسا رہا۔ جینی کی تمام کوششیں اس میں کوئی تبدیلی نہ لاسکیں۔ چلتے وقت اس نے جینی سے کہا کہ بے سروسامانی اس کی تقدیر میں ہے۔ اس کی منزل مفقود ہے۔ وہ جینی سے محبت کرتا رہے گا۔ اس کی تصویریں دل سے لگا کر رکھے گا۔ دوسرے ملکوں سے اسے خط لکھا کرے گا۔ اسے ہمیشہ یاد رکھے گا اور بس،،،،

جینی نے اس کا تعاقب کرنا چاہا، جو کچھ اس کے پاس تھا فروخت کر دیا۔ پتہ نہیں وہ اسے ملا یا نہیں۔

جب وہ واپس آئی تو طرح طرح کی افوائیں پھیلی ہوئی تھیں۔ جینی کے والد نے جواب تنہا رہتا تھا۔ اسے سخت سست کہا اور گھر سے نکال دیا

کچھ اوباش قسم کے لوگوں نے اس کی مدد کرنا چاہی۔ لیکن جینی وہ شہر چھوڑ کر چلی گئی۔

کنیری سے میں سمندر پار ملا۔ وہ ہندوستانی تھا۔ لوگ اس کی حرکتوں کی وجہ سے اسے کیز انووا کہتے، اسی سے یہ نام پڑ گیا۔ پہلی ملاقات پہاڑوں میں ایک کیمپ میں ہوئی۔ ہم نے قصبے سے کچھ شہریوں کو کھانے پر بلایا ہوا تھا۔ خیمے میں باتیں ہو

رہی تھیں، کہ وہ ایک روسی افسر سے لڑ پڑا۔ لڑائی کی وجہ ایک روسی لڑکی تھی۔ کیری نے فوراً اسے ڈویل کی دعوت دی۔ اپنے ریوالور سے چار گولیاں نکال لیں، اور روسی سے بولا۔ ہم باری باری اسے اپنے کان سے چھوا کر چلائیں گے۔ اس میں صرف دو گولیاں ہیں

،،،،، جس کی قسمت میں گولی لکھی ہوگی، اس کے دماغ میں سے نکل جائے گی۔ روسی پیے ہوئے تھا فوراً راضی ہوگیا۔ پہلا فائر کیری نے اپنے آپ پر کیا۔ وہ خانہ خالی تھا۔ دوسرا فائر روسی نے کیا کچھ نہ ہوا۔ کیری تیسرا فائر کر چکا تھا۔ تو ہم نے انہیں بڑی مشکلوں سے علیحدہ کیا۔ روسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ریوالور میں گولیاں ہیں اس نے یونہی لبلبی دبا دی۔ گولی خیمے کی دیوار چیر گئی۔

اس کا تبادلہ ہوا۔ وہ ہمارے کیمپ میں آگیا۔ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔

شہر کے حاکم نے ہمیں دعوت دی، ہم دونوں گئے۔ نہایت دل چسپ پروگرام تھا۔ آغا نے کیری کا تعارف ایک نہایت خوبصورت ایرانی لڑکی سے کرایا۔ کسی لڑکی سے رات کو ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ سردیوں کی اندھیری رات تھی۔ کیمپ وہاں سے سو میل کے لگ بھگ تھا۔ ہمیں سب نے منع کیا۔ کیری کا وعدہ تھا کیوں کر نہ پورا ہوتا۔ ہم جیپ میں روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی برفباری ہو رہی تھی۔ پہاڑوں کی پیچیدہ دشوار گزار سڑک برف سے سفید ہو چکی تھی۔ ہم اتنی تیزی سے جا رہے تھے کہ موڑوں پر جیپ ہوا میں اٹھ جاتی۔ راستے بھر وہ اپنی محبوبہ کے لافانی حسن کی تعریفیں کرتا رہا۔ جب ہم وہاں پہنچے، تو دعوت ختم ہو چکی تھی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ لڑکی منتظر ملی۔ کیری نے میرا تعارف کرایا۔ ان دنوں میں بے حد اداس تھا مہینوں سے مجھے کسی عزیز یا دوست کا خط نہیں ملا تھا۔ میں نے بڑی جذباتی قسم کی گفتگو شروع کر دی۔ اسے یہ باتیں اچھی معلوم ہوئیں۔ ہم ایک گوشے میں جا بیٹھے۔ کیری ایک دو

بار ہمارے پاس آیا لیکن پھر اٹھ کر چلا گیا۔ جب لوگ جانے لگے تو اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا،،،،،، میں کیمپ جا رہا ہوں، تھوڑی دیر تک تمہارے لئے جیپ بھجوا دوں گا۔

اور یہ لڑکی میں نے حیران ہو کر پوچھا

یہ اب تمہاری ہے،،،،، میں یاروں کا یار ہوں۔

میں تمہارے چہرے کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں نے تم دونوں کی آنکھوں میں اس روشنی کی چمک بھی دیکھی ہے، جو پہلی ملاقات پر بلاوجہ پیدا نہیں ہوتی۔ میں اسے چاہتا ضرور ہوں۔ لیکن تم بھی میرے دوست ہو،

اس کی شخصیت عجیب تھی۔ نہ اسے کسی خطرے کا احساس تھا نہ کسی مصیبت کا ڈر۔ وہ ہمیشہ کام کر چکنے کے بعد سوچتا۔ کہ یہ کام اسے کس طرح کرنا چاہیئے تھا۔ اس کے مزاج میں بلا کی تندی اور گرمی تھی۔ کیسی ہی آفت آن پڑے وہ کبھی نہ گھبراتا۔ ذرا ذرا سی باتوں پر بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ اسے سکون سے نفرت تھی۔ اس سے لڑ، اس سے جھگڑ

محاذ سے واپس آیا تو ڈوئل لڑ رہا ہے۔ جوئے میں آج ہزاروں جیتے تو کل سب ہار دیئے۔

سب اس کے کام یاب معاشقوں پر رشک کرتے، اس کام یابی کا راز پوچھتے۔ وہ سر ہلا کر کہتا۔ یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ہزاروں محبتیں ایسی ہیں۔ جو ادھوری رہ گئیں، جو کبھی نہ پنپ سکیں۔ جنہوں نے بار بار میرا دل توڑا۔

ہمارے قریب ایک چھوٹا سا خوش نما قصبہ تھا۔۔۔۔۔ گلشن۔۔۔۔ آس پاس کے باشندوں میں کیزی شہنشاہ گلشن کے نام سے مشہور تھا۔

پہلے کبھی اس پر قتل کا مقدمہ بن گیا تھا، موت کی سزا یقینی تھی، پھر عجیب سے حالات میں وہ بری ہو گیا۔ آزاد ہو کر اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ بقیہ زندگی کو ایک نئی

زندگی سمجھے گا، جو اسے تحفتاً ملی ہے۔ اس زندگی کا گزشتہ زندگی سے کوئی واسطہ نہیں۔ وہ ہمیشہ مسرور رہے گا، آزاد رہے گا۔ جو چیز ناپسند ہوئی اسے فنا کردے گا۔

جو بھا گئی، اس پر چھا جائے گا۔

محض اتفاق تھا، کہ ایسا شخص زندگی کی شاہراہ میں جینی سے ملا۔

اس کا پیار آندھی کی طرح اٹھا، آناً فاناً چھا گیا۔ اور طوفان کی طرح اتر گیا۔

وہ چھٹی پر ہندوستان آیا۔ شام کو کسی شناسا لڑکی سے ملاقات کا پروگرام بنا۔ اسے ملنے گیا۔ وہ نہیں ملی، مگر وہاں ایک اور لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ یہ لڑکی جینی تھی۔ جو اپنی سہیلی سے ملنے آئی تھی کیزی نے جینی کو اپنی محبوبہ کا نعم البدل سمجھا۔ جتنے دن وہ وہاں رہا۔ اسے نعم البدل سمجھتا رہا۔ اس نے قیمتی تحفوں سے، اپنی دل چسپ باتوں اور رنگین کہانیوں سے جینی پر جادو کر دیا۔ بھڑکیلی کاروں میں اسے لئے لئے پھرا۔ ایک چاندنی رات میں جب وہ سمندر میں تیرنے گئے، تو ریت پر بیٹھ کر اس نے محبت کا واسطہ دے کر جینی کو شیمپئن پلائی، عمر بھر باوفا اور صادق رہنے کا حلف اٹھایا، ہمیشہ اکٹھے رہنے کے عہد و پیمان کیے۔ یہ اس قدر پر خلوص تھا کہ جینی نے سچ مان لیا۔

اس آغاز کے بعد انجام وہی ہوا۔ جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ جو ناگزیر تھا۔ جینی کی زندگی میں وہ جس طرح آیا تھا، اسی طرح چلا گیا۔

لیکن جینی کی یاد اس کے دل سے مکمل طور پر نہ گئی۔ جب کبھی اسے کوئی ٹھکرا دیتا، جب دیر تک تنہا پڑا رہتا، کوئی بری خبر سننے میں آتی۔ اداسیاں عود کر آتیں۔ تو اسے جینی کی معصومیت، اس کا خلوص اور پیار یاد آتا۔ رات کی تنہائی میں ہم دونوں دیر تک خیمے میں بیٹھے رہتے۔ باہر سرد ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ جینی کو یاد کرتا۔ اپنے جھوٹے وعدوں ک و یاد کر کے شرمندہ ہوتا۔ اپنے آپ کو گنہگار سمجھتا۔ بار، بار کہتا جینی ان سب لڑکیوں سے مختلف تھی، جو اس کی زندگی میں آئیں۔ اگر اس کی زندگی

میں شادی کی کوئی گنجائش ہوتی تو وہ ضرور جینی سے شادی کرتا۔ وہ نہایت غیر معمولی لڑکی تھی۔ اسے کسی نے سمجھا نہیں۔ کسی کی نگاہیں اس کے خدوخال سے آگے نہیں پہنچیں۔ اس کی روح کی عظمت کو کسی نے نہیں پہچانا۔ اس میں کسی مصور کی روح تھی۔ کسی عظیم شاعر اور بت تراش کی روح۔ اس میں اتنی صلاحیتیں تھیں کہ اس کی رفاقت کسی کی بھی زندگی چمکا سکتی تھی۔ اس میں بلا کی معصومیت تھی، سیتا کا تقدس تھا۔ مریم کی پاکیزگی تھی۔ اس نے کئی مردوں سے محبت نہیں کی بلکہ ایک ایک مرد سے محبت کی،،،،،، ایک مرد جسے اس نے کلبلاتے رینگتے ہجوم سے چنا، اور دوسروں سے مختلف سمجھا۔ اس کی مسکراہٹ کیسی تھی،،،،، بالکل مونا لیزا کی مسکراہٹ، معصوم، اتھاہ اور پر اسرار، اس کی مسکراہٹ کے سامنے کیری جیسا انسان بھی کانپ اٹھا تھا۔

لیکن ایسی باتیں وہ کبھی کبھی کیا کرتا تھا۔ اور اگلی صبح وہ اکثر بھول جاتا۔

اس کے بعد ایک طویل وقفہ آیا۔ یہ وقفہ ایسا تھا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا، جینی بھی یاد نہ رہی۔ میں ہزاروں میل فاصلے سے ملک واپس آیا تو پھر بھیج دیا گیا، اس عرصے میں کوئی پرانی یاد تازہ ہو جاتی، اور خیالات کے تسلسل میں جینی کا خیال آجاتا۔ تو میں سوچتا غالباً اب اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوگی۔

لگاتار تنہائی اور بہت سے کٹھن لمحوں کے بعد مجھے مختصر سے چھٹی ملی۔ میں قریب کی پہاڑیوں پر چلا گیا۔ وہ علاقہ نہایت سرسبز و شاداب تھا۔ دور دور تک چائے کے باغات تھے۔ اور مالدار سوداگروں کی آبادیاں، جہاں میں مقیم تھا۔ وہاں خوب رونق تھی، میری طرح بہت سے اجنبی سکون کی تلاش میں آئے ہوئے تھے۔ چند ہی دنوں کے بعد مجھے معلوم ہوگیا کہ باوجود اتنی چہل پہل اور شوروشغب کے وہ احساسِ تنہائی کم نہیں ہوا۔ جو مجھے کھینچ کر یہاں لایا تھا۔ ایک روز میں یونہی کھویا کھویا سا پھر رہا تھا، کہ جینی مجھے مل گئی، ایسے دور دراز خطے میں اسے پا کر مجھے ازحد مسرت ہوئی، اس مرتبہ تو وہ پہلے سے مختلف معلوم ہوئی۔ اس کی باتوں میں حزن کی آمیزش

تھی، اس کے چہرے پر پژمردگی تھی۔ لیکن ایسی پژمردگی جس میں عجیب جاذبیت تھی، جو حسن و شباب کی تازگی سے کہیں دل فریب معلوم ہو رہی تھی، اس مسکراہٹ میں افسردگی کی رمق نے ایک عجیب وقار پیدا کر دیا تھا۔

وہ وہاں اپنے کسی عزیز کے ہاں رہتی تھی، جو چائے کے سوداگر تھے۔ وہ بھی اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہی تھی، کلب، رقص پارٹیاں بے حد اکتا دینے والی تھیں۔ وہاں اس کا صرف ایک دوست تھا، اسی کمپنی کا ایک بوڑھا ملازم، جو تنہا رہتا۔ جس کی زندگی کا سب سے قیمتی خزانہ کتابیں تھیں۔ کام سے لوٹ کر وہ بڑے اہتمام سے کتابیں نکالتا۔ دونوں پڑھتے، بحث کرتے، لڑتے۔ اب ہم تین ہو گئے تھے۔ چھٹی کے بقیہ دن یوں گزرے کہ پتا بھی نہ چلا۔ واپس آ کر میں نے تبادلہ کرا لیا۔ اور جینی کے پاس چلا گیا، ہم جنگلوں میں نکل جاتے، سیریں کرتے کتابیں پڑھتے، بچوں کی طرح ہنستے کھیلتے، میں اسے جتنا قریب سے دیکھتا، اتنی ہی نئی خوبیاں پاتا۔ وہ بہترین رفیق تھی اکثر مجھے محسوس ہوتا کہ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا، اس کی بے پناہ جاذبیت سے کبھی آشنا نہیں ہوا۔ ہم رقص پر جاتے تو وہ سارا وقت مجھے دیتی۔ میری جانب متوجہ رہتی، اس کی نگاہیں میرے چہرے پر جمی رہتیں۔ اور مجھے اس پر فخر ہونے لگتا۔ ہم ایک دوسرے کے قریب خاموش بیٹھے پڑھتے رہتے۔ کئی کئی گھنٹوں تک ایک بات بھی نہ ہوتی۔ ہمارے خیالات ہم آہنگ ہو جاتے۔ دلوں میں طمانیت ہوتی۔ خاموشی اور تقریر کا فرق یوں مٹ جاتا، جیسے ہم باتیں کر رہے ہوں۔ پتہ نہیں وہ کون سا رشتہ تھا جس نے ہم دونوں کو قریب کر رکھا تھا، دوستی کا جذبہ۔ یہ قرب اس قدر ضروری ہو گیا کہ ایک لمحہ کی جدائی شاق گزرتی۔

ایک روز میں نے اس کی کتابوں میں نظموں کی کاپی دیکھی۔ یہ نظمیں جینی نے لکھیں، یہ نظمیں کس قدر حزنیہ تھیں، کتنی کرب انگیز اور دردناک۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یہ اس نے کب اور کن حالات میں لکھیں۔ یہ اس کی لکھی ہوئی ہرگز معلوم نہیں

ہوتیں۔ جسے میں جانتا ہوں، دلیر اور نڈر جینی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہی۔

ایک سہ پہر ہم سیر سے واپس آ رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی۔ پہلے تو درختوں کے نیچے چھپتے رہے۔ جب موسلا دھار مینہ برسنے لگ تو بھاگ کر ایک شکستہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ میں ن یا پنا کوٹ سوکھی ہوئی گھاس پر بچھا دیا، ہم دونون بیٹھ گئے۔ کچھ دیر خاموشی رہی، میں نظموں کی باتیں کرنے لگا۔ یونہی تنگ کرنے کو کہا، پہلے تو کبھی بھولے سے بھی کوئی شعر اس کی زبان پر نہ آتا تھا۔ اب ہزاروں اشعار زبانی یاد ہیں۔ کہین کوئی شاعر تو پسند نہیں آ گیا تھا۔ اس کا چہرہ اتر گیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے معافی مانگی، شاید میں نے اس کی کوئی دکھتی ہوئی رگ چھیڑ دی تھی، یا تلخ یادیں تازہ کرا دی تھیں۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دو بار معافی مانگی، ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ جب وہ میرے شانے سے سر لگائے بیٹھی تھی تو ایسی ننھی منی بچی معلوم ہو رہی تھی، جو راستہ بھول گئی ہو۔ بے یار و مددگار۔ سہارے کی طالب۔ میں نے اس کے آنسو خشک کیے۔ دونوں ہاتھوں سے اس کے چہرے کو تھام کر اسے پیار کیا۔ ان بارہا چومے گئے ہونٹوں پر اب تک تازگی تھی۔ ان آنکھوں میں اب تک معصومیت تھی۔ ان رخساروں پر اب تک وہی جلا تھی۔ یہ لڑکی اب تک وہی لڑکی تھی۔ جسے میں نے برسوں پہلے جی بی کے مباحثے میں دیکھا تھا۔

اس کی زندگی کی ایک کہانی ایسی بھی رہ گئی تھی۔ جو میں نے نہیں سنی تھی۔ یہ کہانی اس نے خود سنائی، یہ ایک شاعر کے متعلق تھی جو جواری تھا، شرابی تھا، مفلس تھا، جھوٹا تھا، اپنی خودداری اور انفرادیت کو خیر باد کہہ چکا تھا۔

جس کی حرکتیں دیکھ کر افسوس کی بجائے غصہ آتا۔ جینی ہمیشہ اس پر ترس کھاتی،، ،، ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتی، سفارشیں کر کے اس کا کلام چھپوایا۔ اسے ادھر

ادھر متعارف کرایا۔ اس کی حوصلہ افزائی کی۔ کہ شاید یہ اس طرح سدھر جائے۔ اس کی زندگی بہتر بن سکے۔ اور وہ بیش بہا خزانہ جو اس کے دماغ میں موجود ہے۔ کہیں ضائع نہ ہو جائے۔ ترس کا یہ جذبہ دن بدن بڑھتا گیا۔ جینی غیر شعوری طور پر دن بدن اسکے قریب ہوتی گئی۔ پھر اس جذبہ نے ایک اور شکل اختیار کر لی۔ کہ جسے وہ محض جذبہ ترحم سمجھ رہی تھی۔ ایک دن محبت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ جینی نے ایک آوارہ بے خانماں کو پناہ دی۔ اپنی توجہ اور اپنا پیار ایسے انسان پر ضائع کیا جو ہرگز اس کا حق دار نہ تھا۔ وہ سدھرتا جا رہا تھا۔ اس کی حالت پہلے سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اسے جینی کی گزشتہ زندگی سے کوئی سروکار نہیں۔ اب تو اسے اپنی گزشتہ زندگی سے بھی تعلق نہ رہا تھا۔ اس کی زندگی تب سے شروع ہوئی جب اس نے جینی کو پہلی مرتبہ دیکھا، پتا نہیں کہ اس سے پہلے وہ کیوں کر جیتا رہا۔ لیکن اب وہ جینی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس نے اپنی نظموں میں بارہا جینی کو مخاطب کیا تھا۔۔

--

تمہارے دل میں خلوص کے چشمے ابلتے ہیں۔ محبت کا قلزم رواں ہے۔ تمہارے دل میں وہ جذبات ہیں جن پر رات دن کا تسلسل قائم ہے۔ زمین و آسمان کی گردش قائم ہے۔ یہ جذبات جس دن فنا ہو گئے۔ انسانیت فنا ہو جائے گی۔ دنیا چاند ستاروں کی طرح اجاڑ اور سنسان ہو جائے گی۔ یہاں کچھ بھی نہ رہے گا۔

ایک روز اس نے جینی کو بتایا کہ وہ بیمار ہے اسے دق ہے۔ کبھی کبھی یہ بیماری عود کر آتی ہے۔ کاش کہ وہ تندرست ہوتا تب وہ دونوں کسی روز شادی کر لیتے، زندگی کتنی سہانی ہو سکتی تھی۔ کیسی کیسی راحتیں میسر ہوتیں۔ تب وہ سب اذیتیں بھول جاتے جو دنیا کے جہنم میں اب تک برداشت کی تھیں۔

وہ یونہی آوارگی میں مرنا چاہتا تھا۔ لیکن بڑی مشکلوں سے جینی نے اسے سینی ٹوریم بھجوایا۔ فالتو خرچ برداشت کرنے کے لئے وہ دن بھر دفتر میں کام کرتی۔ رات کو

ٹیوشن پر لڑکیوں کو پڑھاتی، لگاتار مشقت نے اسے کمزور کر دیا۔ وہ بیمار رہنے لگی۔ وقت گزرتا گیا۔ ایک دن اسے معلوم ہوا کہ شاعر صرف اسی کے لئے نظمیں نہیں کہتا۔ اس کے تخیل میں کوئی اور بھی شریک ہے،،،،، یہ سینیٹوریم کی ایک نرس تھی جسے وہ بعد میں ملا۔

جینی نے اس افواہ پر توجہ نہ دی، یونہی کسی نے اڑا دی ہوگی۔ وہ وہاں رات، دن ایک سے ماحول مین رہ کر تھک گیا ہوگا۔ اسے تفریح بھی ت وچاہیئے۔ کسی سے ہنسنے بولنے میں کوئی ہرج نہیں۔ جب وہ اس سے ملنے جاتی تو نرس کے لئے بھی تحائف لے جاتی۔ ان دونوں کی دوستی پر اس نے کبھی شبہ نہ کیا۔ لیکن یہ افواہ محض افواہ نہ رہی۔ شاعر سینیٹوریم سے تندرست ہوکر آیا تو اس نے نرس کے ساتھ شادی کر لی۔ جینی پھر بھی اس سے ملتی رہی، اسے روپے دیتی رہی۔ آخر ان نرس نے ان ملاقاتوں پر اعتراض کیا کہ جینی جیسے لڑکی سے ملنا بدنامی مول لینا ہے۔ شاعر نے اس اعتراض کو سر آنکھوں پر لیا۔ اور جینی سے ملنا چھوڑ دیا۔ موقع ملنے پر وہ اسے بدنام بھی کرتا، اپنے کارنامے سناتا، جینی کے پرانے عاشقوں کے قصے لے بیٹھتا۔

وہ کہانی سنا چکی، تو میں نے اسے بتایا کہ ہم پرانے دوست ہیں۔ دوستی عظیم ترین رشتہ ہے۔ خلوص پر میرا ایمان ہے۔ میں انسانی کمزوریوں سے ہرگز منکر نہیں۔ شاید مجھے اچھے برے کی تمیز نہ ہو، لیکن ان جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ جن میں خلوص کارفرما ہو۔ خواہ ان جذبات کا انجام کیسا ہی ہو۔ زندگی میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ ذہنی کیفیتیں بھی دیرپا نہیں ہوتیں۔ لیکن وہ جذبات جو اپنے وقت پر صادق تھے، ہمیشہ صادق رہتے ہیں۔ اس لئے وہ مدوجزر جو تمہاری زندگی میں آئے ناگزیر تھے، تم سچی تھیں۔ تمہارے جذبات سچے تھے۔ میں نے تمہیں بہت قریب سے دیکھا ہے۔ تمہیں پسند کرنے کے علاوہ تمہاری عزت بھی کرتا ہوں۔

آہستہ آہستہ اس نے لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا، باہر جانا بند کر دیا۔ وہ ہر وقت

میری منتظر رہتی۔لیکن اب وہ مسرور نہیں تھی اسے ماضی حال کا بھی اتنا خیال نہیں رہا تھا۔جتنا مستقبل کا، وہ تنہا اور اداس تھی۔کئی مرتبہ میں نے اسے قبرستان میں بیٹھے ہوئے دیکھا۔ایک روز میں بھی اس کے پاس چلا گیا۔وہ عجیب سی باتیں کرنے لگی۔ کبھی ایسے پرسکون لمحات بھی آئیں گے جب میں بھی اس طرح سو جاؤں گی۔وہ خاموشی کتنی سہانی ہوگی۔موت کے بعد اگر چہ محض خلا ہوگا، دل دوز تاریکی ہوگی۔ لیکن وہ تاریکی اس کرب انگیز اجالے سے ہرگز بری نہ ہوگی۔اپنی نظم کا ایک بند اس نے کئی بار دہرایا۔،،،، میں ان بدنصیبوں میں سے ہوں، جنہیں ہر صبح قلیل سی روشنی ملتی ہے۔امید کی اتنی سی جلاء کہ صرف دن بھر زندہ رہ سکیں۔جس روز یہ روشنی نہ مل سکے، میں ظلمتوں میں کھو جاؤں گی

مین نے رنگین اور خوش نما باتیں کر کے موضوع بدلنا چاہا۔لیکن وہ بولی کاش تم اندازہ لگا سکتے، کہ میں کس قدر غمگین ہوں، کس قدر دل شکستہ ہوں۔اگر مجھے سہارا نہ ملا تو میرے خواب تمام ہو جائیں گے، اصول ختم ہو جائیں گے۔

میں گم ہو جاؤں گی۔

پھر ایک دن جب میں ان افواہوں کی تردید کرنا چاہتا تھا۔جو ہم دونوں نے بار ہا اپنے متعلق سنی تھیں۔وہ کہنے لگی تم مجھے جانتے ہو سمجھتے ہو میں بھی تمہاری سیاح روح سے آشنا ہوں۔تمہارے ان گنت مشغلوں، طرح طرح کے خوابوں کا مجھے احساس ہے۔میں تم سے صرف ذرا سی توجہ مانگتی ہوں۔بالکل زرا سا سہارا۔اپنی زندگی کا قلیل سا حصہ مجھے دے دو۔میں ہمیشہ قانع رہوں گی۔میں تم پر بار نہیں ہوں گی۔تم میرا ساتھ نہ دینا۔میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔

میں اس اشارے کو سمجھ گیا۔پہلے بھی اس نے کئی بار ایسی باتیں کی تھیں۔میں یہ بھی جانتا تھا کہ مرد اور عورت کی دوستی محدود ہے۔اس پر کئی اخلاقی اور سماجی بندشیں عائد ہیں۔یہ بندشیں ایک حد تک درست بھی ہیں۔آخر ایک مقام آتا ہے۔جہاں

فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

میں اس مقام سے لوٹ آیا۔

فیصلہ کرنے کا وقت آیا میں بزدل ثابت ہوا۔ میں خاموش ہو گیا۔خاموش ہو کر اس گروہ میں شامل ہو گیا۔ جو جینی کی زندگی میں مجھ سے پہلے آیا تھا۔ وہ گروہ جو بظاہر اپنے آپ کو باغی ظاہر کرتا ہے۔لیکن دراصل سماجی روایات کا غلام تھا۔جینی سمجھ گئی۔پھر اس نے کبھی ایسی باتین نہیں کیں۔ ہم دونوں میں ایک معاہدہ سا ہو گیا۔اگر چہ یہ معاہدہ زبان پر نہیں آیا۔لیکن طے ہو گیا کہ جب تک ایک دوسرے کے قریب ہیں۔پرانے دوستون کی طرح رہیں۔

میں نے تبادلے کے لئے کہا، تو مجھے دوسری جگہ بھیج دیا گیا۔ چلتے وقت جینی مجھے چھوڑنے آئی۔اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔پہلی مرتبہ میں نے اسے سب کے سامنے روتے ہوئے دیکھا۔بار بار وہ آنکھیں خشک کرتی، میں نے رومال مانگا۔ اس نے بالکل پہلی سی شوخی سے پوچھا، کہ رومال لے کر کیا کرو گے؟۔ میں نے کہا اسے یاد کے طور پر رکھوں گا۔

اور میرے آنسو کیوں کر خشک ہوں گے،،،،، اس نے گیلا رومال دیتے ہوئے کہا۔

چند مہینوں کے بعد میں نے سنا کہ اس نے شادی کر لی ہے۔

جو جواب میں نے اس کی مسکراہٹ سے مانگا تھا، وہ نہیں ملا، پھر یکلخت معلوم ہوا کہ موسیقی ختم ہو چکی ہے۔رقص ختم ہو چکا تھا۔لوگ کھانے کے لئے دوسرے کمرے میں جا رہے تھے۔میں اور جی بی بھی چلے گئے۔کچھ دیر کے بعد واپس آئے تو جینی جا چکی تھی۔اس کا خاوند بھی وہاں نہیں تھا۔

مجھے یونہی خیال سا آیا، کہ اس مرتبہ جینی سے بہت کم باتیں ہوئیں۔ میں اس سے دور دور رہا۔نہ اس سے کچھ پوچھا نہ بتایا۔اس سے رومال بھی نہیں مانگا۔

نہ جانے کیوں مین اس گوشے میں چلا گیا۔ جہاں جینی اور اس کا خاوند بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک مسلا ہوا رومال میز کے نیچے پڑا تھا۔ جو رقص کرتے ہوئے لوگوں کے قدموں تلے آچکا تھا۔

میں نے اسے اٹھالیا، جھاڑا، سلوٹیں دور کیں۔ جانی پہچانی خوشبو سے فضا معطر ہوگئی۔

یہ رومال یہاں کیسے آیا، جینی جان بوجھ کر میرے لئے چھوڑ گئی، یا یونہی اتفاق سے رہ گیا۔

دیر تک میں اس رومال ک و لیے وہیں کھڑا رہا۔ اس روندے ہوئے مسلے ہوئے سرخ دل کو دیکھتا رہا۔ جو اب تک خمار آگیں خوشبو میں بسا ہوا تھا۔

جینی کا دل،،،،،،،عورت کا دل۔

چٹان

افسانہ نگار : عصمت چغتائی

بھابھی بیاہ کر آئی تھی تو مشکل سے پندرہ برس کی ہوگی۔ بڑھوار بھی تو پوری نہیں ہوئی تھی، بھیا کی صورت سے ایسے لرزتی، جیسے قصائی سے گائے۔ مگر سال بھر کے اندر ہی وہ تو جیسے منھ بند کلی سے کھل کر پھول بن گئی۔ جسم بھر گیا، بال گھمیرے ہو گئے۔ آنکھوں میں ہرنوں جیسی وحشت دور ہو کر غرور اور شرارت بھر گئی۔

بھابھی ذرا آزاد قسم کے خاندان سے تھیں کانونیٹ میں تعلیم پائی تھی۔ پچھلے سال اس کی بڑی بہن ایک عیسائی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ اس لئے اس کے ماں باپ نے ڈر کر اسے کانونیٹ سے اٹھالیا۔ اور چٹ پٹ شادی کر دی۔

بھابھی آزاد فضا میں پلی تھی ہرنیوں جیسی قلانچیں بھرتی۔ مگر سسرال اور میکہ دونوں طرف سے اس پر کڑی نگرانی تھی۔ اور بھیا کی بھی یہی کوشش تھی کہ اگر جلدی سے اسے پکی گرہستن نہ بنا دیا گیا تو وہ بھی اپنی بڑی بہن کی طرح کوئی گل کھلائے گی۔ حالانکہ وہ شادی شدہ تھی۔ لیکن وہ اسے گھر گرہستن بنانے پر جٹ گئے۔

چار پانچ سال کے اندر بھابھی کو گھس گھسا کے واقعی ہی سب نے گھر ہستن بنا دیا۔ وہ تین بچوں کی ماں بن کر بھدی اور ٹھس ہوگئی۔ اماں اسے خوب مرغی کا شوربہ، گوند سٹورے کھلاتیں۔ بھیا ٹانک پلاتے۔ اور ہر بچے کے بعد وہ دس پندرہ پونڈ بڑھ جاتی۔

آہستہ آہستہ اس نے بننا سنورنا چھوڑ ہی دیا تھا۔ بھیا کو لپ اسٹک سے نفرت تھی، آنکھوں میں منوں کاجل اور مسکارا دیکھ کر وہ چڑ جاتے۔ بھیا کو بس گلابی رنگ

پسند تھا۔ یا پھر سرخ۔ بھابھی زیادہ تر سرخ یا گلابی کپڑے پہنا کرتی۔ گلابی ساڑھی پر سرخ بلاؤز یا کبھی گلابی کے ساتھ ہلکا گہرا گلابی۔

شادی کے وقت اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ مگر دلہن بناتے وقت ایسے تیل چپڑ کر باندھے تھے۔ کہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ وہ پرکٹی میم ہے۔ اب اس کے بال تو بڑھ گئے تھے۔ لیکن پے در پے بچے ہونے کی وجہ سے وہ ذرا سی گنجی سی ہوگئی تھی۔ ویسے بھی وہ بال باندھ کر میلی دھجی سی باندھ لیا کرتی تھی۔ اس کے میاں کو وہ میلی کچیلی ایسی ہی بڑی پیاری لگتی تھی۔ اور میکے سسرال والے بھی اس کی سادگی کو دیکھ کر اس کی تعریفوں کے گن گاتے۔ بھابھی تھی بڑی پیاری سی۔ تجل نقشہ، مکھن جیسی رنگت، سڈول ہاتھ پاؤں، مگر اس نے اس بری طرح اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا تھا، کہ خمیری آٹے کی طرح بہہ گئی تھی۔

بھیا اس سے نو برس بڑے تھے۔ مگر اس کے سامنے لونڈے سے لگتے تھے۔ ویسے ہی سڈول کسرتی بدن والے، روز ورزش کرتے، بڑی احتیاط سے کھانا کھاتے۔ بڑے حساب سے سگریٹ پیتے۔ یونہی کبھی وہسکی، بیر چکھ لیتے۔ ان کے چہرے پر اب بھی لڑکپن تھا۔ تھے بھی اکتیس برس کے۔ مگر چوبیس، پچیس برس ہی کے لگتے تھے۔

اف بھیا کو جین اور اسکرٹ سے کتنی نفرت تھی۔ انھیں یہ نئے فیشن کی بے آستینوں کی بدن پر چپکی ہوئی قمیض سے بھی بڑی گھن آتی تھی۔ تنگ موری کی شلواروں سے ایسے جلتے تھے کہ توبہ۔ خیر بھابھی بے چاری تو شلوار قمیض کے قابل رہ ہی نہیں گئی تھی۔ وہ تو بس بلاوز پیٹی کوٹ پر گاؤن چڑھائے گھوما کرتی۔ کوئی جان پہچان کا آجاتا تو بھی بے تکلفی سے وہی اپنا نیشنل ڈریس پہنے رہتی۔ کوئی پر تکلف مہمان آتا تو وہ اندر ہی بچوں سے سر مارا کرتی۔ جو کبھی باہر آنا پڑتا تو ملگجی سی ساڑھی لپیٹ لیتی۔ وہ گرہستن تھی، ماں تھی، بہو تھی اور چہیتی تھی۔

اسے رنڈیوں کی طرح بن سنور کر کسی کو لبھانے کی کیا ضرورت تھی۔

اور شاید بھابھی یونہی گودڑ بنی ادھیڑ اور پھر بوڑھی ہو جاتیں۔ بہوئیں بیاہ کر لاتیں جو صبح اٹھ کر اسے جھک کر سلام کرتیں۔ گود میں پوتا کھلانے کو دیتیں۔ مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

شام کا وقت تھا۔ ہم سب لان میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ بھابھی پاپڑ تلنے باورچی خانے میں گئی تھیں۔ باورچی نے پاپڑ لا کر دیے۔ بھیا کو بادامی پاپڑ بھاتے تھے۔ انھوں نے پیار سے بھائی کی طرف دیکھا اور جھٹ سے اٹھ کر پاپڑ تلنے چلی گئیں۔ ہم لوگ مزے سے چائے پیتے رہے۔ ہائے بھابھی تھی کہ کوئی فرشتہ۔ میں تو کالج سے آ کر باورچی خانے میں جانے پر مجبور ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور نہ ہی میرا شام کا پر تکلف لباس باورچی خانے کے لئے موزوں تھا۔ اس کے علاوہ مجھے پاپڑ تلنے کب آتے تھے۔ دوسری بہنیں بھی اسی قطار میں کھڑی تھیں۔ فریدہ کا منگیتر آیا ہوا تھا۔ وہ اس کی طرف جٹی ہوئی تھی۔ رضیہ اور شمیم اپنے دوستوں کے ساتھ گپیں لگانے میں مصروف تھیں۔ وہ کیا پاپڑ تلتیں۔ اور ہم سب تو بابل کے آنگن چڑیاں تھیں۔ اور اڑنے کے لئے تیار تھیں۔

دھائیں سے فٹ بال آ کر عین بھیا کی پیالی پر پڑی۔ ہم سب اچھل پڑے بھیا مارے غصے کے بھنا اٹھے۔

''کون پاجی ہے؟'' انھوں نے جدھر سے گیند آئی تھی، ادھر دیکھ کر ڈانٹا۔

بکھرے ہوئے بالوں کا گول مول سر اور بڑی بڑی آنکھیں اوپر سے جھانکیں۔

اور ایک زقند میں بھیا منڈیر پر تھے۔ اور مجرم کے بال ان کی گرفت میں۔

اوہ! ایک چیخ نکلی۔ اور دوسرے لمحے بھیا ایسے اچھل کر الگ ہوئے، جیسے انہوں نے بچھو کے ڈنک پر ہاتھ مار دیا ہو۔ یا انگارہ پکڑ لیا ہو۔

سوری،،، آئی ایم ویری سوری۔۔۔۔ وہ ہکلا رہے تھے۔ ہم سب دوڑ کر

گئے۔ دیکھا تو منڈیر کے اس طرف ایک دبلی پتلی ناگن سی لڑکی سفید ڈرین پائپ اور نیوی کلر کا سلیولیس بلاوز پہنے کھڑی تھی۔ اپنے میرلین منرو کی طرح کٹے ہوئے بالوں پر پتلی، پتلی انگلیاں پھیر کر کھسیانی ہنسی ہنس رہی تھی۔ اور پھر ہم سب ہنس پڑے۔

بھابھی پاپڑوں کی پلیٹ لیے اندر سے نکلی، اور بغیر پوچھے گچھے یہ سمجھ کر ہنسنے لگی۔ کہ ضرور کوئی ہنسی کی بات ہوئی ہوگی۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا پیٹ ہنسنے میں پھدکنے لگا۔ اور جب اسے معلوم ہوا کہ بھیا نے اسے لونڈا سمجھ کر اس کے بال پکڑ لیے، تو وہ اور بھی زور، زور سے قہقہے لگانے لگی۔ کہ کئی پاپڑ کے ٹکڑے گھاس پر بکھر گئے۔ شبنم نے بتایا کہ وہ اسی دن اپنے چچا خالد جمیل کے ہاں آئی ہے۔ اکیلے جی گھبرایا تو وہ فٹ بال ہی لڑھکانے لگی۔ جو قسمت سے بھیا جی کی پیالی پر آن کودی۔

شبنم بھیا کو اپنی تیز مسکراتی آنکھوں سے گھور رہی تھی۔ بھیا مسحور سناٹے مین اسے تک رہے تھے۔ ایک کرنٹ ان دونوں کے درمیان دوڑ رہا تھا۔ بھابھی اس کرنٹ سے کٹی ہوئی جیسے کوسوں دور کھڑی تھی۔ اس کا پھدکتا ہوا پیٹ سہم کر رک گیا۔ ہنسی نے اس کے ہونٹوں پر لڑکھڑا کر دم توڑ دیا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ہو گئے۔ پلیٹ ٹیڑھی ہو کر پاپڑ گھاس پر گرنے لگے۔ پھر ایک دم وہ دونوں جاگ پڑے۔ اور خوابوں کی دنیا سے لوٹ آئے۔

شبنم بھاگ کر منڈیر پر چڑھ گئی۔

آیئے چائے پی لیجیے۔ میں نے ٹھہری ہوئی فضا کو دھکا دے کر آگے کھسکایا۔

ایک لچک کے ساتھ شبنم نے اپنے پیر منڈیر کے اس پار سے اس طرف کر لیے۔

سفید چھوٹے چھوٹے مکاسن ہری گھاس پر فاختہ کے جوڑے کی طرح ٹھمکنے لگے۔ شبنم کا رنگ پگھلے ہوئے سونے کی طرح تھا۔ اس کے بال سیاہ بھونرا تھے۔ مگر

آنکھیں جیسے کسی نے سیاہ کٹوریوں میں شہد بھر دیا ہو۔نیبو رنگ کے بلاوز کا گلا بہت گہرا تھا۔ ہونٹ تربوزی رنگ کے اور اسی رنگ کی نیل پالش لگائے وہ بالکل کسی امریکی اشتہار کی ماڈل لگ رہی تھی ۔ بھابھی سے کوئی فٹ بھر لانبی لگ رہی تھی ۔ حالانکہ مشکل سے دو انچ اونچی ہوگی۔اس کی ہڈی بڑی نازک تھی، اس لیے کمر تو ایسی کہ چھلے میں پرو لو۔

بھیا کچھ گم سم سے بیٹھے تھے۔ بھابھی انہیں ایسے تاک رہی تھیں، جیسے بلی پر تولتے ہوئے پرندے کو گھورتی ہے، کہ جیسے ہی پر پھڑ پھڑائے، بڑھ کر دبوچ لے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔نتھنے پھڑ پھڑا رہے تھے۔

اتنے میں منا آ کر اس کی پیٹھ پر دھم سے کودا۔وہ ہمیشہ اس کی پیٹھ پر ایسے کودا کرتا تھا۔جیسے وہ کوئی گدگدا سا تکیہ ہو۔ بھابھی ہمیشہ ہنس دیا کرتی تھیں۔مگر اس نے چٹاخ چٹاخ دو چانٹے جڑ دیے۔

شبنم پریشان ہوگئی۔

ارے۔ارے۔روکیے نا'' اس نے بھیا کا ہاتھ چھو کر کہا۔

بڑی غصہ ور ہیں آپ کی ممی۔اس نے میری طرف منھ پھیر کر کہا۔

انٹروڈکشن ہماری سوسائیٹی میں بہت کم ہوا کرتا ہے۔اور پھر بھابھی کا کسی سے انٹروڈکشن

کرانا عجیب سا لگتا تھا۔وہ تو صورت سے ہی گھر کی بہو لگتی تھی۔شبنم کی بات پر ہم سب قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ بھابھی منے کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی اندر چلی گئی۔

ارے یہ تو ہماری بھابھی ہیں۔ میں نے بھابھی کو دھم دھم جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

بھابھی شبنم حیرت زدہ ہو کر بولی۔

’’ان کی بھیا کی بیوی‘‘

اوراس نے سنجیدگی سے نظریں جھکالیں۔

میں ۔۔۔میں سمجھی ۔اس نے بات ادھوری چھوڑ دی

بھابھی کی عمرتیس سال ہے۔میں نے وضاحت کی،

مگرڈمنٹ بی سلی ۔۔۔شبنم ہنسی ۔۔۔بھیا بھی اٹھ کر چل دیے،

خدا کی قسم۔

اوہ جہالت ۔‘‘

’’نہیں بھابھی نے مارٹیز سے پندرہ سال کی عمر میں سینئر کیمرج کیا تھا۔

’’تمہارا مطلب ہے یہ مجھ سے تین سال چھوٹی ہیں۔

میں چھبیس سال کی ہوں۔

تب تو قطعی چھوٹی ہیں۔

اف اور میں سمجھی تمہاری امی ہیں۔دراصل میری آنکھیں ذرا کمزور ہیں۔مگر مجھے عینک سے نفرت ہے۔برا لگا ہوگا انہیں۔

نہیں بھابھی کو کچھ برا نہیں لگتا۔

چہ،،، بے چاری۔

کون بھابھی نا،، جانے میں نے کیوں کہا؟

’’بھیا اپنی بیوی پر جان دیتے ہیں۔صفیہ نے بطور وکیل کہا۔

بے چارے کی بہت بچپن میں شادی کر دی گئی ہوگی۔

’’پچیس چھبیس سال کے تھے‘‘

مگر مجھے تو معلوم بھی نہیں تھا، کہ بیسویں صدی میں بغیر دیکھے شادیاں ہوتی ہیں۔شبنم نے حقارت سے مسکرا کر کہا۔

’’تمہارا ہر اندازہ غلط نکل رہا ہے۔۔۔بھیا نے بھابھی کو دیکھ کر پسند کیا تھا۔

تب شادی ہوئی تھی۔ مگر جب وہ کنول کے پھول جیسی نازک اور حسین ہوتی تھی۔

''پھر یہ کیا ہو گیا شادی کے بعد؟

''ہوتا کیا،، بھابھی اپنے گھر کی ملکہ ہیں۔ بچوں کی ماں ہیں۔ کوئی فلم ایکٹریس تو ہیں نہیں۔ دوسرے بھیا کو سوکھی ماری لڑکیوں سے گھن آتی ہے۔

میں نے جان کر شبنم پر چوٹ کی وہ بے وقوف نہیں تھی۔

بھئی چاہے کوئی مجھ سے پیار کرے یا نہ کرے۔ میں تو کسی کو خوش کرنے کے لئے ہاتھی کا بچہ کبھی نہ بنوں۔۔۔۔ اوہ معاف کرنا تمہاری بھابھی کبھی بہت خوبصورت ہوں گی۔ مگر اب تو،،،،

اوں'' آپ کا نظریہ بھیا سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے بات ٹال دی۔ اور جب وہ بل کھاتی سیدھی سڈول ٹانگوں کو آگے پیچھے جھلاتی ننھے ننھے قدم رکھتی منڈیر کی طرف جا رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں کھڑے تھے۔ ان کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔ اور بار بار اپنی گدی سہلا رہے تھے۔ جیسے وہاں کسی نے آگ رکھ دی ہو۔ چڑیا کی طرح پھدک کر وہ منڈیر پھلانگ گئی۔ پل بھر رکو پلٹ کر اس نے اپنی شربتی آنکھوں سے بھیا کو تولا۔ اور چھلاوہ کی طرح کوٹھی میں غائب ہو گئی۔

بھابھی لان پر جھکی پیالیاں سمیٹ رہی تھی۔ مگر اس نے ایک نظر نہ آنے والا تار دیکھ لیا تھا۔ جو بھیا جی اور شبنم کی آنکھوں میں دوڑ رہا تھا۔

ایک دن میں ن یکھڑ کی میں سے دیکھا۔ شبنمپھولا ہوا لال اسکرٹ اور سفید کھلے گلے کا بلاوز پہنے پپو کے ساتھ سمبا ناچ رہی تھی۔ اس کا ننھا سا پکنیر کتا ٹانگوں میں الجھ رہا تھا۔ وہ اونچے، اونچے قہقہے لگا رہی تھی۔ اس کی سڈول سانولی ٹانگیں ہری ہری گھاس پر تھرک رہی تھیں۔ سیاہ ریشمی بال ہوا میں چھلک رہے تھے۔ پانچ سال کا پپو بندر کی طرح پھدک رہا تھا۔ مگر وہ نشیلی ناگن کی طرح لہرا رہی تھی۔ اس نے ناچتے ناچتے ناک پر انگوٹھا رکھ کر مجھے چڑایا۔ مین نے جواب میں گھونسا دکھایا، مگر فوراً

ہی مجھے اس کی نگاہوں کا پیچھا کر کے معلوم ہوا کہ وہ یہ اشارہ میری طرف نہیں کر رہی تھی۔ بھیا برآمدے میں کھڑے احمقوں کی طرح گدی سہلا رہے تھے۔ اور وہ انہیں منہ چڑا کر جلا رہی تھی۔ اس کی کمر میں بل پڑ رہے تھے، کولھے مٹک رہے تھے۔ باہیں تھرتھرا رہی تھیں۔ ہونٹ ایک دوسرے سے جدا لرز رہے تھے۔ اس نے سانپ کی طرح لپ سے زبان نکال کر اپنے ہونٹ کو چاٹا۔ بھیا کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اور وہ کھڑے دانت نکال رہے تھے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ بھابھی گودام سے اناج نکلوا کر باورچی کو دے رہی تھیں۔

"شبنم کی بچی۔۔۔ میں نے دل میں سوچا مگر غصہ مجھے بھیا پر بھی آیا۔ انہیں دانت نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ انہیں تو شبنم جیسی لڑکیوں سے نفرت تھی، انھیں تو انگریزی ناچوں سے گھن آتی تھی۔ پھر وہ کیوں کھڑے اسے تک رہے تھے، اور ایسی بھی کیا بے سدھی کہ ان کا جسم سمبا کی تال پر لرز رہا تھا۔ اور انھیں خبر نہ تھی۔

اتنے میں بوائے چائے کی ٹرے لیے لان میں آ گیا۔۔۔ بھیا نے ہم سب کو آواز دی اور بوائے سے کہا بھابھی کو بھیج دے۔

رسماً شبنم کو بھی بلاوا دینا پڑا۔ میرا تو جی چاہ رہا تھا کہ قطعی اس کی طرف سے منہ پھیر کر بیٹھ جاؤں،

مگر جب وہ منے کو پڑھی پر چڑھائے منڈیر پر پھیلا نگ کر آئی تو وہ مجھے قطعی معصوم لگی۔ منا اس کا سکارف لگاموں کی طرح تھامے ہوئے تھا۔ اور وہ گھوڑے کی چال اچھلتی لان پر دوڑ رہی تھی۔ بھیا نے منے کو اس کی پیٹھ سے اتارنا چاہا۔ مگر وہ چمٹ گیا،

"ابھی اور گھوڑا چلے آنٹی۔"

"نہیں بابا،،،، آنٹی میں دم نہیں،،،، شبنم چلائی۔ بڑی مشکل سے بھیا نے منے کو اتارا۔ منھ پر ایک چانٹا لگایا۔ ایک دم تڑپ کر شبنم نے اسے گود اٹھا لیا۔ اور بھیا

کے ہاتھ پر زور کا تھپڑ لگایا۔

شرم نہیں آتی،،،،، اتنے بڑے اونٹ کے اونٹ ذرا سے بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہیں۔ بھابھی کو آتے دیکھ کر اس نے منے کو ان کی گود میں دے دیا۔ اس کا چانٹا کھا کر بھیا مسکرا رہے تھے۔

"دیکھیے تو کتنی زور سے تھپڑ مارا ہے۔ میرے بچے کو کوئی مارتا تو ہاتھ توڑ کر رکھ دیتی۔ اس نے شربت کی کٹوریوں میں زہر بھر کر بھیا کو دیکھا۔ اور پھر ہنس رہے ہیں بے حیا،،،

ہوں،،،،، دم بھی ہے،،،، جو ہاتھ توڑ دو گی۔ ۔ ۔ بھیا نے اس کی کلائی مروڑی،، وہ بل کھا کر اتنے زور سے چیخی کہ بھی انے لرز کر اسے چھوڑ دیا۔ اور وہ ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ چائے کر دوران بھی شبنم کی شرارتیں چلتی رہیں۔ وہ بالکل کم سن چھکریوں کی طرح چہلیں کر رہی تھی۔ بھابھی گم سم بیٹھی تھی۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے، کہ شبنم کے وجود سے ڈر کر انہوں نے اپنی طرف تو جہ دینی شروع کر دی ہو گی۔ جی نہیں۔ وہ تو پہلے سے بھی زیادہ میلی رہنے لگیں۔ پہلے سے بھی زیادہ ڈٹ کر کھاتیں۔ ہم سب تو ہنس زیادہ رہے تھے لیکن وہ سے جھکائے نہایت انہماک سے کیک اڑانے مین مصروف تھیں۔ چٹنی لگا لگا کر بھجے نگل رہی تھیں۔ سکے ہوئے توسوں پر ڈھیر سا مکھن اور جیلی تھوپ تھوپ کر کھائے جا رہی تھیں۔ بھیا اور شبنم کو دیکھ دیکھ کر ہم سب ہی پریشان ہو گئے تھے۔ اور شاید بھابھی بھی فکر مند ہوں گی مگر وہ اپنی پریشانی کو مرغن کھانوں مین دفن کر رہی تھیں۔ انہیں ہر وقت کھٹی ڈکاریں آیا کرتیں، مگر وہ چورن کھا کھا کر پلاؤ قورمہ ہضم کرتیں۔ وہ سہمی سہمی نظروں سے شبنم اور بھیا جی کو ہنستا بولتا دیکھتیں۔ بھیا تو کچھ اور بھی لونڈے سے لگنے لگ گئے تھے۔ شبنم کے ساتھ وہ صبح شام سمندر میں نہا رہے تھے۔ شبنم ننھی ننھی دو دھجیاں پہنے ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی۔ اتنے میں بھابھی جو دیر سے منے کو پکار رہی تھیں آ

گئیں۔ بھیا شرارت کے موڈ میں تو تھے ہی بھاگ کر انہیں پکڑ لیا۔اور ہم سب نے مل کر انہیں پانی میں گھسیٹ لیا۔ جب سے شبنم آئی تھی بھیا بہت شریر ہو گئے تھے۔ ایک دم سے وہ دانت کچکچا کر بھابھی کو ہم سب کے سامنے بھینچ لیتے۔انھیں گود میں اٹھانے کی کوشش کرتے،مگر وہ ان کے ہاتھ سے بونیل مچھلی کی طرح پھسل جاتیں۔ پھر وہ کھسیا کر رہ جاتے۔تخیل مین ہو شبنم ہی کو اٹھا رہے ہوتے۔اور بھابھی کٹی گائے کی طرح نادم ہو کر فوراً پڈنگ یا کوئی اور مزے دار ڈش تیار کرنے چلی جاتیں،اس وقت جو انہیں پانی میں دھکیلا،تو گٹھڑی کی طرح پانی مین لڑھک گئیں۔ان کے کپڑے جسم پر چپک گئے اور ان کے جسم کا سارا بھونڈا پن بھیانک طریقے پر ابھر آیا۔کمر جیسے کسی نے توشک لپیٹ دی تھی۔کپڑوں میں وہ اتنی بھیانک معلوم نہیں ہو تی تھیں۔

افوہ! کتنی موٹی ہو گئی ہو تم۔بھیا نے ان کے کولھے کا بوٹا پکڑ کر کہا۔"اف تو ند تو دیکھو بالکل گاما پہلوان معلوم ہو رہی ہو۔

ہنہ چار بچے ہونے کے بعد کمر،،،،،

میرے بھی تو چار بچے ہیں۔میری کمر تو ڈنلوپلو کا گدا نہیں بنی۔انہوں نے اپنے سڈول جسم کو ٹھوک بجا کر کہا،اور بھابھی منہ تھوتھائے بھیگی مرغی کی طرح ریت میں گہرے گہرے گڈے بناتی مینے کو گھسیٹتی چلی گئی۔بھیا بالکل بے توجہ ہو کر شبنم کو پانی میں ڈبکیاں دینے لگے۔مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ایسا اڑنگا لگایا کہ غڑاپ سے اوندھے منہ گر پڑے۔

جب نہا کر آئے تو بھابھی سر جھکائے خوبانیوں کے مربے پر کریم کی تہہ جما رہی تھیں۔ان کے ہونٹ سفید ہو رہے تھے۔اور آنکھیں سرخ تھیں۔گٹا پارچہ کی گڑیا جیسے موٹے گال کچھ اور سوجے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

لنچ پر بھابھی انتہائی غمگین تھیں۔لہٰذا بڑی تیزی سے خوبانیوں کا مربہ اور کریم

کھانے پر جتی ہوئی تھیں۔ شبنم نے ڈش کی طرف دیکھ کر ایسے پھریری لی، جیسے خوبانیاں نہ ہوں، سانپ بچھو ہوں۔

''زہر ہے، زہر، اس نے نفاست سے ککڑی کا ٹکرا توڑتے ہوئے کہا، مگر وہ شپا شپ مربہ اڑاتی رہیں۔

حد ہے انہوں نے نتھنے پھڑکا کر کہا۔

بھابھی نے کوئی دھیان نہ دیا اور قریب قریب پوری ڈش پیٹ میں انڈیل دی۔ انہیں مربہ سپوڑتے ہوئے دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے وہ رشک وحسد کے طوفان کو روکنے کے لئے بند باندھ رہی ہوں۔ یہ چربی چٹانوں کی صورت میں ان کے جسم کے قلعے کو نا قابل تسخیر بنا دے گی۔ پھر شائد دل میں یوں ٹیسیں نہ اٹھیں گی۔ بھیا جی اور شبنم کی آنکھوں کے

ٹکراؤ سے بھڑکنے والے شعلے ان پتھریلی دیواروں کو نہ پگھلا سکیں گے۔

''خدا کے لئے بس کرو۔۔۔ڈاکٹر بھی منع کر چکا ہے۔ ایسا بھی کیا چٹورپن۔'' بھیا نے کہہ ہی دیا۔ موم کی دیوار کی طرح بھابھی پگھل گئیں۔ بھیا کا نشتر چربی کی دیواروں کو کاٹتا ہوا ٹھیک دل میں اتر گیا۔

موٹے موٹے آنسو بھابھی کے پھولے گالوں پر پھسل پڑے۔ سسکیوں نے جسم کے ڈھیر میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ دبلی پتلی نازک لڑکیاں لطیف اور سہانے انداز میں روتی ہیں۔ مگر بھابھی کو روتے دیکھ کر بجائے دکھ کے ہنسی آتی تھی۔ جیسے کوئی روئی کے بھیگے ڈھیر کو ڈنڈوں سے پیٹ رہا ہو۔

وہ ناک پونچھتی اٹھنے لگی۔ لیکن ہم لوگوں نے بٹھا لیا۔ اور بھیا کو ڈانٹا۔ بے چاری ناک سڑکاتی بیٹھ گئی۔ مگر جب انہوں نے کافی مین تین چمچ شکر ڈال کر کریم کی طرف ہاتھ بڑھایا، تو ایک دم ٹھٹھک گئیں۔ سہمی ہوئی نظروں سے شبنم اور بھیا کی طرف دیکھا۔ شبنم بمشکل اپنی ہنسی روکے ہوئے تھی۔ بھیا مارے غصے کر روہانسے ہو

رہے تھے۔ وہ ایک دم بھنا کر اٹھے اور برامدے میں جا کر بیٹھ گئے۔

اس کے بعد حالات اور بگڑے۔ بھابھی نے کھلم کھلا اعلان جنگ کر دیا۔ کسی زمانے میں بھابھی کا پٹھانی خون بہت گرم تھا، ذرا سی بات پر ہاتھا پائی پر اتر آیا کرتی تھی، اور بار ہا بھیا سے غصہ ہو کر منہ پھلانے کی بجائے وہ خونخوار بلی کی طرح ان پر جھپٹتی، ان کا منہ کھسوٹ ڈالتیں۔ دانتوں سے گریبان کی دھجیاں اڑا دیتیں۔ پھر بھیا انہیں اپنی ہی باہوں مین جکڑ کر بے بس کر دیتے۔ اور وہ ان کے سینے سے لگ کر پیاسی ڈری ہوئی چڑیا کی طرح پھوٹ پھوٹ

کر رونے لگتیں۔ پھر ملاپ ہو جاتا۔ اور جھینپتی کھسیاتی وہ بھیا کے منہ پر لگے ہوئے کھرونچوں پر پیار سے ٹنکچر لگا دیتیں۔ ان کے گریبان کو رفو کرتیں

اور میٹھی میٹھی شکر گزار آنکھوں سے تکتی رہتیں،

یہ تب کی بات ہے جب بھابھی ہلکی پھلکی تیتری کی طرح طرار تھیں، لرتی ہوئی چھوٹی سی شیمی بلی معلوم ہوتی تھیں۔ بھیا کو ان پر غصہ آنے کی بجائے اور شدت سے پیار آتا۔ مگر جب سے ان پر گوشت نے ہلہ بول دیا تھا۔ وہ بہت ٹھنڈی پڑ گئی تھیں۔ انھیں اول تو غصہ ہی نہ آتا اور اگر آتا بھی تو فوراً ادھر ادھر کے کاموں میں لگ کر بھول جاتیں۔

اس دن انھوں نے اپنے بھاری بھرکم ڈیل کو بھول کر بھیا پر حملہ کر دیا۔ بھیا صرف ان کے بوجھ سے دھکا کھا کر دیوار سے جا چپکے۔ روئی کے گٹھر کو یوں لڑھکتے دیکھ کر انہیں سخت گن آئی۔ نہ غصہ ہوئے نہ بگڑے۔ شرمندہ اداس سر جھکائے کمرے سے نکل بھاگے، بھابھی وہیں پسر کر رونے لگیں۔

بات اور بڑھی، اور ایک دن بھیا کے سالے آکر بھابھی کو لے گئے۔ طفیل بھابھی کے چچا زاد بھائی تھے۔ انھیں دیکھ کر وہ بچوں کی طرح ان سے لپٹ کر رونے لگیں۔ انھوں نے بھابھی کو ننھی بچی کی طرح سینے سے لگالیا۔ بھیا اس وقت شبنم کے

ساتھ کرکٹ کا میچ دیکھنے گئے ہوئے تھے۔ طفیل بھائی نے شام تک ان کا انتظار کیا۔ وہ نہ آئے تو مجبوراً بھابھی اور بچوں کا سامان تیار کیا گیا۔

جانے سے پہلے بھیا گھڑی بھر کو کھڑے کھڑے آئے۔

''دہلی کے مکان میں نے ان کے مہر میں دیے۔ انھوں نے رکھائی سے طفیل سے کہا۔

مہر؟ بھابھی تھر تھر کانپنے لگیں۔

''ہاں طلاق کے کاغذات وکیل کے ذریعے پہنچ جائیں گے۔

''مگر طلاق،،، طلاق کا کیا ذکر ہے؟''

''اسی میں بہتری ہے۔''

''مگر بچے''

''یہ چاہیں تو انہیں لے جائیں،،،،، ورنہ میں نے بورڈنگ میں انتظام کر لیا ہے۔

ایک چیخ مار کر بھابھی بھیا پر جھپٹیں،،،، مگر انہیں کھسوٹنے کی ہمت نہ پڑی، سہم کر ٹھٹک گئیں۔

اور پھر بھابھی نے اپنی نسوانیت کی پوری طرح بے آبروئی کر ڈالی۔ وہ بھیا کے پیروں پر لوٹ گئیں۔ ناک رگڑ ڈالی۔

''تم اس سے شادی کر لو میں کچھ نہ کہوں گی۔ خدا کے لئے مجھے طلاق نہ دو۔ میں یونہی زندگی گزار دوں گی۔ مجھے شکایت نہ ہوگی۔

مگر بھیا نے نفرت سے بھابھی کے تھل تھل کرتے جسم کو دیکھا، اور منھ موڑ لیا۔

''میں طلاق دے چکا ہوں،،،،، اب کیا ہو سکتا ہے؟

مگر بھابھی کو کون سمجھاتا۔ وہ بلبلائے چلی گئیں۔

بے وقوف،،،، طفیل نے ایک ہی جھٹکے سے بھابھی کو زمین سے اٹھا لیا۔ ''گدھی

کہیں کی، چل اٹھ۔ اور وہ اسے گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔

کیا دردناک سماں تھا، بچے پھوٹ پھوٹ کر رونے میں بھابھی کا ساتھ دے رہے تھے۔ اماں خاموش ایک ایک کا منھ تک رہی تھیں۔ ابا کی موت کے بعد ان کی گھر میں کوئی حیثیت نہیں رہ گئی تھی۔ بھیا خود مختار تھے بلکہ ہم سب کے سرپرست تھے۔ اماں انہیں بہت سمجھا کر ہار چکی تھیں۔ انھیں اس دن کی اچھی طرح خبر تھی۔ مگر کیا کرسکتی تھیں۔

بھابھی چلی گئیں،،،، فضا ایسی خراب ہوگئی تھی کہ بھیا اور شبنم بھی شادی کے بعد ہل اسٹیشن چلے گئے۔

سات آٹھ سال گزر گئے۔ کچھ کم و بیش ٹھیک یاد نہیں۔ ہم سب اپنے اپنے گھروں کی ہوئیں۔ اماں کا انتقال ہوگیا۔ ابا کی موت کے بعد وہ بالکل گم سم ہوکر رہ گئی تھیں۔ انھوں نے بھابھی کی طلاق پر بہت رونا پیٹنا مچایا، مگر وہ بھیا کے مزاج سے واقف تھیں۔ وہ کبھی ابا کی بھی نہیں سنتے تھے، کماؤ پوت اپنا آپ مالک ہوتا ہے۔

آشیانہ اجڑ گیا۔ بھرا پرا گھر سنسان ہوگیا۔ سب ادھر، ادھر اڑ گئے۔ سات آٹھ سال پلک جھپکتے نہ جانے کہاں گم ہو گئے۔ کبھی سال دو سال میں بھیا کی کوئی خیر خبر مل جاتی۔ وہ زیادہ تر ہندوستان سے باہر ملکوں کی چک پھیریوں میں رہے۔ مگر جب ان کا خط آیا کہ وہ بمبئی آرہے ہیں تو بھولا بسرا بچپن پھر سے جاگ اٹھا۔ بھیا جی ترین سے اترے تو ہم بچوں کی طرح ان سے لپٹ گئے۔ شبنم مجھے کہیں نظر نہ آئی، ان کا سامان اتر رہا تھا۔ جیسے ہی بھیا سے اس کی خیریت پوچھنے کو مڑی، دھپ سے ایک وزنی ہاتھ میری پیٹھ پر پڑا، اور کئی من گوشت کا گرم گرم پہاڑ مجھ سے لپٹ گیا۔

بھابھی میں نے پلیٹ فارم سے نیچے گرنے سے بچنے کے لئے کھڑکی میں جھول کر کہا۔ زندگی میں مین نے شبنم کو کبھی بھابھی نہیں کہا تھا۔ وہ لگتی بھی تو شبنم ہی تھی۔ مگر

آج میرے منھ سے بے اختیار بھابھی نکل گیا۔ شبنم کی پھوار،،،، ان چند سالوں میں گوشت کا تودا کیسے بن گئی۔؟ میں نے بھیا کی طرف دیکھا۔ وہ ایسے ہی دراز قد اور چھریرے تھے، ایک تولہ گوشت ادھر نہ اُدھر۔ وہی کم سن لڑکوں جیسے بال۔ جس دو چار سفید چاندی کے تار کنپٹیوں سے جھانکنے لگے تھے۔ جن سے وہ اور بھی حسین اور پر وقار معلوم ہونے لگے تھے، ویسے کے ویسے چٹان کی طرح جمے ہوئے تھے۔ لہریں تڑپ تڑپ کر چٹان کی اور لپکتی ہیں۔ اپنا سر اس کے قدموں میں دے مارتی ہیں۔ پاش پاش ہو کر بکھر جاتی ہیں۔

ہار تھک کر واپس ہو جاتی ہیں۔ کچھ وہیں اس کے قدموں پر دم توڑ دیتی ہیں۔ اور نئی لہریں پھر سرفروشی کے ارادے سمیٹے چٹان کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اور چٹان؟،،،،، ان سجدوں سے دور،،، طنز سے مسکراتا رہتا ہے۔ اٹل، لا پرواہ اور بے رحم، جب بھیا نے شبنم سے شادی کی تو سب ہی نے کہا شبنم آزاد لڑکی ہے پکی عمر کی ہے۔۔۔۔۔ بھابھی،،،، توبہ،،،، میں نے شہناز کو ہمیشہ بھابھی ہی کہا۔ ہاں تو شہناز بھولی اور کم سن تھی، بھیا کے قابو میں آگئی۔ یہ ناگن اسے ڈس کر بے سدھ کر دے گی۔ انھیں مزہ چکھائے گی۔

مگر مزہ تو لہروں کو صرف چٹان ہی سکھا سکتا ہے۔

"بچے بورڈنگ میں ہیں، چھٹی نہیں تھی ان کی،" شبنم نے کھٹی ڈکاروں بھری سانس میری گردن پر چھوڑ کر کہا۔ اور میں حیرت سے اس گوشت کے ڈھیر میں اس شبنم کی پھوار کو ڈھونڈ رہی تھی، جس نے شہناز کے پیار کی آگ کو بجھا کر بھیا کے کلیجے میں نئی آگ بھڑکا دی تھی۔ مگر یہ کیا؟ بجائے اس آگ میں بھسم ہو جانے کے بھیا تو اور بھی سونے کی طرح تپ کر نکھر آئے تھے۔ آگ خود اپنی تپش میں بھسم ہو کر راکھ کا ڈھیر بن چکی تھی۔ بھابھی تو مکھن کا ڈھیر تھی۔ مگر شبنم تو جھلسی ہوئی مٹیالی راکھ تھی۔ اس کا سانولا کندنی رنگ چھپکلی کے پیٹ کی طرح اور زرد ہو چکا تھا۔ وہ

شربت گھلی ہوئی آنکھیں گدلی اور بے رونق ہو چکی تھیں۔ پتلی ناگن جیسی لچکتی ہوئی کمر کا کہیں دور دور تک پتا نہ تھا۔ وہ مستقل طور پر حاملہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ نازک، نازک چمکیلی شاخوں جیسی بانہیں مکدر کی طرح گاؤدم ہوگئی تھیں۔ اس کے چہرے پر پہلے سے زیادہ پوڈر تھپا ہوا تھا۔ آنکھیں مسکارا سے لتھڑی ہوئی تھیں۔ بھنویں شاید غلطی سے زیادہ نچ گئی تھیں۔ جبھی اتنی گہری پنسل گھسنا پڑی تھی۔

بھیا رٹز میں ٹھہرے، ہم بھی وہیں پہنچ گئے۔

کیبرے اپنے پورے عروج پر تھا۔ مصری حسینہ اپنے چھاتی جیسے پیٹ کو مروڑیاں دے رہی تھی۔ اس کے کولھے دائرے میں لچک رہے تھے۔

پس ماندگان

افسانہ نگار : انتظار حسین

ہاشم اٹھائیس برس کا کڑیل جوان، لمبا، تڑنگا، سرخ و سفید جسم آن کی آن میں چٹ پٹ ہو گیا، کم بخت مرض بھی اندھی دیاندی آیا۔ صبح ہلکی ہلکی حرارت تھی، شام ہوتے ہوتے بخار تیز ہو گیا، صبح جب ڈاکٹر آیا تو پتہ چلا کہ سرسام ہو گیا ہے۔ غریب ماں باپ نے اپنی سی سب کچھ کر ڈالی۔ دن بھر میں ڈاکٹروں سے لے کر پیروں فقیروں تک سب کے دروازے کھٹکھٹائے۔ لیکن نہ دوا دارو نے اثر کیا نہ تعویذ گنڈے کام آئے۔ پہر رات ہوئی پھر طبیعت بگڑ گئی تھی۔ اور ایسی بگڑی کہ صبح پکڑنی دشوار ہو گئی۔ ماں باپ نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی، اور بلک بلک کر دعا مانگی۔ کہ کسی طرح صبح ہو جائے۔ ان کی دعا قبول ہوئی تو سہی، مگر ادھر صبح کا گجر بجا۔ ادھر مریض نے پٹ سے دم دے دیا۔ آناً فاناً مرنے والوں کی خبر بھی آناً فاناً پھیلتی ہے۔

سارے محلے میں ملکہ پڑ گیا، جس نے سنا سناٹے میں آ گیا۔ حلیمہ بوا کے گھر یہ خبر بنو نے پہنچائی تھی۔

دہلیز میں قدم رکھتے ہی بولی، ''اجی حلیمہ بوا قہر ہو گیا۔ ہاشم ختم ہو گیا، حلیمہ بوا کے منہ سے بے ساختہ نکلا ہئے، ہئے،، حلیمہ بوا اس وقت چولھے پر بیٹھی بچوں کے ناشتے کے لئے روٹی ڈال رہی تھی، مگر ہاتھ کا پیڑا ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ فوراً انہوں نے توا الٹا اور چولھے کی آگ ٹھنڈی کر دی۔ کلثوم کی خانصاحبنی سے ایسی لڑائی تھی کہ آپس کا بھاجی بخرا بھی بند تھا۔ چنانچہ کلثوم کی بیٹی کا منہ کھلا ہوا ہے نا بی بی میں ضرور جاؤں گی۔ یہ کہہ کر چادر اٹھا۔ فوراً خانصاحبنی کے گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ صو

بیدارنی بھی خبر سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر پھر انہیں کچھ خیال آیا۔ صوبیدار صاحب کو مردانے سے بلوا کر کچھ ہدایت کی، کہ اس وقت کی روٹی ہماری طرف سے ہوگی۔ اس کا انتظام کراؤ، مین جا رہی ہوں۔ پھر انہوں نے چلتے چلتے نوکرانی کو بھی کچھ ہدایت کی کہ اری دیکھ رات کی روٹیاں رکھی ہیں۔ لونڈے کو بھوک لگے تو گھی بورا سے اسے روٹی کھلا دیجیو۔

صوبیدانی نے خاں صاحبنی کے گھر کا راستہ عجلت میں لیکن خاموشی سے طے کیا۔ انہوں نے عورتوں کی تقلید مناسب نہ سمجھی۔ جنہوں نے مردوں کے ہجوم سے گزرتے ہوئے گلی ہی سے اپنے جذبات کا دبہ دبا اظہار شروع کر دیا تھا۔ ہاں دہلیز سے گھسنے کے بعد ان سے ضبط نہ ہو سکا۔ ان کے بین صرف چند لمحوں تک سنے جا سکے۔ گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ اس میں صوبیدارنی یا کسی کی بھی آواز الگ سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ لیکن باہر اس قدر خاموشی چھائی ہوئی تھی بیٹھک سے کرسیاں اٹھا دی گئی تھیں۔ اب وہاں صرف جا جم بچھی ہوئی تھی۔ ایک شخص خاموشی سے بیٹھا کفن سی رہا تھا۔ اس کے چہرے پر نہ تو حزن وملال کی کیفیت تھی۔ اور نہ اطمینان اور خوشی کی جھلک تھی۔ ایسی جان دار چیزیں بھی ہوتی ہیں، جو احساس سے سرے سے عاری ہوتی ہیں۔ اور ایسی بے جان چیزیں بھی ہوتی ہیں، جو ہر دم ایک نئی کیفیت پیدا کرتی ہیں۔

سفید لٹھا عید کی چاندنی رات کو درزی کی جس دکان اور جس گھر میں نظر آتا ہے۔ اس سے حرکت اور روشنی پیدا ہوتی ہے۔ جب اس ک اکفن سلت اہے تو سفید غبار کی طرح بیٹھنے لگتا ہے۔ بیٹھک میں سب سے نمایاں چیز تو یہ کفن ہی تھا۔ ویسے اس سے الگ ایک کونے میں خان صاحب گھٹنوں میں سر دیے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ اکا دکا اور لوگ بھی وہاں نظر آتے تھے، لیکن زیادہ لوگوں نے بیٹھک سے باہر گلی

ہی میں ٹھہرنا مناسب سمجھا تھا۔ دبی دبی آواز میں گفتگو ہوتی اور خود بخود ختم ہو جاتی۔ پھر کوئی نیا شخص گلی میں داخل ہوتا۔ آہستہ سے کسی کے پاس جا کھڑا ہوتا۔ سرگوشی کے انداز میں کچھ سوال کرتا،، کچھ غم اور حیرت کا اظہار کرتا اور پھر چپ ہو جاتا۔ صوبیدار سے سے الگ بیٹھک کی دہلیز پر اکڑوں بیٹھے کسی سوچ میں گم تھے، بیٹھک کے سامنے ذرا ہٹ کر ایک دوسرا مکان تھا۔ جس کے پتھر پر باقر بھائی اور تجمل بیٹھے بڑے سنجیدہ انداز میں ہولے ہولے باتیں کر رہے تھے۔ ان کے انداز گفتگو نے ریاض کو کئی بار للچایا تھا۔ لیکن ان کے پاس جانے کا اسے کوئی بہانہ ہاتھ نہ آیا، البتہ جب چھنو میاں وہاں پہنچے، تو ہمت کر کے وہ بھی آہستہ سے ادھر ہو گیا۔ چھنو میاں ہا شم کی خبر سن کر گھر سے

بہت لپک کے چلے تھے۔ لیکن گلی میں داخل ہوتے ہی ان کی رفتار دھیمی پڑ گئی، شاید انہیں اپنے قدموں کی آہٹ سے بھی کچھ الجھن ہونے لگی تھی۔ چھنوں میاں جب تجمل اور باقر بھائی کے پاس پہنچے تو اس وقت تجمل ہاشم خاں کے تھانیداری کے انتخاب کا ذکر کر رہا تھا۔ ہاشم خاں کی چھاتی بھی غضب کی تھی، مجھ سے تو دو اس میں سما جائیں۔ بس باقر بھائی سمجھو سپرٹنڈنٹ نے جو دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

علی ریاض آہستہ سے بولے ”کیا خبر بھائی اسی کی نظر لگ گئی ہو“

ہاں کیا خبر ہے تجمل نے تائید کی۔

باقر بھائی دھیمے سے لہجے میں بولے۔ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ موت کا بہانہ ہوتا ہے۔ کل نفسٍ ذائقۃ الموت۔ چھنوں میاں نے ٹھنڈا سا سانس لیا۔ کیا خدا کی قدرت ہے؟

باقر بھائی دونوں ہاتھوں سے سر پکڑے اکڑوں بیٹھے تھے۔ ان کی نگائیں زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ اسی کیفیت میں بیٹھے بیٹھے پھر بولے، ”آدمی میں کیا رکھا ہے۔ ہوا کا جھونکا ہے آیا اور گیا۔ علی ریاض کی آنکھوں میں ایک تحیر کی کیفیت پیدا ہوئی۔ باقر

بھائی کیا ہوتا ہے۔ آدمی اچھا خاصا بیٹھا کہ ہچکی آئی پٹ سے دم نکل گیا۔ جارہا ہے۔ جارہا ہے۔ٹھوکے لگی۔آدمی ختم، عجب کرشمہ ہے۔

باقر بھائی سوچتے ہوئے بولے، بس بھائی سانس کا ایک تار ہے۔ جب تک چلتا ہے چلتا ہے۔ ذرا ٹھیس لگی تار ٹوٹا آدمی ختم۔

تجمل اور چھنومیاں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔ چند لمحوں تک علی ریاض بھی چپ رہا۔مگر وہ بولا بھی تو کچھ اس انداز سے گویا خواب میں بڑبڑا رہا ہے۔ ''زندگی کا کیا بھروسہ، آنکھ بند ہوئی کھیل ختم،،،،، کیا ستم ہے، ادھر نوکری کا پروانہ آیا، ادھر موت کا تار برقی آ گیا۔ اس کے بھید وہی جانے عجب کارخانہ ہے اس کا،،،،، پھر علی ریاض بھی سوچ میں ڈوب گیا۔ ایک ڈیڑھ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔علی ریاض اور چھنومیاں دونوں بت بنے ہوئے تھے۔ باقر بھائی بدستور ہاتھوں میں سر تھامے کہنیاں گھٹنوں پہ ٹیکے بیٹھے تھے۔مگر ان کی آنکھیں شاید بند ہوتی جارہی تھیں۔علی ریاض پھر چونکا اور یکا یک باقر بھائی سے مخاطب ہوا۔باقر بھائی خدا ہے بھی یا نہیں؟ باقر بھائی نے آنکھیں کھولیں،، بھائی میرے،،،،،، وہ رکے پھر بولے''موت ہی اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ خدا ہے۔

علی ریاض باقر بھائی کی صورت تکتا رہا۔تکتا رہا۔پھر خیال کی نا جانے کون سی دنیا میں پہنچ گیا

تجمل اور چھنومیاں نہ جانے کس خیال میں گم تھے۔پھر چھنومیاں نے گھٹنے سے اپنی ٹھوڑی اٹھائی۔ اور ایک نا محسوس سے انداز میں پھریری لیتے ہوئے بولے۔ جناب مجھے تو یقین نہیں آتا۔چھنو میاں کی زبان سے پھر ایک فقرہ نکلا۔بار بار اس کی شکل آنکھوں کے سامنے آتی ہے یقین نہیں آتا کہ وہ مر گیا ہے۔

یقین کیسے آئے یار رسوں تک تو وہ اچھا بھلا تھا۔ بازار میں مجھ سے مڈھ بھیڑ ہوئی۔ میں پوچھنے لگا۔ ہاشم خان کب جارہے ہو نوکری پر''بولا ،یار تقرری تو ہو گئی ہے۔

اسی ہفتے چلا جاؤں گا۔

علی ریاض تجمل سے مخاطب تھے۔ پچھلی جمعرات کو وہ اور میں شکار پر گئے۔ کیا نشانہ تھا نیک بخت کا۔ صبح کی دھند میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا۔ قازیں ہڑبڑا کر اٹھیں۔ پروں کی پھڑ پھڑاہٹ پر دھوں سے گولی چلائی۔ اور قازیں ٹپ ٹپ گر رہی ہیں۔ اب اسی دفعہ کا ذکر ہے۔ صاحب مجھے تو پتا نہیں چلا کہ ہرنی کہاں سے اٹھی۔ بندوق کو تانتے ہوئے بولا۔ وہ ہرنی چلی۔ میں نے کہا بہت دور ہے۔

مگر وہ بھلا مانس کہاں سنتا تھا دن سے گولی چلا دی۔ ہرنی بیس قدم گرمی میں چلی اور پھر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا وقت کی بات ہے۔

بعض اوقات منہ سے ایسی آواز نکلتی ہے کہ پوری ہو کر رہتی ہے۔ شکار سے واپسی میں کہنے لگا چھنومیاں یہ اپنا آخری شکار تھا۔ اب ہم چلے جائیں گے غریب سچ مچ چلا گیا۔

باقر بھائی کے جسم کو آخر ذرا جنبش ہوئی۔ سوچتے ہوئے بولے، جمعرات کا دن تھا۔ وقت کیا تھا۔ علی ریاض اور تجمل دونوں بھائی کو تکنے لگے۔ باقر بھائی اک ذرا تامل سے ہچکچاتے ہوئے بولے،، ایسے وقت میں جانور کو نہیں مارنا چاہیئے۔

آہستہ آہستہ اٹھتے ہوئے قدموں کے شور سے ساری بزریا میں خاموشی چھا گئی۔ کالے پنواڑی کی دکان پر جو قہقہے بلند ہو رہے تھے۔ وہ ایکا ایکی بند ہو گئے۔ سامنے سے ایک سائیکل سوار گزر رہا تھا میت دیکھ کر وہ بھی سائیکل سے اتر پڑا۔ سمی حلوائی اس وقت موتی چور کے لڈو بنا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ یک بیک رک گئے۔ اور آنکھوں مین ایک حیرت انگیز افسردگی پیدا ہو گئی۔ ملا پنساری کے اعصاب پ رندہب سوار تھا۔ اس لئے وہ موت کی سنجیدگی سے کچھ زیادہ ہی مرعوب ہو جاتا تھا۔ بڑھی اک وتین پیسے کا دھنیا تو لتے تو لتے وہ ایک ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جب تک جنازے کو کندھا دینے کا ثواب حاصل نہ کر لیا پلٹ کر نہ آیا۔ یوں تو اس نے واپس

آتے ہی کام میں لگ جانے کی کوشش کی تھی۔ مگر بڑھیا کے بھی آخر کچھ روحانی مطالبات تھے۔ بھیارے، یو کس کی میت تھی؟

ملاں نے ٹھنڈا سانس بھرتے ہوئے جواب دیا خاں صاحب ہیں نا دے،،، ان کا لونڈا اگز رگیا۔

بڑھیا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ہائے اللہ' ہیر اسنارا ابھی ابھی گلال لینے کی نیت سے دکان پر پہنچا ہی تھا۔ خان صاحب کا پتر؟،،،،، وامر گیو؟ بڑی گھٹنا ہو گئی۔ پھر ذرا تامل سے بولا وا کی دھی تو بڑی بنی ہوئی تھی پھر کیسے مر گیو؟

ملاں نے پھر ٹھنڈا سا سانس لیا اور بولا'' مہاراج موت بڑی بلوان ہے وہ تو بوڑھے جوان کسی کو نہیں چھوڑتی۔

ہیر ابھی بہک گیا'' ملایوں ت وچ کیوے ہے۔ موت ت وجوگیوں اور مہا رشیوں کو بھی آئی ہے۔ اور شکتی مان راجاؤں مہاراجاؤں کو بھی آئی، راجہ کنش ادیک، چتر ہنو تھا۔ پر موت نے دا کو بھی داب ہی لیو۔

ملاں کے لہجے میں اب توانائی پیدا ہوگئی، لالہ رشی منی ہوں یا پیر پیغمبر۔ موت نے کسی کو معاف نہیں کیا۔ کہتے ہیں کہ افلاطون نے ایک بوٹی تیار کی اور اپنے شاگرد سے مرتے وقت کہا، مجھے دفن مت کیجیو۔ یہ بوٹی لے کر چراغ میں جلا کر چالیس دن تک میرے سرہانے جلائیو۔ چراغ بجھنے نہ پائے چالیسویں دن میں اٹھ کھڑا ہونگا۔ مگر چالیسوین دن کیا ہوا شاگرد کی آنکھ لگ گئی۔ چراغ بجھ گیا۔ افلاطون مرا کا مرا رہ گیا۔ تو لالہ موت بڑی ظالم ہے۔ بڑھیا چپ ہوگئی مگر جب کوئی کچھ نہ بولا تو ایک فقرہ پھر اس کی زبان سے نکل گیا،، خاں صاحبنی کے دونوں کڑیل جوان گئے،،،،، اس کے غضب سے ڈرتا ہی رہے۔

ملاں نے بڑے فلسفیانہ انداز میں جواب دیا'' بڑی بی وہ امتحان لیوے ہے۔

بڑھیا کنجڑی، ہیر اشبراتی، ملا چاروں کے چار چند لمحوں کے لئے بالکل گم سم ہو

گئے۔ان کے چہروں پر کچھ ایسی کیفیت پیدا ہوگئی جو زندگی کی بے ثباتی اور کسی بڑی طاقت کے وجود سے پیدا ہوتی ہے۔

آخر بڑھیا کنجڑی چونکی ''لالہ بھیا مورے کو دھنیا باندھ دے۔ میں چلی،،،،

ملاں نے ہڑ بڑا کر ترازو اٹھائی۔اور دھنیا تول کر کاغذ میں باندھنے لگا۔اب ہیرا بھی ہوش میں آ گیا تھا۔اس نے تقاضا کیا۔ملاں مو کو بھی گلال دے دے۔

''کتنے کا دوں؟

اکنی کا۔''

لالہ اکنی کے گلال مین کیا ہنگ لگے گی تہوار روز روز تھوڑا ہی آوے۔

پیارن نکٹی بھی اب بن ٹھن کر چھجے پہ آ کھڑی ہوئی تھی کسی جلے تن نے پچھلے برس اس کی بے مروتی پر دن دہاڑے دانتوں سے اس کی ناک کاٹ لی تھی۔یوں اس کے سیاہ چہرے کی پھبن تو ضرور بگڑ گئی تھی۔مگر اس سے نہ تو اس کی قہر بھری گھات کا جادو زائل ہوا تھا۔اور نہ اس کے ٹھسے میں فرق پڑا تھا۔شبراتی نے اسے دیکھ کر زور سے انگڑائی لی۔اور اونچی لے میں گانے لگا۔

یارب نگاہ ناز پہ لیسنس کیوں نہیں؟

بنو کو یہ فائدہ تھا کہ خان صاحب کی دیوار اس کی دیوار سے ملی ہوئی تھی، بلکہ اس مشترکہ دیوار میں باہمی سمجھوتے سے ایک الٹی سیدھی کھڑکی بھی پھوڑ ڈالی گئی تھی۔آج یہ کھڑکی بنو کے بہت کام آئی، آنسوؤں کا غلبہ جب بھی کم ہوا، اور طبیعت رونے سے ذرا بھی چاٹ ہوئی۔بنو اس کھڑکی سے نکل اپنے گھر پہنچ گئی۔

حلیمہ بوا نے تو اا لٹتے وقت اپنے ننھے نواسے کا خیال ہی نہ کیا تھا۔اب اس نے بھوک بھوک کا غل مچانا شروع کیا۔ جنازہ اٹھنے کے بعد وہ بھی اس کھڑکی سے بنو کے گھر جا پہنچیں۔ان کا مقصد تھا۔کہ بنو کے گھر روٹی کا کوئی ٹکرا بچا ہو تو، نواسے کو کھلا کر اس کا حلق بند کردیں۔ وہاں وہ بنو سے باتوں میں لگ گئیں۔ حلیمہ بوا کی

آنکھوں میں ہاشم خان کی تصویر بار بار پھر جاتی تھی۔ خانصابنی کی بدنصیبی کا خیال بھی انہیں رہ رہ کر آرہا تھا۔ بنو پر بی تقریبا کچھ یہی عالم گزر رہا تھا۔ چنانچہ جب حلیمہ بوا نے یہ کہا" ڈوبی کا نصابنی تو جیتے جی مرگئی۔" تو بنو کی آواز میں بھی درد پیدا ہوگیا بولی" بدنصیب کی کوکھ اجڑ گئی دو پوت تھے دونوں ختم ہوگئے آنگن میں جھاڑو سی د لگی۔

حلیمہ بوا کچھ دیر چپ سی رہیں، پھر پھر کھوئے کھوئے سے انداز میں بولیں۔ بعضوں کی قسمت ہی ایسے ہوئے ہے۔ خاں صابنی کم بخت کو عہدے راس نہیں آئے یاد نہیں ہے خاں صاحب کو مجسٹریٹی ملی تھی تو کیسے کھٹیا پر پڑے تھے۔

"ہاں آج حاکم ہوتے موئے مرض کی بھینٹ چڑھ گیا عہدہ۔

حلیمہ بوا کو خانصاحبنی کے بڑے بیٹے کا واقعہ یاد آگیا۔ اس کا بڑا پوت بھی ایسے ہی بھری جوانی میں گیا تھا۔ اے بی بی یہ سمجھو کہ چاند کی پہلی تاریخ کو تحصیل داری کا خط آیا اور ستائیسویں کو اس غریب کا تار آگیا۔ وہ بھی آناً فاناً ہوگیا۔

بنو کے لہجے کی کیفیت پھر بدلی، سنجیدہ سا منہ بنا کر کہنے لگی، سچی بات کہنی ہی پڑتی ہے۔ کلثوم بات بات پر اس کے بیٹے کو یاد کرتی تھی۔

آخر بیٹا بدنصیب ختم ہوگیا۔

اس سلسلہ میں بوا ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی، کہ ان کے لاڈلے نواسے نے پھر رٹ لگادی۔ حلیمہ بوا کو خود بھی اس کی بھوک کا احساس تھا۔ بنو سے کہنے لگی میرا بچہ آج بھوک سے ہلکان ہوگیا ہے۔

بنو کو بھی دبی دبی شکایت پیدا ہوئی، اجی ابھی تو میت گئی ہے۔ کب لوگ واپس آئیں اور کب روٹی ملے۔

حلمہ بوا کو یکا یک ایک سوال یاد آیا"اری روٹی کس طرف سے ہے۔

صو بیدارنی دے رہی ہے۔

پھر تو اچھی روٹی دے گی

بنو تنک کر بولی ''اجی ہاں ہاں اچھی روٹی دے گی۔ قبولی پک رہی ہے۔

قبولی؟ حلیمہ بوا کو بڑا تعجب ہوا'' ڈوبا یہ الغاروں پیسہ جو ہے وہ کیا چھاتی پہ دھر کے قبر میں لے جاوے گی۔ بنو کہنے لگی حلیمہ بوا یہ تو دل کی بات ہوتی ہے۔ ہمارے ماں باپ کی کیا حیثیت ہوگی۔ لیکن ہماری ساس کے مرنے پر گوشت روٹی دی تھی۔ ارے بھئی برادری کا لحاظ تو کرنا ہی پڑے گا۔ قبولی تو بڈھوں ٹھڈوں کے مرنے پر دی جاتی ہے۔

قبر تیار ہونے میں خاصی دیر تھی۔ باقر بھائی اور تجمل دونوں قبرستان سے نکل کر کربلا ہولیے۔

آہنی دروازے کے عین سامنے ایک پکی قبر تھی، جو زمین کی سطح سے بالکل ہموار تھی۔ باقر بھائی کو آج ہی نہیں، اس سے پہلے بھی اکثر مرتبہ اس قبر پر رشک ہوا۔ کہ ہر سال دلدل کی ٹاپیں اور ماتمیوں کے قدم دونوں اسے مس کرتے ہیں۔ یہ توخی رسب جانتے تھے کہ یہ قبر حیدر امام کی تھی۔ اور ان کے زہد کا احترام کرتے ہوئے انہیں مناسب مقام پر دفن کیا گیا تھا۔ مگر علی ریاض اس شعر کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا، جو اس قبر پر نقش تھا۔ پہلا مصرعہ تو صاف تھا۔ بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ!

لیکن دوسرے مصرعے کے آخری الفاظ مٹ گئے تھے

ہمیں سو گئے داستاں،،،،،،

علی ریاض نے بہت بہت سر مارا، مگر اسکی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ آخر باقر بھائی نے اس معمہ کو حل کیا، کچھ تو انہیں مٹے ہوئے الفاظ پڑھنے کی اٹکل تھی۔ دوسرے انہوں نے مذہبی کتابوں کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا وقت شاعری پڑھنے پر بھی صرف کیا تھا۔

آخر بہت سوچ کر انہوں نے دوسرا مصرعہ پڑھا، ہمیں سو گئے داستاں سنتے سنتے۔ علی ریاض ہی نے نہیں، تجمل اور چھنوں میاں نے بھی داد دی۔ علی ریاض نے

بڑے اہتمام سے اپنے لہجے میں افسردگی کا رنگ پیدا کیا، اور شعر پڑھنے لگا

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ

ہمیں سو گئے داستاں سنتے سنتے

علی ریاض تھوڑا سا چکرایا اور پھر سوچتے ہوئے بولا۔ انیس کا معلوم ہوتا ہے۔

کیوں باقر بھائی؟

واہ واہ، میر انیس بھی کیا شعر کہہ گئے ہیں۔ چھنوں میاں نے پھر داد دی۔ علی ریاج کا لہجہ یک لخت بدلا ''سنتے ہیں کہ میر انیس خود شعر نہیں کہتے تھے،

بھئی ہم نے تو سنا ہے، کہ محرم کے دنوں مین جب میر جب میر انیس سو کر اٹھتے تھے، تو ان کے سرہانے امام حسین کے ہاتھ کا لکھا ہوا مرثیہ رکھا ہوتا تھا

چھنوں میاں کے چہرے پر سرخی جس تیزی سے آئی تھی، اسی تیزی سے غائب ہوگئی۔ اسی تیزی کے ساتھ ان کی آنکھوں میں حیرت پیدا ہوگئی۔

تجمل نے براہ راست باقر بھائی سے سوال کیا۔ کیوں بھائی سچ ہے یہ؟

باقر بھائی نہ معلوم کس قماش کے آدمی تھے۔ کسی بات کی نہ تو زور شور سے تائید کرتے۔ ان کے جواب میں ہاں اور نہ دونوں پہلو ہوتے۔ کہن یلگے ہاں لکھنو کے بعض لوگ کہتے ہیں، مگر تحقیق نہیں

بعض لوگ اور یہ واقعہ تو لکھنو کے بچے بچے کی زبان پر ہے۔

تجمل نے بےصبرے پن سے کہا۔ کیا واقعہ؟

یہی کہ ایک دفعہ میر انیس اور مرزا دبیر میں بحث ہوگئی۔ دونوں نے مرثیہ لکھا، اور اپنا اپنا مرثیہ بڑے امام باڑے میں علموں کے پاس رکھ آئے۔ صبح کو جو جا کے دیکھتے ہیں۔ تو میر انیس کا مرثیہ تو ویسے کا ویسے رکھا ہوا ہے۔ اور مرزا دبیر کے مرثیے پر پنجے کا نشان ہے۔

''پنجے کا نشان؟ تجمل اور چھنو میاں دونوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں

علی ریاض نے بڑے اعتماد سے کہا۔ہاں پنجے کا نشان۔بس جناب میر انیس کا تو برا حال ہوا۔سمجھے کہ مولا کی شان میں کوئی گستاخی ہوگئی ہے۔علموں کے پٹکے سے آنکھیں ملتے تھے اور روتے تھے، اور روتے روتے شام ہوگئی۔پھر رات ہوئی ذرا آنکھ جھپکی ہوگی کہ گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنای دی۔علی ریاض پھر بولا۔گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز پاس آتی گئی، پاس آتی گئی۔سارا امام باڑہ گونجنے لگا۔میر انیس کیا دیکھتے ہیں۔کہ ایک سفید گھوڑا ہے۔اوراس پر ایک نقاب پوش بیٹھے ہیں، کمر میں تلوار، میر انیس کے برابر آئے اوراس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولے، انیس تو میری اولاد ہے۔دبیر میرا عاشق ہے۔اس کا دل ٹوٹ جاتا۔میر انیس کی روتے روتے ہچکی بندھ گئی۔آنکھ کھلی تو نہ گھوڑا تھا، نہ گھوڑسوار۔تڑکا نکل آیا تھا۔مسجد میں اذان ہو رہی تھی۔باقر بھائی نے اک ذرالاپرواہی سے کہنے لگے۔لیکن اس روایت سے تو یہ ثابت ہوتا ہے۔

کہ میر انیس خود مرثیہ لکھتے تھے۔

مگر باقر بھائی اب ٹیچی کے اشارے کے بغیر چل رہے تھے۔انیس کی شاعری واقعی انسانی کلام نہیں ہے،،،، معجزہ ہے۔باقر بھائی چند لمحوں کے لئے بالکل خاموش ہوگئے، اور پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگے۔

”گودی ہے کبھی ماں کی کبھی قبر کا آغوش
سرگرم سخن ہے، کبھی انسان کبھی خاموش
گل پیرہن اکثر نظر آتے ہیں کفن پوش
گہہ تخت ہے اور گاہ جنازہ بہ سر دوش

باقر بھائی اک ذرارکے، انکی آواز ڈوبنے لگی تھی ہائے کیا شعر تھا،

اک طور پہ دیکھا نہ جواں کو نہ مسن کو
شب کو تو چھپر کھٹ میں تابوت میں دن کو

باقر بھائی چپ ہو گئے اب وہ پھر بت بن گئے تھے،

علی ریاض چھنوں میاں اور تجمل پہ بھی سکتہ طاری تھا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، البتہ آس پاس کے نیم اور املی کے درختوں میں دھیما دھیما شور ضرور برپا تھا۔ ہوا بہت تیز تو نہیں تھی۔ اسے موسم کا اثر کہیئے یا ہوا کا جھونکا، اگر دبے پاؤں بھی آتا تو زرد پتوں کو بہانہ مل جاتا، اور ٹہنیوں سے بچھڑ کر فضا میں تیرنے لگتے۔ بہتی ہوئی تیرک ریلے میں نیم کے بہت سے ننھے ننھے زرد پتے بھی آ گئے تھے۔ اور قبر پر بڑے قرینے سے بچھ گئے تھے۔

اس نیم بیدار نیم خوابیدہ فضا میں نیم کے درختون سے لے کر کربلا کی دیواروں کی منڈیروں تک ہر چیز کچھ اجڑی اجڑی سی نظر آ رہی تھی۔ اور علی ریاض، تجمل، چھنوں میاں گم متھان بنے بیٹھے تھے، اور باقر بھائی پر مراقبہ کی کیفیت طاری تھی۔

چھنوں میان اٹھ گئے۔ دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے، چھنوں میاں نے اس سلسلے میں مشورے یا اطلاع کی ضرورت نہیں سمجھی۔ شاید نادانستہ طور پر ان کے قدم بیریوں کی طرف اٹھ گئے تھے۔ یہ بیریاں اس سال اللہ دیے نے لے رکھی تھیں۔ اس نے اس برگزیدہ قافلے کو بیریوں کی طرف آتے دیکھا تو بے تحاشا لپکا ہوا آیا۔ قریب پہنچتے ہی اس نے سلام کیا، میاں سلام۔

سلام صرف چھنوں میان نے سلام کا جواب دینا ضروری سمجھا۔

بیریوں میں داخل ہوتے ہی چھنوں میاں کہنے لگے، صاب موسم اب بدل گیا ہے۔

دھوپ میں اچھی خاصی تیزی آ گئی ہے۔

ہاں تجمل بولا جاڑے تو اب گئے ہی سمجھو میں تو ہولی کے انتظار میں ہوں۔ ہولی چلی اور میں نے باہر سونا شروع کیا۔

چھنوں میاں اللہ دیے کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اے اللہ دیے کب جل رہی ہے

ہولی۔؟

اگلے شکر کو جل جاوے گی جی ہولی۔بس چھنوں میاں بیر بھی اگلے شکر تک کے ہیں۔

ہولی کے بعد ان میں گنڈار پڑ جاوے گی، پھر ذرا رک کر بولا میاں بیر کھالو۔

چھنوں میاں بیزار ہو کر بولے، میرے یار دم تو لینے دو۔

میرے یار دم تو لینے دو۔

اللہ دیا چپ ہو گیا۔اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔اور پیچھے پیچھے تجمل کے برابر ہولیا۔کچھ دیر وہ خاموش چلتا رہا۔پھر آہستہ سے بولا تجمل میاں کتنی دیر ہے دفن میں۔ آدھ گھنٹے سے کم کیا لگے گا؟

اللہ دیا خاموش چلتا رہا، پھر ذرا ہچکچا کر بولا۔تجمل میاں جو ہونی ہوئے ہے۔وہ ہو کے ہی رہے ہے۔(میرا ماتھا اسی وخت ٹھنکا تھا) میں نے ہاشم میاں کو منع بھی کیا۔لیکن انہوں نے میری سنی نہیں۔

علی ریاض چپ چاپ پیچھے چلے آ رہے تھے۔ان فقروں پر ان کے کان کھڑے ہو گئے۔اور پاس آ کر بولے کیا بات ہے۔

اجی میں دس روز کے شکار کی بات کر رہا ہوں۔ اللہ دیے کی آواز اب بلند ہو گئی۔سالا نیل کنٹھ رستا کاٹ گیا تھا۔میں نے کہا ہاشم میاں لوٹ چلو، انہوں نے مجھے دانٹ دیا۔جب ہرنی اٹھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔اجی دس کے ہرن کو پچھلے مہینے ہاشم نے مارا تھا۔میرا دل اندر سے یوں کہوے کہ اللہ دیے آج کچھ ہو گا۔میں نے کہا، ہاشم میاں گولی مت چلاؤ۔پر جی انہوں نے مجھے دانٹ دیا۔۔

اللہ دیا خاموش ہو گیا۔بیریوں کے پتے خاموش تھے ہوا شاید بہت دھیمی تھی۔ صرف قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔اللہ دیے کی جھونپڑی کے قریب پہنچ کر سب لوگ چارپائی پر بیٹھ گئے۔

اللہ دیے نے حقہ تازہ کر کے رکھ دیا تھا۔ چھنوں میاں نے دو گھونٹ خاموشی سے لیے۔ پھر آپ ہی وپ کہنے لگ ابھئی اب کچھ بھی کہہ لو ہم تو بچپن سے شکار کھیلتے آئے ہیں۔ ہم نے ت و کبھی شگن و گن کی پرواہ نہیں کی۔

علی ریاض بولے بھئی یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ آج ہم کہتے ہیں کہ بڑے بوڑھے لوگ بڑے دقیانوسی تھے، تو ہم پرست تھے،۔۔۔۔ مگر صاحب ان کا کہا ہوا آج بھی پتھر کی لکیر ہے۔

تجمل نے بے ساختہ ٹکڑا لگایا۔ یہ واقعہ ہے۔

علی ریاض کی بات جان دار تھی۔ چھنوں میاں کو مجبوراً باقر بھائی سے رجوع کرنا پڑا۔

باقر بھائی آپ کا کیا خیال ہے؟

باقر بھائی پھر اپنی اسی مذبذب سے لہجہ میں بولے،، اللہ بہتر جانتا ہے۔ کیا بھید ہے،،،،، ویسے ہم نے بہت سی رسمیں ہندوں سے لی ہیں۔ اسلام ت وشگون و گون کا قائل نہیں ہے۔

چھنوں میاں کی بات کی تائید ہوئی تھی۔ پھر بھی اس جواب پر انہوں نے کچھ بے اطمینانی سی محسوس کی۔

علی ریاض چند لمحوں تک بالکل گم سم رہا۔ پھر بڑبڑانے لگا۔ اس کے بھید وہی جانے۔ عجب طلسمات ہے یہ دنیا؟

باقر بھائی کی نیت جواب دینے کی نہیں تھی، بس یونہی بیٹھے بیٹھے وہ کہنے لگے۔ میاں ہم تو یہ جانتے ہیں، کہ تقدیر میں جو لکھ گیا وہ مٹ نہیں سکتا۔

باقر بھائی پھر کسی دوسری دنیا میں جا پہنچے۔ ہوا کا تنفس بہت دھیما ہو گیا تھا۔ مگر بیریوں کے پتوں ایک دبا دبا سا شور تھا۔ کچھ ایسا شور کہ جیسے چوری چوری کچھ کتر کر کھا رہے ہیں۔ اللہ دیے ن تجلدی سے گوپھیا اٹھائی، اور گھمائی اور ساتھ حلق سے ایک

آواز بھی نکالی اور طوطوں کی ایک ڈار چیختی چلاتی تیزی سے پتوں کی تہہ سے اٹھی اور فضا میں ایک الٹی سبز دھاری بن کر پھیل گئی۔ گوپھیا نے دوہرا طلسم پیدا کیا۔ اس کے ایک اشارے سے سبز طوطے آسمان کی طرف اٹھے اور سبز سرخ بیر زمین پر گرے۔ اللہ دیے نے سرخ سرخ بیروں سے گود بھری اور اسے مہمانوں کے سامنے جا کر خالی کر دیا۔ کہنے لگا۔ میاں پونڈا بیر ہے۔ پکے پکے بین کر لایا ہوں۔ ذرا یوں چکھ کے دیکھو۔

باقر بھائی نے کسی قسم کا اظہار خیال نہ کیا، ہاں علی ریاض نے ان کے کھٹے میٹھے ہونے کی تعریف کی، چھنوں میاں کا خیال تھا، اگر پسا ہوا نمک ہوتا تو زیادہ لطف آتا، تجمل بیر کھاتے کھاتے پوچھنے لگا۔ اے اللہ دیے بیریوں سے تو نے اچھا کما لیا ہوگا۔

اللہ دیا بڑے افسردہ سے لہجے میں بولا، اجی تجمل میاں ان بیروں سے کیا ہینگ لگے گی۔ اب کے برس بڑا گھاٹا آیا ہے۔ آموں کی فصل ساری سوکھی نکل گئی، ساری رقم ڈوب گئی، سنگھاڑوں کی بیل لی تھی، اسے جونک لگ گئی۔ تجمل میاں بس تو اپنی بدھیا بیٹھ گئی۔ سنگھاڑوں کی بیل سے اللہ دیا کا ذہن کسی اور طرف منتقل ہو گیا۔ اس کا رخ چھنوں میاں کی طرف ہو گیا۔ اجی چھنوں میاں وے پوکھر تھی نئیں اپنی دس پہ آج کل مرغابی بہت گر ری اے۔

چھنوں میاں چونکے ''اچھا''

''ہاں میاں''

''دیکھ لیں کسی دن''

اللہ دیا بولا ''تو اس سالے جانور کا بھروسہ نہیں، اے بس چلنا ہے تو جلدی چلے چلو، کسی دن پو پھٹنے سے پہلے تاروں کی چھاؤں میں چلو، تڑکے تڑکے گھر پہ آن لگیں گے۔

چھنوں میاں جواب دینے ہی والے تھے، کہ علی ریاض بیچ میں بول پڑا۔ اس کی

آنکھیں دور قبرستان کی طرف دیکھ رہی رہیں۔ اور کہہ رہا تھا، یار لوگ تو گھر واپس جا رہے ہیں۔ ہم یہیں بیٹھے رہ گئے۔

چھنوں میاں، علی ریاض، تجمل اور باقر بھائی چاروں اٹھ کھڑے ہوئے۔ اللہ دیے نے پھر چھنوں میاں کو ٹھوکا، تو چھنوں میاں کب چل رہے ہو۔؟

چھنوں میاں دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے بول..... کل، کل نہیں پرسوں نتیجہ ہے۔ ہاں اترسوں آجائیو۔ مگر دن چڑھے سے پہلے پہلے واپس آنا ہے۔

اللہ دیا گرما کر بولا ''دن چڑھے؟ کیا کہہ رہے ہو چھنوں میاں۔ اجی فجر کی نماز مسجد میں آکے پڑھیں گے۔''

کن رس

افسانہ نگار : غلام عباس

بعض لوگوں کو گانے بجانے سے قدرتی لگاؤ ہوتا ہے۔ خود چاہے بے سرے ہی کیوں نہ ہوں۔ راگ ان پر جادو کا سا اثر کرتا ہے۔ رفتہ رفتہ وہ گانے بجانے کے ایسے عادی ہو جاتے ہیں، جیسے کوئی نشہ لگ جائے۔ صاحب ثروت ہوئے تو ساری عمر لوگوں کی یوں پرورش کرتے رہے، نہیں تو استاد کی جوتیاں سیدھی کر کے ہی اپنے ذوق کی تسکین کر لی۔ دراصل ان ہی لوگوں کے لئے موسیقی روح کی غذا ہوتی ہے۔ گانے بجانے والوں کی اصطلاح میں ان لوگوں کو کن رسیا کہتے ہیں۔

فیاض کو بھی قدرت کی طرف سے موسیقی کا کچھ ایسا ہی ذوق عطا ہوا تھا۔ مگر بد قسمتی سے ایک تو وہ پیدا ہی ایک غریب وثیقہ نویس کے گھر ہوا۔ دوسرے اس کا باپ بڑا سخت گیر اور پابند صوم وصلواۃ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فیاض کا یہ ذوق پنپنے نہ پایا۔ پھر بھی اس نے بچپن سے لے کر جوانی تک اپنی موسیقی سے وابستگی قائم رکھی۔

جب اسکول میں پڑھتا تھا، تو کبھی کبھی اسے حمد گانے کو کہا جاتا تھا۔ وہ بھی عجیب سماں ہوتا۔ صبح صبح لڑکے لڑکے قطاریں بندھے کھڑے ہیں۔ اور فیاض ان کے سامنے کھڑا حمد کا ایک ایک مصرعہ گا رہا ہے۔ جسے سارے لڑکے کورس کی صورت میں دہراتے جا رہے ہیں۔ قوالی اور سماع کی محفلوں میں وہ بچپن سے ہی شریک ہونے لگا تھا۔ کیونکہ باپ ان میں جانے کی اجازت دے دیتا تھا۔

بشرطیکہ وہ پاس پڑوس ہی میں کہیں منعقد ہوتیں۔ کبھی کبھی وہ ان براتوں کے ساتھ بھی ہو لیتا۔

جن کے آگے آگے بینڈ باجا بجتا، اور ڈھولکیا زرق برق وردی پر شیر کی کھال پہن یطرح طرح کے کرتبوں سے ڈھول بجاتا، جو اس نے گلے میں لٹکا رکھا ہوتا۔

وہ جو سڑک کی کسی پٹڑی پر کسی ہنڈے کے نیچے میاں میلی سی چادر بچھا ہارمونیم کھول کر بیٹھ جاتا۔ اور بیوی ڈھولک گھٹنے تلے دبائے، گھونگھٹ کے اندر سے کراری کوئل کی سی آواز نکالتی اور گانا الاپنے لگتی۔ ان کا گان بھی فیاض بڑی محویت سے سنا کرتا۔ ایسے موقع پر اس کی تمنا ہوتی، کہ میں بھی کوئی سستا سا ہارمونیم خرید لوں۔ اور گھر میں گانے کی مشق کیا کروں۔ مگر وہ جانتا تھا، کہ باپ کے جیتے جی یہ ارمان پورا ہونا محال ہے۔

طالب علمی ہی کے زمانے میں ایک بار، جب اسکے باپ کو کسی ضروری کام سے دوسرے شہر جانا پڑا۔ تو فیاض کا ایک دوست اسے رات کو اسے تھیٹر دکھانے لے گیا۔ یہ پارسیوں کی ایک مشہور کمپنی تھی، جس میں نامی گرامی ایکٹر اور گویے ملازم تھے۔ کھیل بھی ایسا تھا، کہ اس میں شروع سے آخر تک گانا ہی گانا تھا۔ فیاض تمام وقت مبہوت ہو کر سنتا رہا۔ اور پھر برسوں اسے اپنے کانوں میں ان نغموں کی گونج سنائی دیتی رہی۔

فیاض نے اسکول کی تعلیم مکمل کی تو باپ نے تنگ دستی کے باوجود اسے کالج میں داخل کرا دیا۔ اس کا خیال تھا، کہ لڑکا جتنی زیادہ تعلیم حاصل کرے گا۔ اتنی ہی اچھی اسے نوکری مل جائے گی۔ کالج میں فیاض نے خود کو زیادہ آزاد محسوس کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ باپ کی نظروں سے اوجھل رہ کر اسے کالج کی بزم موسیقی میں اپنے ذوق کی تسکین کا سامان نظر آنے لگا تھا۔

باپ کا قاعدہ تھا کہ رات کو جب تک فیاض بستر پر لیٹ نہ جاتا وہ خود بھی آرام نہ کرتا، اور پھر رات کو اٹھ کر ایک دو بار بیٹے کے پلنگ کے پاس ضرور جاتا،

ایک دفعہ پچھلے پہر اس نے فیاض کو نیند میں بڑبڑاتے سنا۔ وہ اٹھ کر بیٹے کے

پلنگ کے پاس گیا۔ فیاض کی زبان سے بے خبری میں عجیب عجیب الفاظ نکل رہے تھے، کچھ انگریزی کے کچھ اردو کے، بیچ بیچ میں وہ کبھی کبھی ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں بھرنے لگتا۔ کبھی کراہ اٹھتا۔ باپ بڑے تعجب کے ساتھ یہ کیفیت دیکھتا رہا۔ رات بھر وہ طرح طرح کے اندیشوں میں کھویا رہا۔ اگلے ہی روز اس نے بیٹے کے لئے موزوں رشتہ تلاش کرنا شروع کر دیا۔ اور پھر تھوڑے ہی دنوں میں ایک اپنے سے بھی غریب گھر کیمگر شکل وصورت کی اچھی لڑکی منتخب کر کے فیاض کی شادی کر دی۔ اور یوں بیٹے کی آوارگی کا بڑی حد تک سدباب کر دیا۔

کالج میں فیاض کا تیسرا سال تھا، کہ اچانک باپ کا انتقال ہو گیا۔ ماں اس سے ایک برس پہلے ہی سدھار چکی تھی، چنانچہ اب فیاض آزاد تھا۔ مگر یہ آزادی اپنے ساتھ کئی ذمہ داریاں لے کر آئی تھی، سب سے اہم مسلہ اپنی اور اصغری کی جو ایک بچی کی ماں بن چکی تھی، گزر اوقات کا تھا۔ کیونکہ باپ اپنے پیچھے نہ تو کوئی جائیداد چھوڑ مرا تھا۔ اور نہ کچھ روپیہ پیسہ ہی۔ چنانچہ اگلے روز اس نے کالج کی بجائے دفتروں کا رخ کیا۔ اور نوکری کی تلاش شروع کر دی۔ اسے اپنی بیوی اور بچی سے بڑی الفت تھی۔

چنانچہ ان کی خاطر اس نے ادنیٰ سے ادنیٰ محنت مزدوری کو بھی اپنے لئے عار نہ سمجھتا تھا۔ اور جیسے تیسے ان کا پیٹ پالتا رہا۔

آخر مہینوں سڑکوں کی خاک چھاننے اور دفتروں میں دھکے کھانے کے بعد اسے آبکاری کے ایک محکمے میں ایک کلرک کی جگہ عارضی طور پر مل گئی۔

اس نے دن رات کی محنت اور اپنی قابلیت سے جلد ہی اس دفتر میں اپنے لئے مستقل جگہ پیدا کر لی۔

اس کے بعد اسے اپنی آمدنی بڑھانے کی فکر ہوئی، کیونکہ دوسری بچی کی پیدائش کے بعد گھر کے اخراجات بڑھ گئے تھے، چنانچہ وہ دن کو دفتر میں کام کرتا اور رات کو

گھروں پر جا کر لڑکوں کو پڑھاتا۔ اور اس طرح بڑی مشکل سے گھر کا خرچ چلاتا۔

اس زمانے میں اس کا ذوق موسیقی فائلوں کے انبار اور جمع خرچ کے اندراجات میں گم ہو کے خواب وخیال بن گیا تھا۔ پھر بھی پچھلے پہر رات کے سناٹے میں اگر وہ جاگ رہا ہوتا، اور کوئی تانگے والا سنسان سڑک پر تانگہ چلاتے ہوئے اپنی سریلی اور پاٹ دار آواز میں کوئی لوک گیت گاتا ہوا نکل جاتا، تو اس کے دل سے ہوک سی اٹھتی۔

رفتہ رفتہ اس کی حالت سنبھلتی گئی، یہاں تک کہ وہ اپنی لیاقت اور خوش اخلاقی کے باعث اسی دفتر میں ہیڈ کلرک بن گیا۔ سب افسر اس کے کام سے خوش تھے۔ اور وہ بھی اپنی حالت پر مطمئن تھا۔ اسے جو مشاہرہ ملتا وہ اسکے اور اس کے بیوی بچوں کے گزارے کے لئے کافی تھا۔ اب اسے دوسروں کے بچوں کو گھر پر جا کر پڑھانے کی ضرورت نہ رہی۔

جسے اسے ہیڈ کلرکی ملی تھی۔ اس کا کام خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس کا معمول تھا، کہ جب سب لوگ دفتر سے چلے جاتے، تو وہ تنہائی میں اپنے ماتحت کلرکوں کے کام کا محاسبہ اور حسابات کی جانچ پڑتال کیا کرتا تھا۔ مگر اس کی دل جمعی ہو جاتی۔ وہ چراغ جلنے سے پہلے شاذ ہی دفتر سے اٹھتا۔ دفتر سے اٹھ کر وہ اس باغ کا رستا لیتا، جو فصیل کے ساتھ ساتھ شہر کے گرداگرد چلا گیا تھا۔ اس کا گھر شہر کے اندر ایک تنگ اور گنجان محلے میں تھا۔ باغ سے ہو کر گھر پہنچنے میں اسے ایک آدھ میل زیادہ چلنا پڑتا۔ پھر بھی وہ اسے شہر کے پر شور بازاروں اور تنگ گلیوں پر ترجیح دیتا۔

وہ باغ کی کشادہ سڑک پر جس پر سرخ بجری بچھی ہوئی تھی۔ اور جس پر ہر قسم کی گاڑیوں کے چلنے کی ممانعت تھی، مزے مزے سے قدم اٹھاتا گھر پہنچتا۔ اس ہوا خوری سے اس کی دن بھر کے تھکے ہوئے دماغ کو آسودگی حاصل ہوتی۔ اور جس وقت وہ گھر پہنچتا خاصا تازہ دم ہوتا۔ اس کے بیوی بچے ملازمت کے ابتدائی زمانے

ہی سے اس کے دیر سے گھر پہنچنے کے عادی تھے۔

ایک دفعہ ہفتے کی ایک شام کو وہ معمول سے بھی زیادہ ہی دیر میں دفتر سے نکلا۔ یہ گلابی جاڑوں کے دن تھے، ابر چھایا ہوا تھا، اورا کا دکا بوند بھی اس کے منہ پر آ پڑتی۔ وہ حسب عادت باغ کی سڑک پر ٹہلتا ہوا جا رہا تھا، سڑک سڑک کے کنارے کنارے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے کھمبے تھے، جن کی روشنیوں کی قطار سڑک کے ساتھ ساتھ خم کھاتی ہوئی دور سے بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔

فیاض اپنی دھن میں مست چلا جا رہا تھا، کہ اچانک اس کے کان میں کسی ساز کی دھیمی دھیمی آواز پڑنی شروع ہوئی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا۔ آواز زیادہ واضح ہوتی گئی۔ آخر جب وہ قریب پہنچا تو اس نے بجلی کے ہنڈے کی روشنی میں دیکھا کہ سڑک کے قریب ہی باغ کے گوشے میں ایک درخت کے نیچے کوئی شخص فقیروں جیسی گدڑی اوڑھے سرکاری بنچ پر اکڑوں بیٹھا ایک بڑا سا ساز بجا رہا ہے۔

اس موسیقی میں بلا کا سوز تھا، نغمہ تھا۔ کہ بے اختیار دل میں اترا جاتا تھا۔ ایک ایک سر واضح اور صاف سنائی دیتا تھا۔ فیاض کے قدم خود بخود رک گیا اور وہ سازندے پر نظریں جما ئیا یک محویت کے عالم میں اس موسیقی کو سننے لگا۔

سازندہ آنکھیں بند کیا اس امر سے بے نیاز کہ کوئی اس کے فن پر دھیان دے رہا ہے یا نہیں،، بڑے انہاک کے ساتھ ساز بجا رہا ہے۔ اس کی انگلیاں تھکنے کا نام نہ لیتی تھیں۔ وہ کبھی اس تار پر دوڑتیں، کبھی اس تار پر دوسرے ہاتھ سے وہ تاروں پر ضربیں لگا رہا تھا۔ اس قدر تیزی کے ساتھ کہ فضا میں مسلسل ایک ارتعاش کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

فیاض کے دل و دماغ پر اس موسیقی کا کچھ ایسا اثر پڑا کہ پہلے تو اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ اعصاب ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے۔ اور نقاہت سی محسوس ہونے لگی۔ پھر ایک آنسو اس کی آنکھ سے بے اختیار ٹپک پڑا۔

فیاض کی زندگی کے پچھلے دس گیارہ سال ایسے سپاٹ گزرے کہ ان میں موسیقی یا فن لطیفہ کا کچھ دخل نہ تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا مقصد صرف عزت و آبرو کی روٹی کمانا اور بچوں کی پرورش کرنا قرار دے لیا تھا۔ اور وہ یہ فرض بڑی مسرت کے ساتھ انجام دے رہا تھا۔ اگر اس کی زندگی میں کسی چیز کی کمی رہ جاتی تو اصغری سے اس کی والہانہ گرویدگی اس کمی کو پورا کر دیتی۔ مگر اب اس موسیقی کو سن کر اسے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے دل کے اندر کوئی سوئی ہوئی چیز دفعتاً جاگ اٹھی ہو۔

کچھ دیر بعد سازندے نے ساز بجانا بند کر دیا، اس کے ساتھ ہی فیاض کو ایسا محسوس ہوا کہ جس طلسم نے اسے مسحور کر رکھا تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ اور اب وہ چاہے تو جا سکتا ہے۔ مگر اتنے ہی میں سازندی نے آنکھیں کھول دیں۔ اور پہلی مرتبہ سڑک پر اس اپنے واحد سامع کو دیکھا۔ پھر اس خیال سے کہ کہیں وہ چل نہ دے اس نے جلدی سے ہانک لگائی:

''باؤجی کی خیر ہو مل جائے کوئی دھیلی پاؤلا فقیر کو نشے پانی کے لئے۔''

فیاض کے قدم رک گئے۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا، جس میں اتفاق سے ایک دونی ہی تھی۔ ایسے صاحب کمال کو ایسا حقیر نذرانہ پیش کرتے ہوئے اسے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ آخر اس نے سازندے کی طرف بڑھتے ہوئے ہمت کر کے کہا۔ استاد اس وقت تو یہی قبول کرو۔ ہاں اگر کھانا کھانا ہو تو میرے ساتھ چلو۔ میرا گھر یہاں سے قریب ہی ہے۔

سازندی لمحہ بھر تامل کیا۔ ساز بجاتے بجاتے یقیناً وہ تھک بھی گیا تھا۔ اور اسے بھوک بھی لگی تھی۔ ایسے میں گھر کا پکا پکایا کھانا مل جائے تو کیا برا تھا،؟

چلتا ہوں بابو جی اللہ تمہاری خیر کرے۔

اور وہ ساز بغل میں دبا گدڑی سنبھال بنچ سے اٹھ کھڑا ہوا، اور فیاض کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ وہ لمبے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا۔ ادھیڑ عمر، سر پر لمبی سی ترکی ٹوپی، جو بہت

میلی ہوگئی تھی۔اور جس کا پھندنا ٹوٹ چکا تھا۔لمبے لمبے پٹے جس میں گھاس پھوس کے تنکے الجھے ہوئے تھے۔کڑ بڑی داڑھی ج وکئی روز سے منڈائی نہ گئی تھی۔ آنکھیں سرخ سرخ گویا دکھنے آئی ہوں،اوران میں سے پانی رستا ہو۔اس کا لباس جوکرتے،پاجامہ اورکالی واسکٹ پر مشتمل تھا۔سخت بوسیدہ اور میلا تھا۔پاؤں میں ٹوٹا ہوا بوٹ

جو اس کے پاؤں کے ناپ سے بڑا تھا۔اور اسے جوتے کو گھسیٹ گھسیٹ کر چلنا پڑتا۔پیٹھ میں تھوڑا سا کوب جو شاید ساز بجانے کی وجہ سے پیدا ہو گیا تھا۔

یہ باجہ جو تم بجاتے ہو،اس کو کیا کہتے ہیں؟۔فیاض نے چلتے چلتے پوچھا۔

''اس کو سرود کہتے ہیں تمہاری خیر رہے بابو جی

سرود؟

''جی ہاں سرود''

بہت کامل کا بجاتے ہو استاد تم تو۔

''اجی کمال تو بس اللہ کی ذات کو حاصل ہے بابو جی۔

''میں نے آج تک کسی کو اتنا اچھا ساز بجاتے نہیں سنا۔

کرم ہے کلیروالے بابا کا۔میں کس لائق ہوں بابو جی؟

مجھے تو آج تک خبر ہی نہ تھی کہ موسیقی میں اس قدر دل کشی ہوتی ہے۔

''اجی کیا پوچھتے ہو بابو جی۔ایک مرتبہ اس کی چینٹک لگ جائے،تو پھر عمر بھر چھٹکارا مشکل ہے۔

مجھی کو دیکھو فقیروں سے بدتر حال ہے۔کم بخت جی کا جنجال ہوگئی ہے۔

کب سے یہ ساز بجا رہے ہو استاد جی؟

''کوئی چالیس برس کا ریاض ہے۔بابو جی،کوئی چار برس کا تھا۔جب بجانا شروع کیا تھا۔باوا نے چھوٹا سا بنوا کر دیا تھا۔کھیلنے کو کیونکہ میں ان کا سرود بجانے

کے لئے بہت مچلا کرتا تھا۔ بس میں اپنے اس کھلونے سے کھیلتا رہتا۔ اور اپنے کبھی ٹوں ٹاں بھی کر لیا کرتا۔

ایک دن کیا ہوا، اللہ تمہاری خیر رکھے بابو جی، کہ صبح ہی صبح استاد دلدار خاں مرحوم باوا سے ملنے گھر پر آئے۔ استاد دلدار خاں مرحوم کے سرود کی ساری خدائی میں دھوم تھی، مگر اللہ بخشے بچاروں کے الٹے ہاتھ کی کلائی پر چکی کا پاٹ گر پڑا۔ اور ہاتھ عیبی ہو گیا تھا۔ خود بجانے سے معذور ہو گئے تھے بس سکھلایا کرتے تھے۔ وہ بھی راجواڑوں میں۔ باوا سے ان کا بہت یارانہ تھا۔

ہاں تو بابو جی وہ دونوں آنگن میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اور میں ان سے ذرا ہٹ کے اپنے اسی کھلونے سے کھیل رہا تھا۔

ایکا ایکی استاد دل دار خاں باوا کی بات کاٹ کر چلا اٹھے:

اے میاں ذرا سننا یہ لونڈا کیا بجا رہا ہے؟

،لو بابو جی دونوں نے سنا تو میں گن گری کی گت بجا رہا تھا۔ باوا جی نے کلام مجید اٹھا لیا کہ میں نے بچے کو بتایا ہو تو اسی کی مار پڑے۔ بلکہ میں نے تو اس کے ساز کے کبھی تار بھی ملا کر نہیں دیے۔ اس پر استاد دل دار خاں باوا سے کہنے لگے، میاں یہ لونڈا تم مجھے دے دو۔ دیکھو میرا ہاتھ عیبی ہو گیا ہے۔ دل میں بہت سی حسرتیں رہ گئی ہیں۔ اب یہ لونڈا دنیا کو بتا دے گا کہ دل دار خاں کیا چیز تھا۔

''لو بابو جی اللہ تمہاری خیر رکھے بہت حیل وحجت ہوئی آخر باوا مان گئے۔ کیو نکہ مجھ سے بڑے دو بیٹے اور تھے ان کے۔ استاد مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔ بس اس دن سے میں ان کی خدمت میں رہنے لگا۔

چلموں پر آگ رکھتے رکھتے چٹکیاں جل گئیں۔ چار چوٹ کی مار مارا کرتے تھے۔ بابو جی مجھے۔ آج جو چار آدمیوں میں میری واہ واہ ہوتی ہے۔ استاد دل دار

خاں کی جوتیوں ہی کا صدقہ ہے۔ بابو جی۔

فیاض نے بڑی دل چسپی سے یہ قصہ سنا، جب ختم ہوا تو دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

تمہارا نام کیا ہے بابو جی۔ مجھے فیاض کہتے ہیں۔

طبیعت کے بھی ماشا اللہ فیاض ہو۔ اسم با مسمیٰ اور کام کیا کرتے ہو بابو جی

میں ایک دفتر میں ملازم ہوں

تنخواہ کیا ملتی ہے بابو جی؟

کچھ زیادہ نہیں مگر شکر ہے خدا کا گزارہ ہو جاتا ہے،۔

پھر بھی کتنی

یہی کوئی ڈیڑھ سو۔

اور بچے کتنے ہیں ماشا اللہ سے تمہارے

"

دو"

لڑکے یا لڑکیاں

لڑکیاں

یہ سن کر سرودیے کی زبان سے ایک مہمل سا کلمہ نکلا۔ پھر وہ کہنے لگا:

"خیر جیتی رہیں، اللہ کی دین ہے اور بابو جی؟

فیاض اسکے تابڑ توڑ سوالون کا جواب دیتے ہوئے زچ ہو گیا۔ اس نے اس سلسلے کو روکنے کے لیئے خود یہی حربہ استعمال کرنے کی سوچ لی۔ اور خود اس سے سوال کرنے شروع کر دیئے۔ اسے معلوم ہوا کہ سرودیئے کا نام حیدری خاں ہے۔ وہ پیار خاں کا چھوٹا بھائی ہے۔ جو کسی مہاراجا کے دربار میں پان سے روپے پر ملازم ہے۔ ایک بڑا بھائی اور تھا۔ وہ بھی کس راجواڑے میں ملازم تھا۔ مگر دشمنی میں اسے کسی نے

زہر دے کر مار ڈالا۔ اپنی بد مزاجی کی وجہ سے اس کی گھر میں کسی سے نہیں بنتی۔ وہ کسی کا دبیل ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کی طبیعت میں آزادی اور فقیری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا نہ گھر گھاٹ ہے نہ جورو جاتا۔

جس وقت وہ دونوں باغ سے نکل کر فصیل کی ایک گلی سے شہر کے اندر داخل ہوئے تو رات کے کوئی دس بجے ہوں گے فیاض حیدری کے آگے آگے چلتا، راستہ دکھاتا دو تین گلیوں سے گزر کر آخر اسے اپنے بالا خانے کے نیچے لے آیا۔

استاد تم ذرا یہاں گلی میں ٹھہرو۔ اس نے کہا میں اوپر جا کر پردہ کرا دوں۔"

بہت دیر نی لگانا بابو جی اللہ تمہاری خیر رکھے۔

فیاض سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا۔ اس کی بیٹیاں تو سو گئی تھیں لیکن اصغری حسب معمول جاگ رہی تھی، فیاض نے مختصر الفاظ میں اسے حیدری خاں سے ملنے، اور اپنے ساتھ لانے کا حال سنایا، اور تاکید کی کہ جلدی سے کھانا گرم کر لو۔ پھر وہ لالٹین لے کر نیچے گیا۔ اور حیدری خاں کو اوپر بیٹھک میں لے آیا۔ اس گھر میں باورچی خانے کے علاوہ دو کمرے تھے۔ ایک بڑا جس میں وہ، اس کی بیوی اور بیٹیاں سوتی تھیں۔ دوسرا کچھ چھوٹا جو سیڑھیاں چڑھتے ہی سامنے پڑتا تھا۔ اور بیٹھک کا کام دیتا۔ فیاض اکثر وہاں بیٹھ کر دفتر کا کام کیا کرتا تھا۔ اس میں ایک پرانی دری بچھی تھی، ایک چھوٹی سی میز دو کرسیاں اور کتابوں کی ایک الماری تھی۔

حیدری خاں نے سرود کو بہت احتیاط سے کمرے کے ایک کونے میں رکھ دیا۔ اور خود دری پر بیٹھ کر گردن گھما پھرا کر گھر کا جائزہ لینے لگا۔

کیا کرایہ دیتے ہو اس کا بابو جی؟ اس نے پھر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

پندرہ روپے۔

افوہ! اتنے سے مکان کے پندرہ روپے! بہت کرایہ دیتے ہو تم اس کا بابو جی۔ بجلی بھی تو نہیں ہے اس میں۔

اس کی چندھی آنکھیں پیتل کے اس پرانے لیمپ پر جمی ہوئی تھیں، جو تپائی پر رکھا ہوا تھا۔اور جس کی چمنی کچھ کچھ دھواں دے رہی تھی۔

ہاں استاد کرایہ تو کچھ زیادہ ہی ہے۔فیاض نے کہا۔"پر کیا کروں مدت سے یہیں رہتا ہوں۔اس محلے میں جی لگ گیا ہے۔

ایک لمحہ خاموشی رہی۔پھر حیدری کہنے لگا

لے اب بابو جی جلدی سے کھانا لے آؤ۔اللہ تمہاری خیر رکھے۔

چند منٹ کے بعد اس کے سامنے دستر خوان بچھا کر کھانا چن دیا گیا۔کھانا تو معمولی سا تھا،مگر پکانے والی نے ایسے سلیقے سے پکایا تھا کہ حیدری خان کی زبان چٹخارے لینے لگی۔خوب پیٹ بھر کر کھاؤ استاد۔اور یہ کہہ ک رفیاض نے اپنے حصے ک اسالن بھی جو وہ اندر سے اٹھالایا تھا۔استاد کے سامنے رکھ دیا۔

حیدری خان کے سرود کا ابھی تک اس کے دل و دماغ پر اتنا اثر تھا، کہ اسے کھانے کی زرا اشتہا نہ تھی۔

بس بس بابو جی'' حیدری خاں نے کہا،فقیر کا تو بس دو نوالوں ہی میں پیٹ بھر جاتا ہے۔لے اب بس چائے اور پلوا دو۔اللہ تمہاری خیر رکھے۔

چائے ابھی آتی ہے۔میں نے کیتلی چولھے پر رکھوا دی ہے۔

برتن ہٹا دیے گئے۔اور فیاض حیدری خاں کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا، اور بڑی اشتیاق بھری نظروں سے اس کے سرود کو دیکھنے لگا۔حیدری خاں اس کے اشتیاق کو بھانپ گیا۔وہ کونے سے اپنا ساز اٹھا لایا، اور فیاض کی طرف بڑھا کر کہنے لگا:

لو شوق سے دیکھو بابو جی۔ایسا ساز بھی تم نے کم ہی دیکھا ہوگا۔یہ میرے استاد دل دار خاں مرحوم (کان کی لو چھو کر) کی نشانی ہے۔کئی سرودیوں نے سینکڑوں روپوں کا لالچ دے کر مجھ سے یہ سرود خریدنا چاہا۔مگر میں نے ان کے

روپے پر لات ماردی۔

میری تو جان ہے اس میں بابو جی جیسے پریوں کی کہانی میں جن کی جان طوطے میں تھی۔ مجھے کوئی لاکھ روپے دے تب بھی میں اس سرود کو اپنے سے جدا نہ کروں۔

فیاض نے سرود کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ اچھا تو یہی وہ طلسمی ساز ہے۔ جس سے ایسے ملکوتی سُر نکلتے ہیں۔ وہ بڑے غور سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی عجیب سی بناوٹ، اس کی درجنوں کھونٹیاں، اس کا بڑا سا ڈھانچہ، جس پر کھال منڈھی تھی۔ اس کی سینگ کی بنی ہوئی گھوڑی جس پر سارے تار ٹکے تھے۔ غرض ہر چیز اس کے لئے عجوبہ تھی۔

اس کو بجاتے کس طرح ہیں بھلا؟

فیاض بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

لو میں تمہیں بتاتا ہوں بابو جی۔ حیدری خاں نے کہا۔ پہلے یوں التی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ، جیسے میں بیٹھا ہوں۔ اور سرود کو یوں اپنے آگے رکھ لو، یہ لو جوا، اس کو دہنے ہاتھ کی انگلی میں یوں پکڑو، اور اس طرح تار پر ضرب لگاؤ۔

فیاض نے ایسا ہی کیا۔ ایک منحنی سی آواز نکلی۔

پھر ضرب لگاؤ۔

اب کے آواز کچھ بہتر تھی۔

شاباش بس یونہی ضربیں لگاتے رہو۔ لو اب بایاں ہاتھ سرود کے نیچے سے نکال لو۔ یوں۔ اب پہلی انگلی سے یوں اس تار کو دباؤ۔ اور داہنے ہاتھ سے ضرب لگاؤ۔

دیکھا ایک نئی آواز پیدا ہوئی۔

خاں صاحب ذرا سرود کو تھامنا۔ میں چائے لے آؤں۔

چائے پینے کے بعد موسیقی کی تعلیم پھر شروع ہو گئی۔ حیدری خاں نے فیاض سے کھرج، رکھب، گندھار اور مدھم یہ چار سُر سرود پر نکلوائے۔ اس وقت فیاض کی یہ

کیفیت تھی کہ فرط شوق سے اس کا بند، بند کانپ رہا تھا۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ سرمیرے ہاتھ سے نکل رہے ہیں۔ اس سرودنوازی کی دھن مین اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ رات تیزی سے گزر رہی ہے۔ آخر دوسرے کمرے سے پھر کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ فیاض ناچار اٹھ کر اندر گیا تو اصغری نے کہا:

شاباش ہے تم کو۔۔ بارہ بج لیے مگر تمہاری تن، تن ختم نہ ہوئی۔ اب سونے بھی دوگے کسی کو۔

یہ شریفوں کا محلّہ ہے۔ لوگ کیا کہیں گے آخر؟

تم سچ کہتی ہو۔ اب میں ختم کیا چاہتا ہوں۔

وہ بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں کو گدڑی اوڑھے فرش پر دراز پایا۔ سرود کو اس نے پھر کونے میں رکھ دیا تھا۔ اس سے فیاض کو کسی قدر مایوسی ہوئی۔

بابو جی، حیدری خاں نے گدڑی کے اندر سے کہا۔ رات بہت بیت لی، میں نے سوچا اب کہاں جاؤں۔ یہیں پڑ رہتا ہوں۔ صبح ہوتے ہی چل دوں گا۔ تمہاری خیر ہو ذرا لیمپ کی بتی نیچی کر دینا، پر بجھانا نہیں۔

بہت اچھا فیاض نے کہا، اور وہ لیمپ کی بتی نیچی کر کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے روز صبح دم ابھی سورج نکلنے نہ پایا تھا کہ فیاض بستر سے اٹھ کر بیٹھک میں آ گیا، اس وقت سردی خاصی بڑھ گئی تھی، حیدری خاں اپنی گدڑی میں گٹھڑی بنا سو رہا تھا۔ مگر فیاض کو جیسے سردی کی می بیشی کا کچھ احساس نہ تھا۔ وہ سرود اٹھا کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اور ہلکے ہلکے ان چار سروں کو بجانے لگا۔ جو حیدری خاں نے اسے سکھائے تھے۔ سرود کی آواز سن کر گٹھڑی میں حرکت ہوئی۔ حیدری خاں نے گدڑی مین سے سر نکالا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے سوکھے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ اس نے سر پھر گدڑی کے اندر کر لیا،

فیاض بڑے انہاک سے سرود پر مشق کرتا رہا۔ اس کام میں اسے ایسی طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔ کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی، جب اسے سرود بجاتے ہوئے کافی دیر ہوگئی تو اس کی دونوں بیٹیاں نجمہ اور سلمہ بھی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔ دونوں نے سر اور کانوں کو اونی رنگ دار گلو بندوں سے ڈھانک رکھا تھا۔ نجمہ کی عمر گیارہ سال تھی اور سلیمہ کی نو برس۔ دونوں بڑی پیاری پیاری بچیاں تھیں۔ وہ ایک معصومانہ ادا کے ساتھ جس میں حیرت کے ساتھ ساتھ تمسخر کا عنصر بھی شامل تھا۔ باپ کو یہ بڑا سا عجیب و غریب ساز بجاتے دیکھنے لگیں۔

ہنسی ان کے ہونٹوں پر آتے آتے رک جاتی۔

میں نے کہا۔ آج دفتر نہیں جاؤ گے۔ اصغری نے چلمن کے پیچھے سے کہا۔ اتوار ہے بھئی اتوار ہے۔

یہ کہہ کر فیاض پھر سرود بجانے میں مشغول ہو گیا۔ اصغری نے حیدری خاں کو گدڑی میں منہ چھپائے بے خبر سوتے دیکھا تو دوپٹہ سنبھالتی ہوئی بیٹھک میں چلی آئی اور فیاض کے کان کے قریب منہ لا کر کہنے لگی۔

یہ کب دفان ہوگا؟

خدا کے لیے چپ رہو۔ کہیں سن نہ لے۔ بڑا صاحب کمال آدمی ہے۔

ہوا کرے۔ میں پوچھتی ہوں یہ جائے گا کب؟

بس ناشتہ کرا کے بھیج دیں گے۔ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ کہیں اٹھ نہ بیٹھے۔

کوئی دس بجے کے قریب حیدری خاں جمائیاں لیتا اپنی کالی کالی انگلیوں کو جن کے ناخن بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے اور ان میں میل بھرا تھا۔ چٹختا تا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ فیاض ابھی تک سرود بجانے میں منہمک تھا۔ اس تین چار گھنٹے کے ریاض سے اسے ان چاروں سروں کی خوب مشق ہوگئی تھی۔ سر روانی اور کے ساتھ نکلنے لگے تھے۔ حیدری خاں کو فیاض کے اس انہاک پر اچنبھا سا ہوا۔

لو بابو جی۔ اب تم گنڈا بندھوانے کی فکر کرو۔ تم نے تو کمال ہی کر دیا۔ تم تو سچ مچ بجانے لگے۔ مجھے اب تک جو شاگرد ملا کوڑھ ہی ملا۔ تم جیسا ذہین شاگرد ہو تو تین مہینے میں استاد نہ بنا دوں تو میری مونچھیں منڈوا دینا۔ پر یہ سن رکھ میاں میری ٹیوشن کی فیس سو روپیہ مہینہ۔ یہ کہہ کر وہ ہنسنے لگا۔ ایک بات ہے بابو جی ماشاءاللہ سے تمہارے ڈیل ڈول پر یہ ساز پھبتا بھی خوب ہے۔ شیر کے بچے معلوم ہوتے ہو شیر کے بچے!''

ناشتہ ہو لیا مگر حیدری خاں کے رخصت ہونے کے آثار دکھائی نہ دیئے۔ اس پر دوسرے کمرے میں اصغری نے پھر کنڈی کھٹکھٹائی، فیاض اٹھ کر اندر گیا۔

میں نے کہا آج سودا سلف نہیں آئے گا، تم کو گانے بجانے میں کھانے پینے کی سدھ بھی نہ رہی، مگر بچوں کو تو بھوکا نہ مارو۔

اوہو میں تو بھول ہی گیا، لو ابھی بازار جاتا ہوں،

جس وقت فیاض کپڑے بدل کر بیٹھک میں آیا تو حیدری خاں بھی سر پر اپنی میلی سی بے پھندنے کی ٹوپی رکھ کر سرود بغل میں دبا، گدڑی سنبھال چلنے کو تیار کھڑا تھا۔ فیاض کا منہ اتر سا گیا۔

کیوں استاد کہاں چل دیے

''ذرا جا کر نشہ پانی کروں'' حیدری خاں ن جمائی لیتے ہوئے کہا۔ ایک روپیہ ہو تو دلوا دو،

فیاض فوراً اندر جا کر روپیہ لے آیا۔

خیر ہو بابو جی کی۔ اس نے روپیہ واسکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا شاید شام کو پھر آنا ہو۔

اس نے ایک اور جمائی لی۔ واقعی اس کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ وہ دروازے کی طرف چلا۔ جب تک وہ سیڑھیاں اتر نہ گیا، فیاض برابر دروازے میں کھڑا اسے جھانکتا

رہا۔اس کے جانے کے بعد اچانک فیاض کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ کاش حیدری خاں اپنا سرود یہاں چھوڑ جاتا۔اوروہ آج چھٹی کے دن خوب مشقیں کرتا۔ وہ کھویا کھویا سا چارپائی پر لیٹ گیا۔رات سے اس پر مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔اسے نیند بھی اچھی طرح نہ آئی تھی۔

اصغری نے اس کی اداسی کو بھانپ لیا۔

یہ ایکا ایکی کیسا شوق لگ گیا ہے۔تمہیں۔ڈوم دھاری بنو گے۔اور یہ موافقیر،،،

،،،

فیاض نے اس کی بات کاٹ کر کہا

جس کو تم موافقیر کہتی ہو، ملک میں جواب نہیں اس کا۔

"بلا سے نہ ہو۔ بھاڑ میں جائے۔ مجھے تو یہ ڈر ہے، کہ نامراد نے گھر دیکھ لیا ہے۔اب تو روز ہی آدھمکا کرے گا۔

کاش ایسا ہی ہو۔

تو کیا ساز بجانا سیکھو گے تم؟

کاش میں اسے سو روپیہ ٹیوشن کی فیس دے سکتا!

اصغری کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

سودا سلف آیا کھانا پکا،میاں بیوی اور لڑکیاں کھانے بیٹھیں۔مگر فیاض نے دو چار نوالوں کے بعد ہاتھ کھینچ لیا۔اصغری نے یہ حال دیکھا تو اسے سچ مچ تشویش ہونے لگی۔پچھلے چند گھنٹوں میں وہ اسے بہت بدلا ہوا پا رہی تھی۔وہ نہ تو اس کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا، نہ اس کی بات غور سے سنتا نہ ڈھنگ کا جواب دیتا۔لڑکیوں کی طرف بھی اس کی کچھ توجہ معلوم نہ ہوتی تھی۔

دن ڈھل گیا، شام ہوگئی۔ چراغ جل گئے مگر حیدری خاں نہ آیا، فیاض بار بار سیڑھیوں میں جھانکتا۔پھر آ کر بستر پر لیٹ جاتا۔پھر اٹھ بیٹھتا۔اس کی بے چینی

بڑھتی ہی جارہی تھی، آخر آٹھ بجے سیڑھیوں میں کسی کے کھنکارنے کی آواز سنائی دی یہ حیدری خاں ہی تھا، وہ جھوم رہا تھا، اس کی آنکھیں پچھلی رات سے زیادہ سرخ تھیں۔ اس کے حواس بجا نہ تھے۔ معلوم ہوتا تھا، آج اس نے زیادہ ہی نشہ پانی کرلیا ہے۔ سرود کو دیکھ کر فیاض کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ لو میاں آ گئے۔ تم بھی کیا یاد کرو گے، یہ کہہ کر وہ آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گیا۔

فیاض میاں زرا بہو سے کہہ کر چائے بنوا لو۔ ب سچائے ہی، میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔

پھر نہ جانے کیا ترنگ اٹھی وہ سرود بجانے لگا۔ ابتدا تو بڑے جوش خروش سے کی، مگر دو ہی منت بعد انگلیاں سست پڑنے لگیں۔ اور جب اندر سے چائے بن کر آئی تو وہ سرود پر جھکا خراٹے لے رہا تھا۔

فیاض نے اس کا شانہ پکڑ کر ہلایا۔ مگر اس پر ایسی بے ہوشی کی نیند طاری تھی کہ مطق آنکھ نہ کھولی۔

فیاض نے سرود کو اس کی گرفت سے آزاد کر کے اسے آہستگی سے فرش پر لٹا دیا۔ اور گدڑی اوڑھا دی۔ پھر بڑے اشتیاق کے ساتھ سرود کو اٹھا کر بجانا شروع کر دیا۔

اگلے روز حیدری خاں کی آنکھ صبح سویرے ہی کھل گئی، دیکھا کہ فیاض اس کے قریب ہی بیٹھا اس کے بتائے چاروں سروں کی مشق کر رہا ہے۔ وہ سراہے بغیر نہ رہ سکا۔

فیاض میاں، ماشا اللہ کیا سچے سر نکال رہے ہو واہ۔ واہ جی خوش ہو گیا۔ آج میں تمہیں اگلے تین سر بھی بتادوں گا۔ پھر سپتک مکمل ہو جائے گا۔

اور سچ مس تھوڑی دی ر میں حیدری خاں نے پنچم دھیوت، اور نکھاد کے سر بھی فیاض سے نکلوا دیے۔

خوشی سے فیاض کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، مگر جلد ہی بادل نخواستہ اسے موسیقی

کی یہ تعلیم ختم کرنا پڑی۔ کیونکہ آٹھ بجنے والے تھے، اور اسے دفتر جانے کے لئے تیا رہونا تھا۔

حیدری خاں نے ناشتے کے بعد اپنا سر و دا ٹھایا، اس دفعہ اسے روپیہ مانگنے کی ضرورت نہ پڑی، فیاض نے خود ہی اسے اندر سے روپیہ لا کر دے دیا تھا۔

خوش رہو میاں حیدری خاں بولا۔ پھر چند لمحے تامل کے بعد اس نے بڑے گھمبیر لہجے میں کہنا شروع کیا:

سنو میاں اگر تمہیں مجھ سے سیکھنا ہے تو تمہیں میری تین شرطیں ماننا ہوں گی۔ یوں تو یہ شرطیں بہت آسان معلوم ہوں گی۔ پر غور کرو تو دشوار بھی بہت ہیں۔ کیونکہ میں سڑی مشہور ہوں ذرا بھی کام میری مرضی کے خلاف ہو تو مجھے بڑا قلق ہوتا ہے۔ اپنی اس بدمزاجی ہی کی خاطر میں نے فقیری قبول کی ہے۔ لو اب وہ شرطیں بھی سن لو، اول یہ کہ صبح تمہیں میرے ناشتے اور نشے پانی کا انتظام کرنا ہوگا۔ دوپہر کو میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ صبح ادھر تم دفتر کو چلے ادھر میں کھسکا، شام کو جب تم دفتر سے آ چکو گے تو میں بھی پھر پھرا کر پہنچ جایا کروں گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ہم رات کا کھانا ساتھ ساتھ کھائیں گے۔ اور تیسری شرط یہ ہے کہ میں سویا یہیں بیٹھک میں کروں گا۔ وہ جو میں نے سو روپیہ مہینہ ٹیوشن کی بات کی تھی، وہ تو میں تم سے مذاق کرتا تھا۔ میاں مجھے روپے ک الالچ ہوتا تو حویلیاں نہ کھڑی کر لی ہوتیں۔ اب تک، بس یہی ہیں میری تین شرطیں۔ اگر تمہیں منظور ہو تو بسم اللہ۔

فیاض کچھ دیر گردن جھکائے سوچتا رہا، اور جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی نظر چلمن پر پڑی۔ حیدری خاں کی طرح اصغری بھی اس کے جواب کی منتظر تھی،

"خاں صاحب، اس نے دھیمی مگر فیصلہ کن لہجے میں کہا۔" مجھے آپ کی تینوں شرطیں منظور ہیں۔

آج سے آپ میرے استاد ہیں۔

اسی شام حیدری خاں اپنا بوریا بندھنا لے کر فیاض کے ہاں اٹھ آیا، یہ بوریا بندھنا کیا تھا، ٹین کا ایک ٹرنک جس کا روغن اڑا ہوا تھا۔ اور کنڈا غائب، حیدری خاں نے اسے بند کرنے کے لئے رسی باندھ رکھی تھی،

ایک مٹی کا سڑا سا حقہ اور ایک پیالہ۔

اصغری کے دل کو چوٹ تو لگی اور اس نے کچھ آنسو بھی بہائے۔ مگر وہ طبعاً ان اطاعت گزار بیویوں میں سے تھی، جو شوہر کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ اور ہر حال میں ان کی خوشنودی کی جویا رہتی ہیں۔ موسیقی سے میاں کے اس جنون کی حد تک بڑھے ہوئے شوق کو دیکھ کر اس نے زیادہ مزاحمت نہ کی۔ اور حیدری خاں کا اپنے ہاں رہنا منظور کر لیا۔ دو چار دن میں اسے حیدری خاں کی سرشت کا اندازہ بھی ہو گیا تھا۔ وہ نشہ باز تو تھا مگر بدنظر ہرگز نہ تھا۔ پرائی بہو بیٹیوں کو اسے تانکنے جھانکنے کی عادت نہ تھی، وہ اصغری کو ہمیشہ بہو یا بیٹی کہہ کر پکارتا، اور جب تک فیاض باہر رہتا گھر کے نزدیک نہ پھٹکتا۔

سب سے پہلے فیاض کو حیدری خاں کی ظاہری حالت سدھارنے کی فکر ہوئی، حیدری خاں بہتیرا منع کرتا رہا، مگر اس نے ایک نہ سنی۔ اس نے خاں صاحب کے لئے ایک نیا جوڑا سلوایا۔ اس کے پاس بڑھیا سیاہ کپڑے کی شیروانی تھی، جسے وہ کبھی کبھی پہن لیا کرتا تھا، یہ شیروانی ایک دو جگہوں سے مسک تو گئی تھی، لیکن پھر بھی اچھی حالت مین تھی، وہ اسے ایک درزی کے پاس لے گیا اور اسے قطع برید کرا کے خاں صاحب کے ناپ کا بنوالیا۔ پھر اس نے خاں صاحب کی ترکی ٹوپی کو دھلوا کر اس میں ایک نیا پھندنا لگوا دیا۔ پھر ان سب چیزوں کو سوٹ کیس میں رکھ کر، خاں صاحب کو ساتھ لے کر ایک حمام میں پہنچا، وہاں پہلے تو خاں صاحب کے پٹوں کو مختصر کرایا، داڑھی منڈوائی مونچھوں کو ترشوایا، ناخن کٹوائے۔ پھر حمام والے سے دو تین مرتبہ پانی بھروا کر اسے خوب نہلوایا، اس کے کپڑے بدلوائے۔ جس وقت

حیدری خاں حمام سے نکلا تو وہ اچھا خاصا معقول انسان نظر آنے لگا۔

اس وقت دو پہر ہو چکی تھی، ظہر کا وقت قریب تھا۔ دونوں گھر واپس آ رہے تھے۔ راستے میں ایک مسجد نظر آئی، حیدری خاں وہیں ٹھہر گیا۔ اس نے بڑی رقت بھری آواز میں فیاض سے کہا:

فیاض بیٹے آج بڑی مدت کے بعد پاک صاف ہوا ہوں، اور کپڑے بھی پاک ہیں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ آج میں اپنے مولا کے سامنے ذرا سر جھکا لوں۔

فیاض کو کچھ تعجب تو ہوا، مگر اس نے خاں صاحب کی خواہش کو رد نہ کیا، اور وہ دونوں دوسرے نمازیوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب حیدری خاں مسجد سے نکلا، تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو گئی تھی۔ لباس کی اس تبدیلی کیساتھ ہی اس کے طور طریقے ایک دم بدل گئے۔ اس کی زبان سے وہ بات بات پر دعائیہ کلمات کا نکلنا بند ہو گیا، اس کے بجائے اس کے انداز تخاطب میں ایک تحکم پایا جانے لگا، جس وقت فیاض اس کے ساتھ بازار سے گزر رہا تھا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا، جیسے کوئی مودب شاگرد استاد کے ساتھ ساتھ جا رہا ہو۔

اصغری نے حیدری خاں کی یہ سج دھج دیکھی تو حیران رہ گئی۔ اسے پہلے پہل اس شخص سے جو کراہت محسوس ہوئی تھی، وہ جاتی رہی۔ حیدری خاں نجمہ اور سلیمہ سے بڑی شفقت سے پیش آنے لگا۔ فیاض اسے نشہ پانی کے لئے جو ایک روپیہ دیتا۔ وہ اس میں سے دو تین آنے بچا کر بچیوں کے لیئے کچھ مٹھائی یا پھل ضرور خرید لاتا۔ بچیاں چند ہی روز میں اس سے خوب مانوس ہو گئیں۔ وہ اسے خان صاحب جی کہہ کر بلاتیں۔

حیدری خاں اصغری کے کھانا پکانے کی بھی دل سے تعریف کرتا۔

وہ کہتا بیٹی سبحان اللہ، کیا لذیذ کھانا پکاتی ہو۔ جو راجوں اور نوابوں کو بھی نصیب نہیں۔ ان کے کھانوں میں تو بس تکلف ہی تکلف ہوتا ہے۔ مزہ خاک بھی نہیں۔

رفتہ رفتہ اس کی تعریفوں میں اصغری کو مزہ آنے لگا۔

وہ کوئی بھی خاص چیز پکاتی تو دل میں کہتی، دیکھیں آج خاں صاحب کیا کہتے ہیں۔ اب خاں صاحب پر گھر میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی، کیونکہ اصغری نے میاں کا عندیہ پا کر ان سے پردہ کرنا چھوڑ دیا تھا، وہ حیدری خاں سے کہا کرتی، خان صاحب آپ دوپہر کا کھانا بھی گھر آ کر کھا کریں، مگر حیدری خاں کو یہ وقت تکیوں میں گزارنا زیادہ پسند تھا۔

ادھر رفیاض خاں کے ذوق شوق کو دیکھ کر حیدری خاں نے اسے پوری توجہ سے تعلیم دینا شروع کر دی۔ اس نے مہینے ڈیڑھ مہینے کے اندر ہی فیاض کو دو تین راگوں کی الاپ اور گتیں بھی سکھا دی تھیں۔ اور اب فیاض سرودنوازی میں دن بدن ترقی کرنے لگا تھا۔ اگر چہ اس پر حیدری خاں کے اخراجات کا پورا بوجھ پڑ گیا تھا۔ جس سے وہ بہت تنگ دست ہو گیا تھا۔ لیکن وہ بہت خوش تھا۔ ایسا خوش کہ زندگی میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

چونکہ حیدری خاں نے بازاروں میں بیٹھ کر سرود بجانا اور مانگنا ترک کر دیا تھا، اس لئے اس کا سرود زیادہ تر گھر ہی میں رہتا تھا۔ اس نے فیاض کو پوری اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب تک چاہے اس کے سرود پر ریاض کرتا رہے۔ فیاض صبح کو دفتر جانے سے دو گھنٹے پہلے خوب ریاض کیا کرتا تھا۔ دفتر میں بھی سارا دن اس کی انگلیاں فائلوں پر یوں دوڑتی رہتیں، جیسے وہ سرود بجا رہا ہو، اب وہ ٹھیک پانچ بجے دفتر سے چھٹی کر لیتا، اور شہر کے پرشور بازاروں، اور تنگ گلیوں سے ہوتا ہوا، جلد سے جلد گھر پہنچ جاتا۔ چھٹی کے روز اسے سرود ہاتھ سے چھوڑنے کی قسم ہو جاتی۔

تھوڑے ہی دنوں میں حیدری خاں کے دل میں فیاض کی انسیت بے حد بڑھ گئی۔ وہ اس سے اس طرح پیش آتا جیسے باپ اپنے بیٹے سے۔ وہ اب تکیوں مین زیادہ نہ ٹھہرتا۔ بلکہ فیاض کے دفتر آنے سے گھنٹہ دو گھنٹے پہلے ہی گلی میں چارپائی

ڈال کر بیٹھ جاتا، اکثر اوقات وہ اکیلا ہی ہوتا مگر کبھی کبھی اس کے یہ دو تین دوست بھی آ کر اس کے ساتھ بیٹھ جاتے، اس پر گلی میں گانے بجانے کے لمبے لمبے تذکرے چل نکلتے۔

میاں جانتے ہو لفظ موسیقی کے معنے کیا ہیں؟ حیدری خاں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتا۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے استاد دل دار خان (کان کی لو چھو کر کہتا) کہا کرتے تھے۔ کہ یہ یونانی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں ہوا میں گرہ لگانا۔ اب تم خود ہی اندازہ کرلو، کہ یہ فن کس قدر مشکل ہے۔

پھر وہ مکان کی طرف منہ کر کے پکارتا۔ نجمہ بیٹی دو تین پان بھیج دینا۔

کبھی کبھی فیاض کو بھی استاد کی خوشی کے لئے گلی میں بیٹھ جانا پڑتا۔ ایسے موقع پر حیدری خاں اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر کہتا، میاں یہ عطائی اب تم سب کے گنڈا باندھے گا۔ ہے تو مولوی کا بیٹا۔ مگر خدا کی دین ہے ہاتھ ایسا سریلا ہے۔ کہ سر دیوں کے گھروں کے لونڈوں کا بھی کیا ہوگا۔

اور فیاض کے ماتھے پر شرم سے پسینہ آ جاتا۔ اور وہ نظریں نیچی کیے یہ باتیں سنتا رہتا۔ ایسے میں جو لوگ گلی میں آ جا رہے ہوتے۔ ان کی نظریں بے اختیار اس منڈلی پر اٹھ جاتیں، اور وہ تھوڑی دور تک ادھر ادھر مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے چلے جاتے۔

یہ محلّہ خاص شرفا کا تھا، زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ ہی یہاں رہتے تھے۔ مگر کچھ گھر کھاتے پیتے لوگوں کے بھی تھے، کچھ مولویوں اور ثقہ قسم کے لوگوں کے تھے، تین تین مسجدیں اس چھوٹے سے محلے میں تھیں، علی الصباح مرغوں کی ککڑوں کوں کے ساتھ ہی آگے پیچھے مسجدوں سے آوازیں آنے لگتیں۔ اور سارے محلے پر اک تقدس کی فضا چھا جاتی۔

فیاض کو اس محلے میں رہتے ہوئے دس برس ہو چکے تھے اس عرصے مین کبھی کسی کو شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ سب لوگ اسے کاموش، کم آمیز، اور شریف سمجھ کر پسند

کرتے تھے۔مگراب حیدری خاں کے آجانے کی وجہ سے گھر پر جو دن رات ہنگامہ رہنے لگا۔تو اس پر محلے والے ٹھٹھکے۔انہیں تعجب تھا، کہ فیاض نے اپنے گھر پر ایسے عجیب وغریب قماش ک یلوگوں کے تسلط کو کیسے گوارہ کرلیا۔پھر فیاض کو یہ بھی تو احساس نہیں، کہ ان لوگوں کی بیہودہ حرکات کا اسکی زوجہ اور معصوم بچیوں کے اخلاق پر کتنا گھناونا اثر پڑتا ہوگا۔جگہ جگہ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ناراضگی کی لہر بڑھتی چلی گئی۔یہاں تک کہ ایک شام جب فیاض دفتر سے گھر آرہا تھا،تو گلی کے موڑ پر اس کی مڈھ بھیڑ محلے کی بڑی مسجد کے امام صاحب سے ہوئی۔

السلام علیکم۔امام صحب نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔اور یوں گویا ہوئے۔ برادر میں کئی دن سے آپ سے ملنا چاہتا تھا۔وہ بات یہ ہے کہ آپ کوموسیقی سے از حد لگاؤ پیدا ہوگیا ہے۔ہرچند اسلام میں خوش آوازی اور لحن کو بڑا درجہ حاصل ہے۔ مگر استغفراللہ۔یہ خرافات جو دن رات آپ کے گھر پر ہوتی رہتی ہے۔ان کی تو کسی صورت اجازت نہیں ہے۔بلا شک آپ اپنے فعل کے خود مختار ہیں۔اور رب العزت کے سامنے آپ خود جواب دہ ہوں گے۔مگر یہ مسئلہ صرف آپ کی ذات تک محدود نہیں ہے۔بلکہ پورے محلے پر آپ کی خرافات کا اثر پڑ رہا ہے۔

میں امید کرتا ہوں کہ جناب ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔اور ان لغویات سے جلد چھٹکارہ حاصل کرلیں گے۔بس مجھے یہی کہنا تھا۔

جس وقت فیاض گھر پہنچا،تو وہ بڑا دل شکستہ اور رنجیدہ تھا۔اتفاق سے ابھی حیدری خاں گھر نہیں آیا تھا۔فیاض سیدھا اپنے کمرے میں جا کر چارپائی پر لیٹ گیا۔گواس کا دل ریاض کرنے کے لئے بے چین تھا۔مگر اسے سرود کو ہاتھ لگانے کی جرات نہ ہوئی۔وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔اصغری نے ج واس کی یہ حالت دیکھی تو پوچھا۔

نصیب دشمناں کچھ طبیعت خراب ہے آپ کی۔

نہیں تو، مگر فیاض بستر سے نہیں اٹھا۔

آخر جب شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تو حیدری خاں آیا۔ فیاض سیڑھیوں ہی سے اس کے قدموں کی چاپ سن کر جلدی سے سرود اٹھا بجانے بیٹھ گیا۔ وہ ان استاد سے ڈرنے لگا تھا۔ اور اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا، کہ اس نے دو گھنٹے یونہی ضائع کر دیے۔

فیاض بیٹے، حیدری خاں نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہا۔ تھک گئے ہو تو ذرا دم لے لو۔ آج میں نے ایک واقف کار کے ذریعے تمہارے لئے بمبئی سے اچھا سا سرود منگوانے کا بندوبست کرلیا ہے۔ اب خدا نے چاہا تو طبلچی کا بھی انتظام ہو جائے گا۔

فیاض نے تشکر آمیز نگاہوں سے استاد کی طرف دیکھا، مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد حیدری خاں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اتنے ہی میں کھانے کا وقت ہو گیا۔ اور یوں فیاض اس شام سرود سے کنارہ کش ہی رہا۔ مگر اس کے دل میں اہل محلّہ اور امام مسجد کے خلاف سخت غصہ بھرا ہوا تھا۔

اگلے روز فیاض وقت سے پہلے ہی دفتر چلا گیا۔ دوپہر کو حیدری خاں ایک شخص کو ساتھ لیے ہوئے آیا، جس کی وضع قطع پنڈتوں کی سی تھی۔ پردہ کرا دیا گیا۔ اور وہ دونوں بیٹھک میں فرش پر بیٹھ گئے۔ ٹھیک اسی وقت نجمہ اور سلیمہ استانی سے پڑھ کر گھر واپس آئی تھیں۔ انھوں نے حیدری خاں کو سلام کیا۔

جیتی رہو میری بچیو۔ حیدری خاں نے شفقت بھرے لہجے میں کہا۔ ہاں بھئی ذرا بستے رکھ کر ادھر آ جاؤ۔ آج ہم تمہارا امتحان لیں گے۔

دونوں لڑکیاں بستے ماں کے حوالے کر کے حیدری خاں کے سامنے ادب سے بیٹھ گئیں۔ حیدری خاں نے سرود اٹھایا اور اس کا ایک سر بجا کر نجمہ سے کہا،

بیٹی ذرا اونچا آواز سے کہو آ۔ یوں،

لڑکی ذہین تھی، تھوڑی مشق کے بعد اس نے سر کے ساتھ اپنی آواز ملادی، اس پر حیدری خاں نے اپنے ساتھی پنڈت کی طرف پرمعنی نظروں سے دیکھا، اور کہا

"کیوں کالکا پرشاد،

کالکا پرشاد نے تحسین آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے سر ہلایا، اس کے بعد چھوٹی بہن سلیمہ کی باری تھی، وہ اپنی آپا کو آواز ملاتے دیکھ چکی تھی، اس لئے وہ جلد ہی اس امتحان میں پوری اتر گئی۔ ایک بار پھر حیدری خاں نیا پنے ساتھی کی طرف دیکھ کر کہا،

کیوں کالکا پرشاد جی؟

کالکا پرشاد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی، اس نے دو تین مرتبہ ہوں ہوں کہا، اس کے بعد حیدری خاں نے نجمہ اور سلیمہ سے کہا:

"بس جاؤ شاباش، شاباش، منہ ہاتھ دھو کر کھانا کھاؤ۔"

جب لڑکیاں چلی گئیں، تو وہ کالکا پرشاد سے کہا:

شام کو ان کا باپ آئے گا تو بات کروں گا۔ پھر وہ تھوڑی دیر کے بعد اپنے دوست کو لے کر چلا گیا۔

اس شام جب فیاض دفتر سے آیا تو اصغری بھری بیٹھی تھی، اسے دیکھتے ہی برس پڑی،

دیکھو جی اب تک تو ہم تمہاری سب باتیں مانتے چلے گئے ہیں، مگر اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ میں اپنی لڑکیوں کو ہرگز ہرگز گانا نہ سیکھنے دوں گی۔

کچھ بتاؤ تو سہی ہوا کیا، تم تو معموں میں بات کر رہی ہو،

آج دوپہر کو حیدری خاں صاحب آئے تھے، ان کے ساتھ کوئی پنڈت جی بھی تھے، نجمہ اور سلیمہ بھی اسی وقت اسکول سے آئی تھیں، پہلے حیدری خاں نے لڑکیوں کو گوایا، پھر نہ جانے آپس میں چپکے چپکے کیا باتیں کرتے رہے، میں چلمن میں سے

سب دیکھتی رہی۔ سنو جی اگر حیدری خاں صاحب چاہیں کہ میری معصوم بچیاں رنڈیوں کی طرح ناچنے گانے لگ جائیں۔تو یہ ہونے کا نہیں، چاہے ان کو لے کر مجھے میکے ہی میں کیوں نہ بیٹھنا پڑے۔

فیاض کچھ کہنے ہی والا تھا کہ، حیدری خاں بھی آ گیا،

فیاض بیٹے'' اس نے بیٹھک میں قدم رکھتے ہی کہنا شروع کیا، اللہ تمہاری عمر میں برکت دے، میں تم سے ایک بہت ضروری بات کہنا چاہتا ہوں، اور اصغری بیٹی اللہ تمہارا سہاگ قائم رکھے، ت وبھی کان دھر کے سن، تم دونوں نے یہ کبھی یہ بھی سوچا، کہ دونوں لڑکیاں ماشا اللہ سے دو تین برس میں جوان ہونے کو ہیں۔تم نے ان کی شادی بیاہ کی بھی فکر کی، مجھے تو نظر آتا نہیں، کہ تم نیان کے لئے کچھ جہیز جمع کیا ہو، اور پھر تم کر بھی کیا سکتے ہو؟

ڈیڑھ سو روپے کی بھلا حقیقت ہی کیا ہے۔آخر تم ان معصوم بچیوں کو کس طرح نیگ لگاؤ گے۔کسی کنجڑے قصائی کو تو خدانخواستہ بیٹی دینے سے رہے۔دفتروں کے بابو جن کو تیس، چالیس روپلی سے زیادہ تنخواہ نہیں ملتی۔ان کو لڑکی دینا ایسا ہی ہے۔ جیسے بھاڑ میں جھونک دینا۔بچیاں ماشا اللہ سے ایسی ہیں، جیسے چاند کا ٹکڑا۔ان کو تو کسی قدر دان رئیس کے ہاں رانی بن کر راج کرنا چاہیئے۔مگر میاں صاحب زادے امیر لوگ شادی بیاہ کے معاملے میں بڑی مین میخ نکالتے ہیں۔لڑکی ،خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو، بہت سا جہیز لائے ،اور پھر اسے کوئی ہنر بھی آتا ہو، جیسے گانا یا مصوری۔ مگر ان بچیوں میں سوائے شکل وصورت کے رکھا ہے کیا ہے۔

مجھے کئی دن سے اس بات کی بڑی فکر تھی، تم دونوں میاں بیوی ت وسو جاتے تھے، مگر میں رات رات بھر اس فکر میں غلطاں وپیچاں رہتا تھا۔آخر سوچ سوچ کر میں نے یہ ترکیب نکالی ہے، کہ ان لڑکیوں کو تھوڑا سا ناچ گانا سکھا دیا جائے۔تم جانو آج کل امیر ،امرا، میں ناچ گانے کا شوق کس قدر ترقی پر ہے۔پہیل ہندوؤں نے

یہ بات شروع کی تھی، ان کی دیکھا دیکھی اب مسلمان بھی اپنی بیٹیوں کو گانا بجانا سکھلانے لگے ہیں۔

میں دوپہر پنڈت کالکا پرشاد کو یہاں لایا تھا۔ وہ شہر کے نامی کتھک ہیں۔ نواب شمشیر علی خاں کی لڑکیاں، رائے بہادر سنتانم کی لڑکیاں، چودھری نیک عالم کی لڑکیاں آج کل ان سے سیکھ رہی ہیں۔ ان تین گھرانوں کو تو میں جانتا ہوں، اللہ جانے اور کتنے گھروں میں جاتے ہوں گے۔

تو میاں صاحب زادے خدا شاہد ہے تم مجھے اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ عزیز ہو، اور اصغری بیگم تو بھی میری سگی بیٹیوں سے کم نہیں۔ میں نے ج وبات سوچی ہے۔تمہارے بھلے کے لئے سوچی ہے، میرے نہ آل ہے نہ اولاد۔ جو کچھ ہو تم ہو، پھر میں تمہارا برا کیوں چاہوں گا۔

اس تقریر کے آخری حصے کے دوران حیدری خاں کی آواز شدت جذبات سے بھرا گئی۔اور ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے، آخر وہ کرتے کے دامن سے آنسو پونچھتا ہوا اٹھا، اور یہ کہتا ہوا اٹھا، اور سیڑھیوں کی طرف چلا۔

تم دونوں خوب سوچ سمجھ لو۔ اگر منظور ہوت وکل سے بچیوں کی تعلیم شروع کر ادی جائے،،،، لو اب میں چلتا ہوں، میرے کچھ دوست نیچے کھڑے ہیں۔ مجھے ان سے کچھ کام ہے۔ میں ذرا دیر سے آؤں گا۔

اس کے جانے کے بعد فیاض اور اصغری دیر تک خاموش بیٹھے دیر تک۔ ایک دوسرے کا منہ تکا کیے آخر فیاض نے سکوت توڑا:

کہو کیا کہتی ہو؟

''میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں، اصغری نے جواب دیا۔

''میرا خیال ہے، حیدری خاں جو کہتے ہیں، درست ہی کہتے ہیں، واقعی ہی ہم نے بچیوں کے مستقبل کا کچھ خیال نہیں کیا، اور جو تمہیں اس میں برائی نظر آتی ہو

تو ہمارے ہوتے، کوئی کیا کر سکتا ہے۔

میرا خیال ہے ہمیں اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔

،میں کچھ نہیں جانتی، تم خود مختار ہو جو چاہے کرو،

حیدری خاں کوئی رات دس بجے گھر آیا۔ اصغری نے اس کے لئے اور فیاض کے لئے کھانا گرم کیا۔ کھانے کے دوران میں فیاض نے مسجد کے امام سے اپنی ملاقات کا حال سنایا۔ حیدری خاں سنتے ہی کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

وہ تو میں پہلے ہی سمجھے ہوئے تھا، بیٹے مگر تم کوئی فکر نہ کرو، اپنے کام سے کام رکھو۔ جب دیکھیں گے کوئی چارہ نہیں تو اس محلے ہی کو چھوڑ دیں گے

یہ سن کر فیاض کی کچھ ہمت بندھی اور اس نے ریاض شروع کر دیا۔

اس واقعہ کے دو دن بعد ہی لڑکیوں کے ناچ گانے کی تعلیم شروع ہو گئی۔ اب محلے والوں کے کانوں میں کچھ اس قسم کی آوازیں، گھنگھروں کے ساتھ مل کر سنائی دینے لگیں۔

تا، تت، تھئی۔ تا۔ تت۔ تھئی۔ تا، تت۔ تھئی۔ ایک دو تین چار۔ ایک دو تین چار۔ تا تت، تھئی۔ تا تت تھئی۔ تا تت، تھئی۔ ایک دو تین۔ ایک دو تین۔

اگلے روز جب نجمہ اور سلیمہ استانی کے ہاں پڑھنے گئیں، تو پانچ منٹ بعد ہی بستے اٹھائے واپس آ گئیں۔

استانی نے بچیوں سے کہا تم یہاں نہ آیا کرو۔

اسی روز شام کو مالک مکان فیاض سے ملنے آیا۔ وہ سر جھکائے تھا شرم کے مارے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

پچھلے دس برس میں اسے فیاض سے کسی قسم کی شکایت پیدا نہ ہوئی تھی۔ نہ فیاض نے مکان کی مرمت کے لئے کہا، نہ سفیدی کرانے کے لئے۔ اور کرایہ ہر مہینے پیشگی ہی بلا ناغہ اس کی دکان پر پہنچ جاتا تھا۔

All rights reserved ©2002-2006

معاف کیجیئے گا فیاض صاحب، آخر اس نے زبان کھولی۔ ''میں آپ کی بڑی عزت کرتا ہوں، خواہ آپ کو گانے بجانے کا شوق ہی کیوں نہ ہو۔ سچ پوچھئے تو مجھے بھی موسیقی سے دل چسپی ہے۔ مگر کیا کروں ان کم بخت محلے والوں نے میری دکان پر آ آ کر ناک میں دم کر دیا ہے۔ آپ کے ہاں کا نقشہ اتنے بھیانک طریقے سے کھینچتے ہیں۔ گویا محلے بھر کی بہو بیٹیوں کی عزت خطرے میں پڑ گئی ہے۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔ مگر اتنے آدمیوں کے سامنے مجھ اکیلے کی کچھ پیش نہیں چلتی، آپ جیسے شریف اور ایمان دار کرائے دار کو گنوا کر مجھے بڑا دکھ ہو گا۔ مگر کیا کروں مجبور ہوں۔ امید ہے آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔

میں سمجھ گیا ہوں فیاض نے کہا آپ فکر نہ کریں۔ میں ہفتے بھر میں مکان خالی کر دوں گا۔

جب یہ ماجرا حیدری خاں کے کانوں تک پہنچا، تو وہ بول اٹھا،

چلو یہ جھگڑا بھی نمٹا، ہم خود اس مکان میں رہنا نہیں چاہتے۔ شہر میں ایک سے ایک اچھا مکان موجود ہے اور کرایہ بھی کم،

مگر حیدری خاں، مجھے مکان تلاشکرنے کی فرصت کہاں،!

تم فکر نہ کرو میری جان۔ آج کیا دن ہے،، جمعرات۔ بس اسی اتوار تک میں مکان تلاش کر لوں گا۔ اس دن تمہیں چھٹی بھی ہو گی آسانی سے اسباب لے چلیں گے۔

حیدری خاں نے سچ مچ اتوار سے پہلے ہی مکان تلاش کر لیا۔ وہ فیاض کو مکان دکھانے لے گیا۔ ج سعلاقے میں یہ مکان واقع تھا وہ شہر سے الگ تھلگ، مضافات میں واقع ہے۔ فیاض کا کبھی اس علاقے میں آنا جانا کبھی نہیں ہوا تھا۔ بازار خوب چوڑا تھا۔ آمنے سامنے اونچے اونچے مکان، نیچے دکانیں، کسی میں قصاب، کسی میں کنجڑا، بساطی، تنبولی، بزاز۔

ان تمام اشیا کی دکانیں جنہیں خریدنے کے لئے فیاض کو لمبی، لمبی گلیاں طے کرنی پڑتی تھیں۔ علاوہ ازیں جوتے والوں کی دکانیں، لانڈری کی دکانیں، کیمسٹ، کارخانہ بسکٹ بنانے کا تھا، اس کے ساتھ ہی ایک یتیم خانہ تھا، اور ایک جگہ حکیم بھورے میاں کا مطب تھا۔

ان دکانون کے اوپر خوبصورت مکان تھے۔ کوئی تین منزلہ، تو کوئی چار منزلہ۔ زیادہ تر مکانوں کے دروازے یا تو بند تھے یا ان پر چلمنیں پڑی تھیں۔

اسی نواح میں حیدری خاں نے فیاض کے لئے دو کمروں کا فلیٹ تلاش کیا تھا۔ یہ ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا۔ جس کے نیچے ایک ایرانی چائے خانہ تھا،

فلیٹ کے دونوں کمرے صاف ستھرے اور کشادہ تھے۔ بجلی اور نل کا انتظام تھا۔ ٹائلوں کے فرش چوڑے چوڑے دروازے کھلی کھلی کھڑکیاں ان کے روشن دانوں میں نیلے پیلے رنگوں کے شیشے کٹاؤ دار پھولوں کی وضع کے لگے ہوئے تھے۔ بازار کے رخ ایک خوبصورت بالکونی تھی، اسے دیکھ کر فیاض کی باچھیں کھل گئیں۔ یہاں وہ گرمی کے دنوں میں چھوٹی سی چوکی بچھا کر ریاض کیا کرے گا۔

وہ مارے خوشی کے استاد سے لپٹ گیا۔

فیاض بیٹے حیدری خاں نے اس کے خیال کو بھانپتے ہوئے کہا، یہاں تمہیں کوئی نہیں روکے گا، جی چاہے تو ساری رات سرود بجاتے رہو۔

فیاض خوشی خوشی اصغری ک و یہ مژدہ سنانے گھر آیا۔ مکان کی اتنی بہت سی خوبیاں سن کر اصغری، نجمہ اور سلیمہ کو بھی اسے دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ مگر حیدری خاں نے کہا۔ ایک ہی دفعہ چل کر دیکھ لینا۔ فوراً اسباب باندھنا شروع کر دو۔ تا کہ تیسرے پہر تک وہاں پہنچ جائیں۔

دوپہر کے کھانے سے فارغ ہو کر فیاض، حیدری خاں، اصغری اور دونوں لڑکیوں نے جلدی جلدی سامان باندھنا شروع کیا۔ پچھلے دس برس میں نہ جانے کیا

کیا ضروری اور غیر ضروری سامان اکٹھا کیا تھا۔

جس کا چھانٹنا مشکل تھ اصلاح یہ ٹھہری، کہ نئے مکان میں پہنچ کر چھانٹ لیں گے۔ فی الحال ت وسارے کا سارا جوں کاتوں سارا سامان وہاں پہنچا دیا جائے۔ پھر بھی سامان باندھتے باندھتے اور ٹھیلہ آتے، آتے چار بج ہی گئے۔ جس وقت یہ لوگ اپنے نئے مکان میں پہنچے تو شام ہونے کو تھی۔

فیاض، اس کی بیوی اور بیٹیاں کام کرتے کرتے اتنا تھک گئیں کہ انھوں نیمکان کا جائزہ بھی نہ لیا۔ چاروں ایک کمرے میں بڑی سی دری بچھا کر پڑ رہے۔ مگر حیدری خاں کے چہرے پر تھکاوٹ کے کچھ آثار ظاہر نہ ہوتے تھے۔ وہ کہیں جانے کی سوچ رہا تھا۔

فیاض بیٹے اندر سے کنڈی لگا لینا۔ اس نے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔ جب تک میں نہ آؤں کنڈی نہ کھولنا۔ اگر مجھے دیر ہو جائے تو گھبرانا نہیں۔

یہ کہہ کر وہ سیڑھیوں سے اتر گیا۔ اس کے جانے کی دیر تھی کہ سب کو نیند نے آ دبوچا۔ اور وہ دو ڈھائی گھنٹے خوب بے خبر سوتے رہے۔ سب سے پہلے فیاض کی آنکھ کھلی۔ اس نے خود کو گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پایا۔ وہ جانتا تھا کہ دیوار پر بجلی کا بٹن کہاں ہے۔ مگر اس خیال سے اس نے روشنی نہ کی کہ کہیں اصغری اور بچیوں کی نیند نہ اچٹ جائے۔ وہ اندھیرے میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بالکونی کی طرف گیا۔

اور اس کے آہنی کٹہرے پر جھک کر اس کے نواح کی سیر دیکھنے لگا۔ آمنے سامنے اغل بغل نیچے اوپر ج سطرف بھی اس کی نظر گئی۔ اسے ایک نئی ہی کیفیت دکھائی دی۔ اس نے دیکھا کہ آس پاس کے تمام فلیٹوں میں بجلی کی تیز روشنی ہو رہی ہے۔ اور کمرے کے دروازے اور کھڑکیاں جن پر دن کو چقیں پڑی تھیں۔ اب چوپٹ کھلے ہیں۔ جو کمرہ اس کے فلیٹ کے عین سامنے ہے۔ اس میں اجلی چاندنی

کا فرش بچھا ہوا ہے۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ پان دان خاصدان پیچواں قرینے سے رکھے ہیں۔ اور وہ سارا اہتمام ہے جو کسی دعوت کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ مگر یہ کمرہ ابھی اپنے مکینوں سے خالی ہے۔

ادھر سے ہٹ کر اب اس کی نظر بازار پر پڑی، اس وقت وہاں کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ وہ دکانیں جنمیں دن کو آٹا۔ دال، گھی، گوشت، سبزی، کپڑا سونا چاندی، تانبا پیتل بکتا تھا۔ وہ ت وسب بند تھیں۔ اور ان کے ٹھکانوں پر گل فروش چنگیروں میں ہار، پھول، طرح طرح، کے گجرے، کنگن، چمپا کلیو غیرہ۔ پھولوں کے گہنے سجائے دکان لگائے بیٹھے تھے۔ گندھیوں نے اپنی بڑی بڑی پٹاریاں کھول رکھی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی عطر کی شیشاں دور سے چمکتی ہوئی نظر رہی تھیں۔

ایک جگہ مٹھائی کے بڑے بڑے تھال چنے ہوئے تھے جن میں قسم قسم کے لڈو، قلاقند اور جلیبیاں سجی ہوئی تھیں۔ امرتی اور برفی کے قلعے بنے ہوئے تھے۔ یتیم خانے کا پھاٹک بند تھا۔ اس ک یاہر اس وقت نظر بندی کا تماشا ہو رہا تھا ایک جگہ ایک نوجوان جو شاید نابینا تھا، گاندھی ٹوپی پہن یہار مونیم بجا رہا تھا۔ پاس ہی چادر پر اکنیاں، دونیاں، ٹکے پیسے بکھرے پڑے تھے۔ ہر شخص خوش طبعی کے سبھاؤ میں تھا۔

میلے کا سا سماں بندھا ہوا تھا۔ بازار میں خاصی بھیڑ تھی، جب کوئی بڑی سی چمکتی ہوئی موٹر پوں پوں کرتی گزرتی ت ولوگ آگے سے یوں ہٹ جاتے جیسے سمندر میں دخانی کشتی چلنے سے جھاگ چھٹ جاتی ہے،

فیاض کو اپنے فلیٹ کے سامنے جو خالی کمرہ نظر آیا تھا، اب اس میں چہل پہل ہونے لگی تھی، لوگ آتے جاتے تھے اور پھر گاؤ تکیے سے لگ کر بیٹھ جاتے تھے۔

یک بارگی طبلے پر تھاپ پڑی، اور غیرت ناہید روپہلی پشواز پہنے چھم سے محفل میں کودی، اور رنت کرنے لگی۔ ہاتھ پاؤں کی چات پھرت اس غضب کی تھی کہ ہر ادا پر دیکھنے والوں کے دل مسلے جاتے تھے، تحسین کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ مگر

رقاصہ کو اپنے حسن فن اور اپنے کمال فن پر ایسا ناز تھا کہ وہ ہر توصیف سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی،

فیاض ایک حیرت کے عالم مین بالکونی پر کھڑا یہ ماجرا دیکھ رہا تھا، کہ اسے محسوس ہوا کہ اندھیرے میں کوئی سایہ سا اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا ہے۔ فیاض کچھ لمحے ساکت و جامد کھڑا رہا۔ سائے نے بھی کوئی حرکت نہ کی۔ آخر اس نے گردن پھیر کر دیکھا تو وہ اس کی بیوی اصغری تھی۔

داستان ہندباد

افسانہ نگار: ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

مجھے یہ سن کر دلی افسوس ہوا کہ سیف اللہ ہندباد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ گزشتہ حج کے موقع پر مدینہ منورہ میں ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ان کی ذات سے ایک ایسی ناقابل یقین اور ناقابل فراموش یاد وابستہ ہے۔ کہ اسے قلمبند کیے بنا نہیں رہا جا سکتا۔

ان سے میری پہلی ملاقات غالباً ۱۹۵۲ء میں ہوئی۔ شام کے وقت میں گھر میں بیٹھا تھا کہ دروازے پر کسی نے دستک دی۔ باہر نکل کر کیا دیکھتا ہوں

ایک نامعلوم شخص مدراسی تہمد باندھے، سر پر سفید جالی دار ٹوپی اوڑھے، کاندھے پر چارخانے کا رومال لٹکائے، تنبیہ الغافلین قسم کا عصا تھامے، منھ پر داڑھی کی جھالر لگائے کھڑا ہے۔ قطع قطع اور لب و لہجے ہی سے میں سمجھ گیا کہ جنوبی ہندوستان کا ہے۔ اسے بھی اطمینان ہوا کہ میں وہی شخص ہوں جس کی اسے تلاش تھی، میں نے اسے اندر بلا کر پاس بیٹھایا اور پوچھا آپ کہاں سے آئے ہیں؟۔

جواب ملا میرا نام سیف اللہ ہندباد ہے۔ مالابار کے شہر کالی کٹ کا رہنے والا ہوں، مصیبت زدہ ہوں، دوبار کوشش کی کہ دفتر میں آپ سے ملوں، لیکن چپڑاسی نے اجازت نہ دی۔ مجبوراً گھر پر آپ کو زحمت دینے آگیا۔ اس جسارت کے لئے معافی خواہ ہوں۔

میں نے دلاسا دیتے ہوئے کہا کوئی مضائقہ نہیں جو کہنا ہو بے تکلف کہیں۔ میری خندہ پیشانی سے سیف اللہ کو کچھ اطمینان ہوا، تو مجھے یوں مخاطب ہوا جناب

میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ میں ایک محتاج مہاجر بلاوجہ قہر الٰہی میں مبتلا ہوں، میری داستان بڑی دردناک ہے لیکن اسے سن کر کیا کیجیئے گا۔ سال بھر کی تگ و دو کے بعد اس قابل ہوا ہوں کہ محنت مزدوری سے اہل وعیال کا پیٹ پال سکوں۔ البتہ بچوں کی تعلیم کا انتظام نہیں کر سکا۔ اگر آپ کی توجہ سے ان کے داخلے اور وظیفے کا بندوبست ہو جائے تو عمر بھر احسان مند رہوں گا۔

اس وقت وزارت تعلیم سے میرا تعلق تھا۔ سینکڑوں مستحق افراد کی ملازمتوں اور وظیفوں کا کارِ خیر میں نے انجام دیا تھا۔ چنانچہ میں نے کہا یہ معمولی سی بات ہے آپ جمع خاطر رکھیں، آپ کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہو جائے گا۔ اب یہ بتلائیں کہ آپ مالابار سے اٹھ کر یہاں کیوں آئے اور بیٹھے بیٹھائے یہ پریشانی مول کیوں لی۔

سیف اللہ نے پہلے تو میرے حق میں دعا کی، اور پھر آب دیدہ ہو کر کہا، حضرت میں اپنا حال کسی کو نہیں سناتا، کیونکہ سننے والے اسے دیوانے کا افسانہ سمجھتے ہے۔ یوں تو اس شہر میں بیشتر مہاجر اپنے کو بادشاہوں، نوابوں اور سوداگروں کی اولاد بتاتے ہیں۔ اور اس لنکا میں جسے دیکھیے باون گز کا ہے۔ پھر سچ بولنے والا موت مرے یا نہ مرے، میری داستان تو ایسی عجیب ہے، کہ سب اسے مجذوب کی بڑ سمجھتے ہیں۔ اور میں نے بھی اسے زبان پر لانا چھوڑ دیا ہے۔ آپ کی مہربانی اور اصرار سے حوصلہ ہوا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں۔

سیف اللہ کی عمر چالیس سال سے زیادہ نہ تھی، اور خستہ حالی کے باوجود اس کے انداز سے خلوص اور وقار تھا۔ کوئی وجہ نہ تھی، کہ میں اسے غلط سمجھتا۔ زندگی میں بہتوں کا حال دیکھا اور سنا، لیکن سیف اللہ کی آپ بیتی سب سے نرالی تھی، کہنے لگا، جناب والا آپ تو جانتے ہیں۔ کہ مالابار میں جو عرب نسل لوگ کے آباد ہیں۔ وہ موپلا کہلاتے ہیں۔ میں بھی اس قوم کا فرد ہوں، جبکہ میری والدہ عمان کی رہنے والی تھی۔ اور اس نسبت سے میری مادری زبان عربی ہے۔ ہمارے خاندان کا پشتوں

سے پیشہ سوداگری تھا۔ اور میرے والد شیخ کریم اللہ نے کالی کٹ سے سیلون مال در آمد برآمد کرکے، خاصی دولت جمع کی اور چین سے بسر کی۔ وہ دین اسلام کے ایسے سچے شیدائی تھے۔ کہ تحریک خلافت کے موقع پر موپلا بغاوت میں پیش پیش رہے تھے، اور اس کی پاداش میں انگریزوں کے ظلم وستم سہے۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے، کہ مسلمانوں کو دارالسلام میں رہنا چاہیئے۔ خواہ وہاں تکلیف میں گزارا ہو۔ ہماری زبان میں ضرب المثل ہے کہ دارالکفر کے حلوے سے دالاسلام کا خرما بہتر ہے۔ اس تربیت کا اثر یہ ہوا کہ میں جوانی میں مسلم لیگ کا سرگرم رکن اور تحریک پاکستان کا علم بردار بن گیا

میرے جذبہ جہاد کو ہمارے خاندانی پیر حضرت کرامت الہٰی نے ایسی ہوا دی کہ والد کے انتقال کے بعد میرا زیادہ وقت کاروبار کی بجائے سیاست کی نذر ہو گیا۔ اور روہ بھی اس طرح کہ جمع پونجی جلسہ جلوسوں کے اہتمام اور لیڈران کرام کی پذیرائی پر صرف ہونے لگی۔ کی رچند سال کے بعد جب پاکستان وجود میں آیا تو ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کالی کٹ کے گلی کوچوں میں ہم نے چراغاں کیا۔ اسلامی پرچم سے درودیوار کو سجایا۔ مسجدوں کے طاق بھرے۔ یار و اغیار کو دعوتیں کھلائیں۔ اور شکرانے کی نمازیں ہفتوں مہینوں پڑھیں،

جب سال دو سال گزر گئے تو پیر و مرشد کرامت الہٰی نے کہا۔ عزیزو یہ کیسی عجیب بات ہے کہ پاکستان کی خیر خبر ہم تک نہیں پہنچتی۔ اور نہ ہم اس مملکت خداداد کا حال معلوم کرتے ہیں۔ کیا ہماری جد وجہد کا مقصد یہی تھا۔ ہزار میل دور دارالایمان کی تشکیل کے بعد کافروں ہی میں بیٹھے چمڑے اور سوکھی چھالیوں کی تجارت کرتے رہیں

یہ رویہ تو مشیت ایزی کے منافی ہے۔ اگر تم مانو تو میں بہ نفس نفیس وہاں جا کر حالات کا جائزہ لوں۔

اور لوٹ کر تمہیں آگاہ کروں، پھر تم فیصلہ کر سکتے ہو کہ ہجرت میں نفع ہے یا نقصان۔

یہ مشورہ مجھے اور میرے ہم خیالوں کو جی جان سے بھایا۔ اور ہم نے چندہ کر کے اپنے پیر کے سفر کا ایسا انتظام کیا کہ وہ فریضہ حج ادا کر کے واپسی پر کراچی ٹھہر جائیں۔ یہ ۱۹۵۰ء کا ذکر ہے۔ مرشد رخصت ہوئے اور کوئی چھ ماہ بعد خوش وخرم واپس لوٹے۔ ہم غول در غول ساحل سمندر پر استقبال کرنے کے لئے گئے تو کیا دیکھا، کہ وہ سر پر جناح کیپ اوڑھے، جہازی چغہ پہنے پاک سرزمین شاد باد کا ترانہ الاپ رہے ہیں۔ بس ہم سمجھ گئے کہ پیر کرامت الٰہی کا سفر کامیاب رہا۔ اس کی تفصیل انہوں نے رات کی دعوت کے بعد اس طرح سنائی کہ

حمد وثنا اس رب کریم کی ج سنے مجھ فقیر کو بیک وقت بیت اللہ اور بیت الاسلام پاکستان کی زیارت سے سرفراز فرمایا، حج کا فیض عام ت وسب کے لئے جاری ہے۔ اور آپ میں سے چند نے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا دیدار کیا ہے، البتہ اس خطہ پاک کی قدم بوسی شاید آپ میں سے کسی نے اب تک نہیں کی، جیسا سنا تھا، ویسا پایا۔ سمجھو کہ عروس البلاد ہے۔ یہاں بیک وقت ایک سمندر یعنی تین ندیوں (۱) حب (۲) لیاری (۳) ملیر کا سنگھم ہے۔ اس سے کیا ہوتا ہے کہ ان ندیوں کا پانی خشک ہو گیا ہے۔ اور صرف برسات کے موسم میں ان میں جوش آتا ہے۔

پہاڑوں کا قد وقت کے ساتھ کم ہو گیا ہے، لیکن ان کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ اور میوے میں فقط ایک میوہ یعنی کھجور، گویا ہم خرمہ ہم ثواب، اور جانوروں مین فقط ایک اونٹ، جو بے روک ٹوک سڑکوں پر دن دہاڑے پھرتا ہے۔ کیا یہ دونوں اسلامی ثقافت کی علامت نہیں ہیں۔ اور سنو جب حاجیوں کا جہاز جس پر میں سوار تھا۔ کراچی کے ساحل پر پہنچا تو اللہ اکبر کے فلک شگاف نعروں سے ایک جم غفیر نے ہمارا استقبال کیا۔ اور ہر مسافر کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ پھر ہمیں حاجی کیمپ لے

گئے ۔اور کئی دن ہماری ضیافت کا انتظام کیا۔شہر کی سیر ک وجب بھی نکلا تو اخوت ومساوات کا عجیب نظارہ کیا۔لوگ کوٹھیوں میں رہتے ہوں یا جھونپڑیوں میں بوقت نماز بلا تمیز ثروت ومنصبا یک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں ۔اورا یسا معاشرہ ترتیب دے رہے ہیں کہ اگر امیر اس دنیا میں ؤرام کریں تو غریب جنت میں چین کریں۔ک سکی مجال کہ علانیہ شراب نوشی، قمار بازی، اور حرام کاری میں ملوث ہو۔ البتہ پس پردہ جو گناہوں کے مرتکب ہوں وہ قہر خداوندی سے کب تک بچیں گے ۔

پیر کرامت الٰہی نے یہ بھی بتایا کہ اسلام سندھ کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا تھا۔اور بارہ سو سال بعد اگر اسی سرزمین کو لوٹ رہا ہے تو یہ اللہ کی مصلحت ۔غرض یہ تقریر ایسی ولولہ انگیز تھی کہ ہم نے ہجرت کا فیصلہ کرلیا۔ جب شہر میں یہ کبر پھیلی تو ہندو شناساؤں اور برادری کے بڑے بوڑھوں نے بہت منع کیا۔سب نے کہا یہاں ت وہر طرف امن وامان ہے۔نہ کوئی دنگا نہ فساد۔صدیوں کی جمی جمائی کو اکھاڑ کر پردیس کیوں جاتے ہو۔لیکن ہم نے کسی کی نہ سنی اور جواب دیا کہ ہجرت بر حق ہے، اگر راس نہ آئی تو لوٹ آئیں گے۔ یہ کہہ ک رہم نے رخت سفر باندھا۔ بیوی بچوں کو ساتھ لیا۔انٹی مین جتنی رقم چھپا سکے تھے۔محفوظ کی اور ہر چہ باد باد کہہ کر سمندر میں ڈال دیا۔

بعد از خرابی بسیار رج بسارنگ نے مژدہ سنایا، کہ کراچی کا ساحل نظر آ رہا ہے۔ ت وہماری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ بےتابی سے ہم جہاز کے عرشے کی طرف جھپٹے اور سجدے میں گر پڑے۔ جہاز کشاں کشاں کنارے آ لگا۔اور ہم سب بوریا بستر لیے ہوئے نیچے اتر آئے۔لیکن یہ کیا بات تھی نہ تو کوئی ہمارے استقبال کے لئے جمع تھا، نہ شادیانے بج رہے تھے۔ اور نہ پھولوں کے ہار کہیں نظر آئے تھے۔حتٰی کہ پیر کرامت الٰہی جو مہینوں پہلے ہماری پیشوائی کے لئے کراچی پہنچ چکے تھے۔اس وقت وہ بھی ہماری نظروں سے بہت دور تھے۔ باز پرس کے لئے صرف پولیس اور

کسٹم کے عملے کے علاوہ کوئی نہ تھا۔اس صورت میں ہماری پریشانی کا اندازہ آپ خو دلگا سکتے ہیں۔ جسے دیکھیے ،حقارت سے ہمیں دیکھتا اور کہتا بے چارے مہاجر ہیں۔ خدا ان پر رحم کرے۔ جب ہم نے انہیں اپنے جوش ایمان کا قصہ سنایا تو خوب ہنسے، اور فرمایا اللہ آپ کو جزائے خیر دے گا۔

یہ ماجرا دیکھ کر ہم نے دل کو بہلایا، کہ شیخ کرامت الٰہی کو ہمارے آنے کی اطلاع نہ ہوئی ہو گی۔ ورنہ کیسے ممکن ہے کہ وہ نہ آتے اور ہمارے استقبال کا معقول انتظام نہ کرتے۔ مناسب یہی ہے کہ

کسی مسافر خانے میں قیام کریں۔پھر انہیں تلاش کر کے بود و باش، نیز معاش و روزگار کی صورت نکالیں۔ یہ منصوبہ بنا کر قلیوں سے کہا کہ ہم کسی مسافر خانے میں جانا چاہتے ہیں۔وہ بولے شہر میں ایک جگہ مولوی کا مسافر خانہ کے نام سے مشہور ہے۔مگر اب وہاں ٹھہرنے کی جگہ نہیں۔تم سب کسی ہوٹل میں پڑ رہو تو اچھا ہے۔مرتا کیا نہ کرتا پوچھا کونسا ہوٹل مناسب ہو گا۔کسی ہمدرد قلی نے مشورہ دیا کہ تم مالا بار سے آئے ہو تو مالا بار ہوٹل ہی میں فروکش ہو، جو کم خرچ بالا نشین کے مصداق ہے۔بالا نیشین ت و کہنے کی بات تھی دراصل یہ لیاری کے زیریں علاقے دھوبی گھاٹ کے پاس وقوع پذیر ہے۔چند بوسیدہ کوٹھریوں کے اس ہیوٹی میں افتاں و خیزاں ہم پڑے رہے۔اور پتھرائی ہوئی آنکھوں سے اس چٹیل ویرانے کو تکنے لگے۔

ایک دو دن میں جب سفر کی تھکن دور ہوئی تو دل کو سمجھایا کہ شکر کرو منزل مراد کو پہنچے۔نیت نیک ہو تو وقت کے ساتھ مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں

ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔لوگوں سے ملو جلو۔ایسا بھی کیا ہے۔کاروبار کی شکل نکل آئے گی۔تو سب مسائل ہو جائیں گے۔لیکن سب سے پہلے شہر کی سیر کرو

اور پیر و مرشد کا پتا چلاؤ۔

یہ تہیہ کر کے ہم آٹھ دس آدمی شہر کی طرف چل پڑے۔اور راستے ایسا ہی پر رونق

پایا جیسا مدراس کو۔ فرق یہ کہ وہاں اہل ہنود کی گہما گہمی تھی۔ اور یہاں برادران اسلام کا بول بالا تھا۔ اس نظرے سے طبیعت بشاش ہوئی۔ اور ہم کشاں کشاں اس محلے کی طرف چل پڑے، جہاں وزرائے کرام کی کوٹھیاں تھیں۔۔۔۔۔۔ سبز پرچم اور،،،،،، پولیس کی گارڈ،،،،،، ان کی نشان دہی کرتی تھی۔ اور ان کے اطراف درختوں کے ایسے جھرمٹ کہ بے اختیار مالابار کے سبزہ زار یاد آ گئے۔ سوچا کہ لگے ہاتھوں معماران پاکستان سے معانقے کا ثواب حاصل کر لیں،

لیکن یامظہر العجائب، پولیس کے سنتری نے ڈپٹ کر پوچھا۔ تم لوگ کون ہو اور غول بنا کر یہاں کیوں آئے ہو۔ ہم نے مدعا عرض کیا۔ اس نے بے اعتنائی سے کہا۔ ایک تو وزیر ساحب کوٹھی پر ہیں نہیں۔ اور اگر ہوں بھی تو وہ تم سے نہیں ملیں گے۔ جو کہنا ہو وہ وزارت آبادکاری ہی میں جا کر کہو۔ یہ سن کر مجھے طیش آیا اور بولا، ہمیں نہ وزیر سے کچھ مانگنا ہے۔ نہ وزارت سے کچھ لینا ہے۔ ہم صرف خلافت راشدہ کے جانشینوں کے دیدار کے لئے آئے ہیں۔

سنتری اس گفتگو کو خاک نہ سمجھا اور جھلا کر پکارا، اوشیخا،، آ دیکھ تو سہی۔ یہ کون لوگ ہیں۔ شاید مظاہرہ کرنے آئے ہیں۔

چاق وچوبند شیخا نے آواز لگائی۔ اے مہاجرو جانتے نہیں کہ دفعہ ۴۴ کے مطابق تمھارا چالان ہو سکتا ہے، خیریت چاہتے ہو تو چلتے بنو۔

اس تنبیہ سے ہم سہم گئے، اور حیران و پریشان واپس چل پڑے، دوپہر کی دھوپ میں جی نڈھال ہو رہا تھا۔ اور پیاس سے ہونٹ خشک ہو گئے تھے۔ سوچا تھا کہ وزیر کے باغ میں تھوڑی دیر آرام کریں گے۔ اور شربت نہیں تو آب خنک سے تواضع ہو گی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ،،،،،، اتنے میں ایک مسجد نظر آئی، تو خیال آیا، اس میں پناہ لیں۔ اور عصر کی نماز کے بعد بازار کا رخ کریں۔ لیکن مسجد کے دروازے پر قفل جڑا تھا، اور معلوم ہوا کہ نماز کے وقت کھلتا ہے۔

غرض ہر روز اسی قسم کے تماشے دیکھنے میں آتے۔ اور میرے ساتھی بد دل ہونے لگے، میں انہیں لاکھ سمجھاتا کہ نوزائیدہ **ملک** ہے۔ اس میں نظم وضبط قائم ہوتے ہوئے کچھ وقت لگے گا۔ یقین محکم رکھو اور ہمت نہ ہارو۔ بس دعا کرو، کہ پیر کرامت الٰہی مل جائیں، تو ان کی ہدایت مشعل راہ کا کام دے گی۔ لیکن افسوس چند ہفتوں کے انتظار کے بعد یہ آرزو بھی ختم ہوگئی۔ ایک روز مالابار ہوٹل والوں نے ایک عجیب واقعہ سنایا۔

ہماری خستہ حالی پر انہیں رحم آیا تو وہ پیر کرامت الٰہی کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ انھیں معلوم ہوا کہ دو ماہ قبل وہ چند پٹھانوں کے ساتھ صوبہ سرحد چلے گئے تھے۔ وہ جگہ ایسی دشوار گزار ہے کہ نہ وہاں ڈاک جاتی ہے اور نہ وہاں کوئی پہنچ سکتا ہے۔ یہ سن کر ہمارے ہوش اڑ گئے، اور ہمارے بہت سے رفیقوں نے مالابار لوٹنے کا فیصلہ کرلیا۔ ہماری ویزے کی معیاد ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، ان سب نے مجھے بہت سمجھایا کہ دیارِ غیر میں تن تنہا اور بے روزگار کیا کرو گے۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ جہاں سے آئے تھے۔ وہیں چلے چلو۔ میری بیوی نے بھی منت سماجت کی۔ لیکن میری غیرت نے قبول نہیں کیا۔ میں کس منہ سے کالی کٹ جا کر کہتا، کہ دار الاسلام میں میرے لئے جگہ نہ تھی۔ اور میرا دعویٰ محض دیوانے کا خواب تھا۔ غرض وہ قافلہ دار الحرب کی طرف پلٹا۔ اور میں یہیں رہ گیا۔ میری جمع پونجی ختم ہونے پر آ گئی۔ اور کسب معاش کا مشکل مسلہ درپیش ہوا۔ کوئی ہنر مجھے نہ آتا تھا۔ اور تعلیم بھی پرانے انداز کی ہوئی تھی، تجارت کا جو تجربہ تھا وہ یہاں کے لئے سودمند نہ تھا۔ ان وقتوں کا جائزہ لے کر ہوٹل والوں نے مشورہ دیا، کہ فی الحال لیاری میں سب کی طرح جھونپڑا ڈال لو۔ اور محنت مزدوری کی سوچو، آگے اللہ بہتر کرے گا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ کسی نے بندرگاہ لے جا کر حمال کی جگہ دلا دی۔ قصہ مختصر ایک سال سے دن بھر سامان ڈھو کر حلال کی روزی کماتا ہوں۔ اور جھونپڑی میں روکھی سوکھی کھا کر اللہ

اللہ کرتا ہوں، مجھے کوئی شکایت نہیں، کیوں کہ میرا ایمان راسخ ہے۔ البتہ میری بیوی اپنی قسمت کو روتی۔ اور اسی فکر میں گھلی جاتی ہے، کہ ہمارے تین بچوں کا کیا ہو گا۔ میں اس قابل نہیں کہ ان کی تعلیم کا انتظام کر سکوں۔ اور اسی غرض سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

سیف اللہ ہندباد کے ذکر سے میرا دل بھر آیا۔ اور میں نے ہر طرح کا دلاسا دے کر وعدہ کیا کہ ان کے فرزندوں کی تعلیم کا فوری بندوبست کروں گا۔

اس کے بعد میں نے کہا کہ آپ کی سرگزشت دردناک ہے۔ لیکن ہزاروں لاکھوں مہاجر اس سے کہیں زیادہ مصیبت سے گزرے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے لوگوں کو آپ کی بات پر یقین نہیں آتا ہے، اس پر وہ کچھ چپ ہوئے اور جواب دیا حضرت آپ نے یہ نہیں پوچھا

کہ میرے نام کے ساتھ ہندباد کیوں لگا ہوا ہے۔

دراصل اس کی وجہ تسمیہ کی طرف میرا ذہن نہیں گیا تھا۔

سیف اللہ نے تشریح کی الف لیلہ کی داستان میں آپ نے سندباد کا قصہ تو ضرور پڑھا ہو گا۔ اور سنا ہو گا تو پھر آپ کو یاد ہو گا، کہ اس کا یار وفادار ہندباد تھا۔ وہی میرے جد امجد تھے۔

یہ سن کر میں کرسی سے اچھل پڑا، اور اس کا منھ دیکھنے لگا کہ اچھا خاصا آدمی کس خبط میں مبتلا ہو گیا۔

سیف اللہ کے خبط پر میرا شبہ یقین کی حد تک پہنچ گیا۔ جب اس نے کہا آپ کو یقین نہ آئے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندباد کا وارث ابھی باقی ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ سلطان اور میں گدا، عدن کے قریب ایک گمنام جزیرہ الشمس کا وہ حاکم ہے۔ اور شیخ الشمس کے نام سے معروف ہے۔ اپنے مورث کے چھوڑے ہوئے خزانوں سے وہ مالا مال ہے۔

سیف اللہ یہ کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور بولا میں کبھی اسکا تحریری ثبوت پیش کروں گا۔ اس وقت مجھے اجازت دیں۔

میں نے سیف اللہ کو اگلے ہفتے دفتر آنے کی تاکید کی، اس دوران میں نے اپنے دوست امتیاز احمد خاں ناظم تعلیم کراچی سے کہہ کر مارٹن روڈ سکول میں داخلے کا پرچہ منگوالیا۔ اور نسروان جی مہتہ سے تیس روپے ماہوار وظیفے کا وعدہ لے لیا۔ حسن اتفاق کہ میرے دوست آدم خان ان دنوں پوسٹ ماسٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ انھوں نے سیف اللہ کو ایک ساحلی جہاز پر ہیڈ خلاصی کی جگہ دے دی۔ ہفتے بھر بعد جب سیف اللہ کو میں نے تینوں کاغذ بیک وقت دیے تو وہ خوشی سے رو پڑا۔ اور میں بھی آب دیدہ ہو گیا۔

اس واقع کو بیس سال گزر گئے۔ اور میرے ذہن سے سیف اللہ کی شکل مٹ گئی۔ اور نہ کسی سے ان کا ذکر سنا، میں بیشتر پاکستان سے باہر رہا۔ اور یہاں کے لیل ونہار سے بے خبر سا ہو گیا۔ نکلے وہ میکدے سے تو دنیا بدل گئی۔ جب جہاں گشتی کا دور ختم کر کے کراچی لوٹا تو خانہ نشینی میں عافیت نظر آئی۔ تا حریفاں و غارا جہاں کم بینم،، جن دوستوں کو زمین کھا گئی۔ یا حالات کا سیلاب بہا لے گیا۔ ان کی یاد کس کس عنوان سے آتی ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے، کہ وقت نے کسی اندھی گلی میں کھڑا کر دیا ہے۔ ٹیلی فون پر کوئی پہچانی ہوئی آواز سنائی دیتی ہے، تو حافظہ ماضی کے مدہم خطوط کو بمشکل اجالتا ہے۔ اور اس آواز کو خد و خال عطا کرتا ہے۔ دو سال قبل ایک ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ فون پر مجھے کسی نے پوچھا، اور جب میں نے اپنی موجودگی کا اقرار کیا، تو یوں مخاطب ہوا۔ ڈاکٹر صاحب میں آپ کا دیرینہ احسان مند ہوں۔ معلوم نہیں آپ کو یاد ہو گا یا نہیں۔ مجھے سیف اللہ ہندباد کہتے ہیں۔

ہندباد اس ایک لفظ نے مجھے وہ ساری تفصیل یاد دلا دی۔ اس تعلق سے ہی میرا ذہن سن دباد الف لیلی، ہارون الرشید۔ شہرزاد اور خدا جانے کہاں کہاں جا پہنچا۔

میں فرطِ شوق سے بول اٹھا۔نہیں مجھے سب یاد ہے۔کہیئے کیا کرتے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔

سیف اللہ نے جواب دیا اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔میرے حالات بہت بہتر ہیں۔اور اگر اجازت دیں تو مل کر زبانی سناؤں۔آپ کی واپسی کی اطلاع حال ہی میں مجھے کسی اخبار میں پڑھی تو ملنے کو دل بے چین ہوا، آج آپ کا فون نمبر ملا۔اگر پتہ سمجھا کر کوئی وقت مقرر کریں،تو حاضر خدمت ہو لوں۔

میں نے گھر کا پتہ سمجھا کر کہا۔پرسوں شام کو تشریف لائیے۔اور اتنا تو کہیئے کہ آپ ابھی تک خلاصی کے خلاصی ہیں۔یا کچھ بہتری کا سامان ہوا۔اور رہائش دھوبی گھاٹ میں ہے یا کچھ بہتری کا سامان ہوا۔

جواب مین فون ایک قہقہے سے گونج اٹھا،قبلہ آپ کو یقین نہ آئے گا۔مگر حقیقت میں میں ساحل سمندر پر "قصر الشمس میں رہتا ہوں، جو عرف عام میں سندباد پیلس کہلاتا ہے۔زبانی عرض کروں گا کہ شیخ سے میری ملاقات کیسے ہوئی۔اور انھوں نے کس طرح مجھے اس محل کا داروغہ مقرر کیا۔

سیف اللہ خدا حافظ کہہ کر خاموش ہو گیا۔اور مین ریسور کو دیکھتا رہ گیا۔پہلے تو میں نے اسے سیف اللہ کے پاگل پن پر محمول کیا۔لیکن جب کسی نے سندھ باد پیلس کی تصدیق کی۔اور اس کے در و دیوار کا نقشہ کھینچا،تو میں وسوسے میں پڑ گیا۔اور بے قراری سے سیف اللہ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔

یہ باور کرنا ناممکن تھا کہ سندباد اور ہندباد نے پھر سے اوتار لیا ہے۔یا اس کے وارث بارہ سو سال بعد باقی ہیں۔دو دن تک میں نے الف لیلی کی ورق گردانی کی۔اور سندباد کے سات سفروں کا حال حرف بہ حرف پڑھ ڈالا۔تا کہ سیف اللہ پر بوقت ضرورت جرح کرسکوں۔

دو دن بعد میں سرِ شام لان میں جا بیٹھا،اور ملازم کو دروازے پر تعنیات کر دیا۔

کہ اگر کوئی تہہ بند پوش عصا بردار بزرگ مجھے پوچھتے آئیں تو بلا تامل اندر آنے دے۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے خبر کی کہ ایک بڑی سی موٹر سے دو عرب نمودار ہوئے ہیں۔ اور ان کے ساتھ وردی میں ملبوس ایک نوکر بڑا سا خوان لیے چلا آتا ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک پیر مرد اور اک جواں سال دونوں عربی سج دھج بنائے ہاتھوں میں تسبیح کی مالا لیے میری جانب آ رہے ہیں اور ان کے نقش قدم پر ایک سلیقہ مند خدمت گار بڑا سا طشت سر پر رکھے جس پر کلا بتو کا خوان پوش ڈھکا ہے چل رہا ہے۔ بس ایک نظر میں مجھے سیف اللہ کے ترقی درجات کا یقین ہو گیا اور میں ان کے معانقے کے لیے بڑھا تو وہ خوشی سے باغ باغ ہو گئے۔ بار بار کہتے ہیں کہ پاکستان میں آپ میرے پہلے سرپرست ہیں اور میں نے دعاؤں میں ہمیشہ آپ کو یاد کیا ہے۔ اپنے فرزند اکبر سلیم اللہ کو ملانے کے لیے لایا ہوں۔ غرض خیر و عافیت کی رسمی باتوں اور مشروبات کی خاطر تواضع کے بعد میں نے بلا تکلف کہا ''میں نے تماشا گاہ عالم میں بہت کچھ دیکھا اور سنا لیکن آپ کی سرگذشت سب سے نرالی ہے اگر فرصت ہو اور مناسب سمجھیں تو سنائیں کہ پچھلی ملاقات کے بعد آپ کی زندگی میں یہ خوشآئند تبدیلی کیسے ہوئی؟''

یہ مقولہ ہے کہ ''حقیقت افسانے سے زیادہ عجیب ہوتی ہے'' سیف اللہ ہندباد کی رام کہانی سے سچ ثابت ہو گیا۔ آپ کی توجہ سے جب میں ''ہیڈ خلاصی'' بن گیا اور تینوں لڑکوں کی تعلیم کا انتظام ہو گیا تو میں نے ''لسبیلہ'' پر کرائے کا گھر لے لیا اور کوئی دس سال صبر و شکر کے ساتھ وقت گزار دیا۔ یہاں تک کہ ۱۹۶۲ء کا آغاز ہوا اور یک بیک میری قسمت کا ستارہ چمکا۔ میں حسب معمول صبح کے وقت کیاڑی پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ شاہی مہمان کے استقبال کا اہتمام ہو رہا ہے۔ فوجیوں کے پہرے پولیس کی گارڈ نیوی کا بینڈ افسروں کی قطاریں یعنی وہ منظر جس کی آرزو نادانی میں میں نے پاکستان آتے وقت کی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ''جزیرہ الشمس'' کے

سلطان کی آمد آمد ہے اور ان کا خوب صورت جہاز لنگر انداز ہو چکا ہے۔ ایک کان نے یہ مژدہ سنا اور دوسرے میں آواز غیب آئی کہ لے تیری آزمائش کا وقت ختم ہوا۔ جس سندباد کی تجھے تلاش تھی وہ بالاخر خود منظر عام پر آ گیا جس طرح ہو اس سے تعارف پیدا کرتا کہ تیری نحوست کا دور ختم ہو اور مراد دلی بر آئے۔

اتنے میں سلامی کی توپیں دغیں اور پاکستان کا قومی ترانہ بجنے لگا اور ایک پر وقار جواں مرد اطلس و کم خواب کی قبا اوڑھے دستار میں الماس و عقیق کے گوشے لپیٹے ایک ہاتھ میں سپاہیوں کا غول ہٹو بچو کا شور مچاتا رواں دواں تھا۔ یہ تماشا دیکھ کر پہلے تو میں کچھ سہما لیکن پھر کچھ سوچا کہ اپنی مادری زبان عربی سے کام لینے کا یہی موقع ہے چنانچہ میں نے بہ آواز بلند کسی عربی قصیدے کا ایک شعر پڑھا اور یا حبیبی مرحبا کہا جس سے خوش آمدید کا مفہوم نکلتا تھا اسے سن کر شیخ اور اس کے حواری تعجب سے میری طرف متوجہ ہوئے۔ شاید انھیں مجھ پر کسی مجذوب کا گمان ہوا۔ پاکستانی محافظوں نے میرا منھ بند کرنے کی کوشش کی لیکن باز نہ آیا۔ اور پکار کر عربی زبان میں بولا، اے شیخ الکبیر میں تیرے دیدار کے سوا اور کسی چیز کا طالب نہیں ہوں، وہ بھی اس لئے کہ تیرے جد امجد ثبت بن ہاشم سندی المعروف سندباد اور میرے مورث اعلیٰ رفیق بن المعروف ہندباد قریبی دوست تھے، اس تقریر نے شیخ کو لمحہ بھر کے لئے متحیر کر دیا۔ اور اس نے اپنے افسر خاص سے آہستہ سے کچھ کہا۔ اس نے مجھے ساتھ ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔ اور جب یہ جلوس موٹروں پر سوار ہونے لگا، تو اس نے مجھ سے پوچھا، کہ تو نے جو دعویٰ کیا اس کا ثبوت بھی ہے۔ جب میں نے بڑے اعتماد سے اس امر کا اقرار کیا، تو اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس پر کوئی تاریخ اور وقت درج کر دیا۔ اور حکم دیا کہ تم اس نشانی کے مطابق قصر الشمس عرف سندباد پیلس پہنچو میں اس مژدہ کو ذہن نشین کرتا ہوا، اور خدائے پاک کا شکر ادا کرتا ہوا اپنے گھر لوٹ آیا۔

جب میں نے بیوی کو ماجرا سنایا تو وہ نہال ہو گئی۔ اور پھر اس سوچ میں پڑ گئی کہ

محل میں حاضری کے لئے مناسب لباس کہاں سے میسر ہوگا۔

بہرصورت تاریخ مقررہ تک یہ مشکل کسی طرح آسان ہوئی۔ اور وہ بھی یوں کہ کسی تازہ وارد حاجی سے میں نے کپڑے مستعار لیے۔ پھر وہ قدیمی قریظہ جو ہزار سال سے پشت ہا پشت میرے اجداد سینے سے لگائے چلے جاتے تھے۔ صندوقچے سے نکالا۔ اسی میں وہ راز سربستہ تھا۔ جسے دکھا کر شیخ جزیرہ الشمس کو میں اپنے دعویٰ کی صداقت کا یقین دلا سکتا تھا۔ جمعہ کا مبارک دن تھا۔ جب میں صبح صبح بس پر بیٹھ کر ساحل سمندر کے قریب اس جگہ پہنچا۔ جہاں سے سندباد پیلس کا گنبد نظر آتا تھا۔ خراماں خراماں اس طرف جاتے ہوئے میں دل ہی میں نصر من اللہ کا ورد کر رہا تھا۔ محل کے قریب کھڑے ہو کر میں حیرت سے اس کے طول و عرض کا اندازہ کرنے لگا۔ کیوں کہ ایسی عالی شان عمارت میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، اس کے چاروں کونوں پر معماروں نے ایسی برجیاں بنائی تھیں۔ جن میں پہرے دار شب و روز پہرہ دیتے تھے۔ صدر دروازے پر سنتری پہرے پر تھے۔ اور دور سے آنے جانے والوں پر کڑی نظر رکھے ہوئے تھے۔ حالانکہ میں نے مصلحتاً ان سے عربی میں گفتگو کی، اور شیخ کے مصاحب کا کارڈ دکھایا۔ لیکن انھوں نے کچھ نہ سنی اور مجھے بھی دوسروں کے ساتھ سڑک کے ایک کنارے کھڑا کر دیا۔ لیکن میری مشکل محل کے ایک ملازم نے آسان کی، جسے میں نے اپنا ماجرا سنایا تو وہ اندر سے داخلے کا اجازت نامہ لے آیا۔ اور اس طرح میں اس ایوان مین داخل ہوا، جسے طلسم ہوشربا کہوں تو مبالغہ نہ ہوگا۔ اس ریگ زار میں خدا جانے کہاں سے سرو، صنوبر، شمشاد، اور گل مہر کے درخت قطار در قطار حوضوں اور فواروں کے اردگرد سایہ فگن تھے۔ انواع و اقسام کے پرندوں کے نغموں سے محل کے در و دیوار گونج رہے تھے،

ملازم کے نقش قدم پر میں حق حیران پر پیچ روشوں سے گزر کر جب محل کی بارہ دری تک پہنچا تو دربان نے مجھے روکا اور کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔

ذرا دیر بعد لوٹ کر مجھے ایک دروازے میں جانے کا اشارہ کیا۔ وہاں افسر خاص میر انتظر تھا۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ میں وہ آبنائی فریطہ ہمراہ لایا ہوں تو وہ دالان در دالان ایک کمرے تک مجھے لایا، جو بظاہر شیخ الشمس کا دیوان خاص تھا۔ میں عالم حیرت میں اس کے نقش ونگار کا نظارہ کر رہا تھا۔ کہ پردہ ہٹا اور شیخ چند مصاحبوں کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ میں نے جھک کر کورنش بجالائی اور دست بستہ کھڑا ہوگیا۔ کیونکہ شیخ کو میری عربی دانی کا اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ مجھ سے اسی زبان میں ہم کلام ہوا، اس کے سوال کے جواب میں میں نے عرض کیا۔ اس سے قبل آپ اس فرلطے کو ملاحظہ کریں۔ میں اختصار سے اس کی تاریخ بیان کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ تیرھویں صدی میں آپ کے مورث اعلیٰ سندباد کی حیثیت بغداد میں ملک التجار کی تھی، اور میرے جد امجد ہندباد ان کے معتبر گماشتے کی حیثیت سے اکثر ہندوستان، سیلون وغیرہ سے جہازوں پر سامان لاتے لے جاتے تھے۔ کون ایسا ہوگا جس نے سندباد کا نام الف لیلیٰ کی داستان میں نہ پڑھا ہوگا۔ اس نسبت سے ہندباد کا نام بھی ان کے لئے غیر مانوس نہیں ہوگا۔ ان کی زندگی نہایت عزت وآرام سے گزر رہی تھی کہ ناگہانی ہلاکو عذاب الٰہی بن کر بغداد کی طرف بڑھا۔ اور ان سب کو مکان وسامان چھوڑ کر اہل وعیال کے ساتھ کشتیوں پر بیٹھ کر وہاں سے جان بچانے کے فرار پر مجبور ہونا پڑا۔

سندباد نے فیصلہ کیا کہ جب تک یہ فتنہ فرو نہ ہوجائے۔ وہ سب ان کے جزیرہ خاص ''الشمس میں پناہ گزین ہوں۔ جہاں انہوں نے اپنا بیش بہا خزانہ چھپا رکھا تھا۔ تب سے لے کر اب تک آپ کا خاندان وہیں پر مقیم ہے۔ بلکہ مصر کے مملوک سلطانوں نے اس جزیرے پر سندھ کے وارثوں کی ملکیت تسلیم کرلی تھی۔ چند سال بعد سندباد نے اپنے رفیق ہندباد کو ہدایت کی، کہ وہ ہندوستان کے اطراف کسی مناسب جگہ کو اپنا مستقر بنائے۔ اور تجارت کا سلسلہ پھر سے شروع کرے۔ گماشتہ

نامے کی سند جو ہندباد کو عطا کی۔ وہ میرے خاندان میں محفوظ رہی۔ اور گو مالابار سے کراچی ہجرت کرتے وقت میں نے سب کچھ چھوڑ دیا۔ لیکن اسے ساتھ لانا نہ بھولا۔ آپ اس فرلطے کو ملاحظہ کرکے میرے قول کی صداقت کا اطمینان فرمائیں۔"

شیخ میری گفتگو بڑی حیرانی اور دلچسپی سے سنتا رہا پھر اس نے اس فرلطے پر نظر ڈالی جو دراصل ہرن کی کھال پر خط کوفی میں چند سطری تحریر پر مشتمل تھا۔ اس کے نیچے "ثابت بن ہاشم سندی المعروف بہ سندباد" کی مہر ثبت تھی۔ گو کہ کھال جگہ جگہ سے سکڑ گئی تھی اور روشنائی کی سیاہی مدھم پڑ گئی تھی تاہم مکمل کی پوشش اور کافور کے سفوف سے اسے تا ایں دم محفوظ کر رکھا تھا۔ شیخ اور اسکے منشی دیر تک اس تحریر کا معائنہ یوں کرتے رہے کہ گویا کوئی عجوبہ روزگار شے سے دوچار ہوں، دیر تک وہ اللہ اللہ کی صدائیں بلند کرتے رہے۔ پھر شیخ کھڑے ہو کر مجھ سے بڑی گرم جوشی سے بغل گیر ہوا۔ اے عزیز اس میں کوئی شک نہیں کہ تو ہندھ باد کا وارث حقیقی ہے۔ اور یہ ملاقات ایسی عجیب ہے، کہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اور اس خاندانی تعلق کا حق ادا کروں گا۔ اب یہ بتا کہ ہندباد میرے مورث اعلیٰ سے جدا ہو کر کہاں آباد ہوئے۔ اور تو یہاں تک کیسے پہنچا۔ میں صرف یہ بتا سکا کہ خاندانی روایت کے مطابق ہندباد پہلے جزیرہ مال دیپ میں سکونت پذیر ہوا۔ کیونکہ ابن بطوطہ نے اپنے سفر نامے میں اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر کدا جانے کیوں وہ مالابار کے شہر کالی کٹ میں آبسا۔ جہاں عرب تاجروں کا بڑا مرکز تھا۔ اس کے جانشین ابھی وہاں موجود ہیں۔ اور موپلا کہلاتے ہیں۔ پھر میں نے کالی کٹ سے آنے کی تفصیل سنائی۔ اور اپنی خستہ حالی کی روداد ایسے موثر اور پرسوز انداز میں بیان کی کہ وہ آب دیدہ ہو گیا۔ اپنے کارپردازوں سے کچھ دیر مشورہ کرنے کے بعد شیخ نے مجھ سے کہا کہ سیف اللہ اگر تم چاہو تو خلاصی کی ملازمت چھوڑ کر میرے داروغہ محل کے نائب کا عہدہ قبول کر لو۔ داروغہ محل تمہارے فرائض نیز ماہانہ مشاہرے کی تفصیل بتا دے گا۔ تمہارا فرزند اکبر سلیم

اللہ کراچی میں ہمارے کونسل خانے سے وابستہ کیا جائے گا۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں اپنی خدمات بحسن وخوبی انجام دو گے، اس طرح ہمارا آبائی تعلق آئندہ بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔ انشا اللہ شیخ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میری زبان سوکھ گئی۔ اور گھر واپس آ کر میں اللہ کے حضور دیر تک شکرانے کی نماز ادا کرتا رہا۔

الغرض گزشتہ دس سال سے میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ ایسے عیش وآرام کی زندگی بسر کر رہا ہوں، جس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ شیخ یا اس کے اقارب گاہے گاہے محل کو رونق بخشتے ہیں۔ لیکن ان کے انتظار میں پچاسوں نوکر، چاکر ہمہ تن درو دالان اور باغات کی درستی وصفائی میں مصروف رہتے ہیں۔ آٹھ دس موٹریں، کیل کانٹے سے لیس ڈرائیوروں کے اشارے کی منتظر رہتی ہیں۔

میں صبح سے شام تک ان کی کارکردگی پر نظر رکھتا ہوں۔ اور یہی طریقہ میرے فرزند کا ہے جو بازار سے سودا سلف کا انبار خرید کر ان جہازوں کو مہیا کرتا ہے۔ جو کبھی، کبھی جزیرہ الشمس جاتے ہیں۔ مجھے بھی ایک دو بار وہاں کی زیارت کا موقع ملا ہے۔ اگر اسے جنت نظیر کہوں تو اسے مبالغہ نہ جانیے گا۔ کیونکہ عدن تو محض ایک ریگزار ہے۔ ورنہ درحقیقت باغ عدن تو یہی جزیرہ الشمس ہے۔ زمانہ قدیم سے اس علاقے میں یہ روایت مشہور ہے کہ فردوس سے ترک وطن کے بعد آدم اور حوا نے یہاں ہی سکونت اختیار کی تھی۔ واللہ عالم، مالا بار سے چلتے ہوئے ہم نے جس جن تکا خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر ہمیں جزیرہ الشمس میں نظر آئی،

میرے لئے سیف اللہ کی گفتگو کو افیونی کی ترنگ سمجھنا مشکل تھا۔ کیونکہ زرق برق وردی میں ملبوس خوان بردار، اور دروازے کے باہر کھڑی ہوئی لمبی قیمتی موٹر سیف اللہ کے ترقی درجات کی ببانگ دہل شہادت دے رہی تھی۔ سلام وکلام کا یہ طویل سلسلہ جب ختم ہونے کو آیا تو میں نے سیف اللہ کو اس کی خوش حالی پر مبارک باد دی۔ تو اس نے طلائی جیبی گھڑی پر نظر ڈال کر اجازت چاہی۔ اس وقت میرا

ذہن یک بیک پیر کرامت الٰہی کی طرف گیا۔ جن کا ذکر اس دوران آیا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے پوچھا جانے سے پہلے اپنے پیر کا تو کچھ حال سناتے جائیں۔ کہ انھیں پاکستان کی زمین کھا گئی۔ یا ان سے پھر کبھی ملاقات کا موقع ملا،

اس سوال پر سیف اللہ نے زور کا قہقہہ لگایا۔ اور پھر ان کی جو کہانی سنائی وہ ان کی آپ بیتی سے کم تعجب انگیز نہ تھی۔

بیس سال قبل جب پیر کرامت الٰہی کراچی میں اپنے مریدوں کی مالابار سے آمد کا انتظار کرتے کرتے اوبھ گئے تو انہوں نے گرومندر کے قریب ایک حجرہ تلاش کیا۔ اور وقت گزاری کے لئے ہر شام وعظ و نصیحت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اب تو اس علاقے میں پٹھانوں کی اتنی آبادی ہو گئی ہے، کہ وہ انہیں کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن پہلے ان کی تعداد وہاں کم تھی ان میں سے خال خال ہی کرامت الٰہی کی محفل میں شریک ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ ان کی خوش بیانی کا اتنا چرچا ہوا کہ ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگ گئے۔

ایک بار ان میں سے کچھ نے کرامت الٰہی کو بتایا کہ وہ چند ماہ کے لئے اپنے گاؤں جا رہے ہیں۔ جو بالاکوت سے تھوڑی دور ہے۔ یہ سن کر کرامت الٰہی چونکے، اور ان سے پوچھا کہ کیا وہ اس امر سے واقف ہیں؟ کہ وہاں سید احمد شہید اور ان کے رفقا دفن ہیں۔

پٹھانوں نے جب اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو پیر کرامت الٰہی نے ان کی بڑی ملامت کی، کہا اے نادانو تم نہیں جانتے کہ سوا سو سال پہلے جب سکھوں نے تمھاری سرزمین پر قبضہ کر کے تمہارے اجداد پر ظلم و ستم ڈھائے، ت و ہندوستان سے سید احمد مجاہدوں کا لشکر لے کر تمھارے وطن کی آزادی اور اسلامی مملکت کے قیام کے لئے بڑی صعوبتیں جھیل کر وہاں پہنچے۔ سال ہا سال انہوں نے سکھ جابروں سے نبرد آزمائی کی۔ لیکن فتح حاصل نہ کر سکے اور بالاکوٹ کے معرکے میں شہید ہو کر وہیں

کے قبرستان مین اپنے رفقا کے ساتھ ابدی نیند سو رہے ہیں۔ یہ تقریر سن کر پٹھان حیرت زدہ رہ گئے۔ اور اپنی رہائش گاہ پر رات کو دیر تک بیٹھ کر یہی بحث کرتے رہے۔ کیونکہ بعض کو کرامت الٰہی کی بات پر یقین نہ آیا۔ بالآخر وہ دوسرے دن ایک وفد لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور کہا کہ اے بزرگ کیا اچھا ہو کہ آپ ہمارے ساتھ بالاکوٹ چلیں۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لین کہ کراچی کے مقابلے مین وہ خطہ کتنا سرسبز اور جان فزا ہے۔ آپ کی طفیل ہمیں بھی ان شہیدوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔ اس دعوت کو قبول کرنے میں انہیں کوئی پس و پیش نہ ہوا، کیونکہ اس دور دراز علاقے کی سی رکا اس سے بہتر اور کیا موقع فراہم ہو سکتا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے حامی بھری آٹھ دس جوان بصد شوق ٹکٹ لے آئے۔ بعد ازاں انہوں نے چندہ کر کے زاد سفر تیار کیا۔ جس میں بستر کے علاوہ رہنے کے لئے ایسی پوشش کا بھی انتظام تھا۔ جو وہاں کے موسم کے لئے موزوں تھی۔ پھر وہ دن بھی آیا جب وہ پیر کرامت الٰہی کو جلوس کی شکل مین ریلوے اسٹیشن لے گئے۔ اور پشاور میل کے ایک ڈبے میں بٹھا دیا۔ راستے بھر انہوں نے پیر کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ چھوڑی، کسی نے اکتار بجایا تو کسی نے اپنی زبان میں ٹپہ الاپا۔ کوئی تو شے دان سے بھانت بھانت کا کھاجا انہیں چکھانے لگا۔ جب یہ طویل سفر ختم ہوا تو ان سب نے ایک بس میں بیٹھ کر ایبٹ آباد کا رخ کیا۔ وہاں سے چند میل دور پیدل چل کر جب بالاکوٹ میں داخل ہوئے تو ساری تکان دور ہو گئی۔

دراصل یہ چھوٹا سا قصبہ تھا۔ جس کے پہلو سے ایک سڑک وادی کاغان کی سمت جاتی ہے۔ بائیں طرف چھوٹی چھوٹی دکانوں اور مکانوں کا سلسلہ تھا۔ دائین جانب سرسبز میدان جس کے درمیان ایک قبرستان کے آثار ساف نمایاں تھے۔ کرامت الٰہی کی رہائش کے انتظام مین زیادہ دقت پیش نہ آئی۔ ایک درزی نے اپنی دکان کے اوپر انہیں ایک کوٹھری دے دی۔

دوسرے دن جب وہ نماز صبح کے بعد جب چائے خانے میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ شہید سیدوں کا مدفن اسی قبرستان میں ہے۔ جس کی چہار دیواری سامنے نظر آ رہی ہے۔ وہ تن تنہا اس میں داخل ہوئے تو فرط جذبات نے مغلوب کر دیا۔ اور تھوری دیر قدم آگے نہ بڑھے، قطار در قطار پختہ قبریں بنی ہوئی تھیں۔ اور چہار دیواری کے ساتھ گھنے درخت خاموش سنتریوں کی طرح پہرہ دے رہے تھے، بیشتر قبروں پر خفتگان کے نام کتبوں پر لکھے ہوئے تھے۔ بلکہ سید احمد شہید اور ان کے خاص ساتھیوں کے کارناموں کا حال بھی کندہ تھا۔ کرامت الٰہی دبے پاؤں ہر قبر پر فاتحہ پڑھتے رہے۔ تا ایں دم کہ دھوپ نکل آئی۔ اور انھیں محسوس ہوا کہ ایسا پر وقار شہر خموشاں انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

قبرستان کے تکیے دار کے لئے جو چھوٹا سا حجرہ کونے میں بنا ہوا تھا۔ کرامت الٰہی اس میں جا بیٹھے۔ اور اپنی یاداشت میں اس تاریخی عمل کا جائزہ لینے لگے۔ جو ان جانثاروں کو صدیوں پہلے شمالی ہند سے یہاں کھینچ لایا تھا۔ یہی وہ جذبہ تھا جو انہیں بھی مالابار سے کراچی لے آیا تھا۔ ان کے ہم سفروں نے لاکھ کوشش کی، کہ کرامت الٰہی ان کے گاؤں چلے چلیں۔ لیکن بالاکوٹ کا ماحول انہیں اتنا بھایا کہ انہوں نے اسی وقت یہاں رہنے کا تہیہ کر لیا۔ جب تک وہ قافلے گھر والوں سے مل جل کر واپس کراچی کا رخ نہ کرتے۔ ان کا دستور یہ قرار پایا کہ دن کا زیادہ حصہ وہ گورستان میں تلاوت کلام پاک اور مذہبی کتابوں کے مطالعے میں گزارتے۔ شام کو درزی سوا رخاں کے پاس بیٹھ کر ان مجاہدوں کا جنگ نامہ اس طرح بیان کرتے کہ آنے جانے والوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ غرض چند ہی روز میں بالاکوٹ کے باشندوں میں یہ خبر پھیلی کہ شہید سیدوں کا کوئی نام لیوا وارد ہوا ہے۔ اور عقیدت مندوں نے انہیں ایسا سر آنکھوں پر بٹھایا۔ جس کی مثال انہیں کراچی میں نظر نہ آئی تھی۔

چند ماہ بعد جب حسب قرار ان کے پٹھان ساتھی بالاکوٹ لوٹے کہ انھیں

کراچی لے جائیں تو وہ یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ کرامت الٰہی نئے مریدوں کو قبرستان میں وعظ سنا رہے ہیں۔

دوسرے دن کرامت الٰہی نے انہیں ہدایت کی کہ وہ کراچی جا کر معلوم کریں کہ مالا بار سے کچھ مرید ان کی تلاش میں آ گئے ہیں یا نہیں، جب تک اس امر کی تصدیق نہ ہو جائے گی وہ یہیں بالاکوٹ میں قیام کریں گے۔ یہ بات ان کے ہم سفروں کو پسند نہ آئی لیکن انہوں نے ان کی ایک نہ سنی۔ ناچار وہ اپنی منزل کی طرف سدھار گئے۔ وقت کے ساتھ کرامت الٰہی کی شہرت میں اضافہ ہوتا گیا۔ کیونکہ نہ صرف سیدوں سے ان کا سلسلہ ملتا تھا۔ بلکہ وہ عربی داں بھی تھے اور بوقت ضرورت تعویذ لکھنے سے بھی عذر نہ کرتے، چنانچہ دور دور تک ان کی آؤ بھگت ہونے لگی۔ درزی سوار خاں نے ان کی آمد کو باعث برکت گردانا۔

سردی کی آمد سے پہلے آتش دان کو درست کیا۔

کرامت الٰہی کے لئے پوشش مہیا کی، اور پڑوسیوں نے لباس اور بستر کا ایسا اہتمام کیا کہ سردی اور برفانی ہوا، انہیں چھو بھی نہیں سکتی تھی۔ کوہ خیل نامی قبیلے کے سردار کو ان کا وعظ اتنا پسند آیا کہ سواری کے لئے ایک خچر لا کر دیا۔ جسے کرامت الٰہی بوقت ضرورت استعمال کرتے تھے۔ اتنے میں کراچی سے اطلاع ملی کہ ان کے مالا باری مرید طویل و بے سود انتظار کے بعد بے نیل و مرام وطن واپس لوٹ گئے ہیں۔ کاش کرامت الٰہی کو یہ خبر پہلے ملتی تو وہ ان کو بلاتا۔ یا ان تک جا پہنچتے۔ اور کراچی ہی میں بود و باش کی صورت نکالتے، لیکن اب وہاں ان کا کون رہ گیا تھا۔ اور مالا بار کیا منہ لے کر جاتے۔ چنانچہ انہیں یہی فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ فی الحال یہیں وقت گزاریں۔ ایک تو ان کے عقیدت مندوں کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور دوسرے نذر و نیاز کی کشش کے قصوں نے سوار خاں درزی کو ان کا ایسا شیدائی بنا دیا تھا کہ ہمہ وقت ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ اور ان کی خدمت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتا۔ کرامت

الٰہی نے اس کارِ خیر کا بیڑہ بھی اٹھایا کہ شہید سیدوں کے ایسے حالات بھی جمع کریں جن کا علم باہر نہ پہنچا ہو۔ انہوں نے سن رکھا تھا کہ سکھوں سے شکست خوردگی کے بعد جو مجاہد باقی رہ گئے۔ وہ پہاڑوں میں یہاں وہاں پوشیدہ ہو گئے۔ اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریزوں کے خلاف سینہ سپر ہو گئے۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ اور نئے مجاہد شمالی ہند کے مختلف صوبوں سے بالخصوص بہار سے یہاں آ کر انہیں کمک پہنچاتے رہے۔ پیر کرامت الٰہی کو خیال آیا کہ اگر وہ پٹھان بڑے بوڑھوں سے ایسے واقعات معلوم کر کے شائع کرا دیں، تو تاریخ اسلام میں ایک زریں باب کا اضافہ ہو گا۔

ان کی یہ جستجو بے سود نہ گئی۔ '' کاغان، دیر اور سوات کے علاقوں میں ج بلوگ پیر ہندی کے دیدار کے لئے جمع ہوتے تو باتوں باتوں میں کرامت الٰہی کو نہ صرف سنی سنائی باتیں، بلکہ مجاہدوں کی ملفوظات بھی دستیاب ہو جاتی تھیں۔ اس طرح کئی سال گزر گئے۔ شاید باقی عمر بھی اسی طرح گزر جاتی۔ کہ یک بیک ان کی زندگی میں ایک نیا موڑ آیا۔ رات کو انہوں نے خواب میں آواز سنی، کہ اس بے نام و نشان قبر کی طرف توجہ دو۔ جو سیدو شریف کے جنوبی حصے میں فاتحہ خوانی کی منتظر ہے۔ دراصل یہ سید زمرد علی کی قبر ہے۔ اور اس نام کی نسبت زمرد کی ان کانوں سے ہے۔ جو قبر کے مقابل پہاڑیوں میں پوشیدہ ہیں۔ کرامت الٰہی کی آنکھ کھل گئی۔ اور تعجب سے خواب کی تعبیر پر غور کرنے لگا۔ صبح واقف کاروں سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ سیدو شریف کا پرانا نام سید شریف تھا۔ اور دراصل وہاں ایک قبر موجود ہے۔ جسے لوگ سید کا مزار کہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی کرامت الٰہی نے تہیہ کیا کہ وہ سیدو شریف جا کر اس مزار کی حفاظت کا انتظام کریں گے جو مدتوں سے کس مپرسی کے عالم میں پڑا ہے۔

اس فیصلے کا اعلان کر کے جیسے ہی انہوں نے خچر پر بیٹھ کر سوات کا رخ کیا۔ کئی

جوشیلے مرید ان کے ساتھ ہو لیے۔ ہر پڑاؤ کے بعد چند اور لوگ ان کے ہمراہ ہو جاتے۔ حتیٰ کہ سوات کے قریب پہنچتے پہنچتے ایک جلوس کی شکل بن گئی۔ جب سیدو شریف میں لوگوں نے سنا کہ ایک پیر ہندی نامعلوم سید کے مزار پر فاتحہ پڑھنے آیا ہے۔ تو وہ اپنی لاعلمی پر سخت پشیمان ہوئے۔ انھوں نے بڑی گرم جوشی سے کرامت الٰہی کا استقبال کیا۔ اس جگہ ان کے لئے ایک چھولداری نصب کر دی۔ جہاں سید زمرد علی دفن تھے۔

کچھ دنوں بعد اتنا سامان مہیا ہو گیا کہ کرامت الٰہی کی رہائش کے لئے ایک حجرہ تعمیر ہوا۔ اور قبر پر سید زمرد علی کے نام کا کتبہ لگا۔ تاہم جلد ہی وہ زمرد شاہ کے لقب سے مشہور ہو گئے۔ کرامت الٰہی نے قیاس سے ان کے سن وفات کا تعین بھی کر دیا۔ اور ان کی سالانہ عرس کی رسم چل پڑی۔ اب بھی ۱۲ شعبان کو پشاور کوہاٹ وغیرہ کے قوال بصد احترام مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ اور وادی سوات کے بڑے بوڑھوں پر حال اور قال کی ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ جس کی مثال پہلے یہاں نظر نہ آئی تھی، زمرد شاہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور چادر چڑھانے والوں کی کمی نہ رہی۔ کرامت الٰہی نے تعجب سے مشاہدہ کیا کہ چادر پر کبھی کبھی بطور نذر وہ سفوف چھڑکا جاتا۔ جو زمرد کی کانوں سے کھدائی کے وقت نکلتا تھا۔ اس میں جو باریک دانے باقی رہ جاتے وہ دھوپ میں چمکنے لگتے۔ اور کرامت الٰہی کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتے تھے۔

صبح سویرے جب ہر سو خاموشی ہوتی تو وہ چمٹی سے ان دانوں کو جمع کر کے ایک پیتل کی بوتل میں ڈالتے جاتے۔ ڈیڑھ دو سال میں وہ اتنا ذخیرہ ہو گیا کہ وہ دل ہی دل میں اس کی قیمت کا تخمینہ لگانے لگے۔

یہ سارا واقعہ سنا کر سیف اللہ نے کہا۔ اس موقع پر کرامت الٰہی کو میرے بدلے ہوئے حالات کا علم ہوا۔ تو سوچا کیوں نہ کراچی چل کر مجھ سے ملیں اور اپنے

ذخیرے کو بیچنے کی کوشش کریں۔

غرض مدتوں بعد جب ان سے ملاقات ہوئی، تو ہم کئی دن تک ان تبدیلیوں کا ذکر کرتے رہے۔ جو نہ صرف ہماری بلکہ بچھڑے ہوئے دوستوں اور عزیزوں کی زندگی میں پیدا ہو چکی تھی۔ جو مالا بار میں رہ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب وہ اپنا نہیں کوئی دوسرا ملک معلوم ہونے لگا تھا۔ پھر میں نے شہر کے ان جوہریوں سے کرامت الٰہی کا تعارف کرایا۔ جو شیخ الشمس کو جواہرات بیچا کرتے تھے۔ اور میرے شناسا بن گئے تھے۔ میری سفارش پر انہوں نے کرامت الٰہی ک یمال کو آنکا۔ زمرد کے جو دانے بہت مہین تھے وہ تو کسی کام کے نہ تھے۔ البتہ جو قدرے بڑے اور بے عیب تھے۔ ان کی خاصی قیمت مل گئی۔ جوہریوں نے کرامت الٰہی کو زمرد کی پہچان کے گر بھی سکھا دیئے۔ تاکہ وہ اگلی بار بہتر سودا کر سکیں۔ قصہ کوتاہ وہ ہر سال پیری مریدی کے لئے نہیں بلکہ سوداگری کے لئے کراچی آتے ہیں۔ اور بذات خود زمرد شاہ کے لقب سے مشہور ہو گئے ہیں۔

اب رات ہونے کو آ گئی تھی۔ سیف اللہ رخصت ہونے لگے تو وعدہ کیا، کہ اگلی بار جب شیخ الشمس اور کرامت الٰہی کراچی وارد ہوں گے تو ضرور ان سے میر اتعارف کرائیں گے۔ افسوس کہ اس کا موقع نہ ملا۔ چند مہینے بعد سیف اللہ حج ک چلئے ایسے گئے کہ پھر واپس نہ آئے۔ اب تو سیف اللہ اور کرامت الٰہی کے نام سے بھی بہت کم لوگ واقف رہ گئے ہیں۔ البتہ زمرد شاہ اور ہندباد کا نام سنتے ہی کراچی سے مالا بار تک لوگوں کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ حیرت و حسد سے جزیرہ الشمس میں پوشیدہ سندباد کے خزانے اور رسیدو شریف میں مخفی زمرد کی کانوں کی سوچ کے محو ہو جاتے ہیں۔

چنبیلی

افسانہ نگار : غلام الثقلین نقوی

بڑی مشکلوں کے بعد آخر اسے کوارٹر مل ہی گیا۔

ہفتے کی شام وہ سامان اٹھا کر لایا تو کوارٹر سائیں سائیں کر رہا تھا۔ اس کے پہلے مکین اس دن اپنا سامان اٹھا کر لے گئے تھے۔ دونوں کمروں، باورچی خانوں، اور غسل خانے کے دروازے کھلے ہوئے تھے،

کمروں برآمدوں کے فرش پر کاغذ کے ٹکڑے، تنکے اور سینکڑوں الم غلم چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کہین قلم کے ترشے تھے، کہیں پنسل کے ٹکڑے، کہیں سیاھی کے دھبے، دیواروں کی قلعی پژمردہ سی تھی۔

اوراس پر سیاہی اور پنسل کے مصور اہنگل کاریوں کے نادر نمونے منقش تھے، کہیں گدھوں کی تصویریں تھیں، اور نیچے لکھا تھا۔ میاں کامل عرف گورخر۔ ایک تصویر کے نیچے یہ مصرع تحریر تھا۔

تعریف اس خدا کی جس نے گدھا بنایا۔ ایک اور مقام پر ایک لڑکی کی بے ڈھنگی سی تصویر بنی ہوئی تھی۔ جس کے ہاتھ میں کتابیں تھیں اور آنکھوں پر بڑی مضحکہ خیز عینک لگی ہوئی تھی۔ اوراس کے نیچے لکھا ہوا تھا بابا آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔

بابا رشید نے سامان فرش پر رکھا۔ اس کی کل کائنات ہی کیا تھی، یہی ایک ٹرنک ایک بستر، ایک دری دو چار پائیاں، دو آرام دہ کرسیاں اور ایک بوری میں چند برتن۔ دوسرے کمرے کو شاید پرانے مکین ڈرائنگ روم کے بطور پر استعمال کرتے تھے۔ کیونکہ اسکمرے کی دیواروں کی قلعی اتنی بوسیدہ نظر نہیں آتی تھی۔ بابو رشید نے گھوم پھر کر اس کمرے کا بھی جائزہ لیا۔ ایک جگہ پنسل سے کچھ لکھا ہوا دیکھ کر ٹھٹھک

گیا۔ چونکہ روشنی کم تھی اسلیے تحریر اتنی واضع نہ تھی، اس نے لپک کر سوئچ دبایا۔ لیکن جب روشنی نہ ہوئی تو وہ اپنی بدحواسی پر مسکرایا، جانے والے اپنا بلب بھی اتار لے گئے تھے۔

اس نے ٹرنک سے اپنا بلب نکال کر لگایا، اور سوئچ دبایا تو روشنی میں تحریر واضع تھی، مین چار سال کی تھی۔ کہ اس کواٹر میں آئی۔ اور اب پندرہ سال کے بعد جا رہی ہوں۔ تو، یہ پندرہ سال، زندگی کتنی جلدی گزر جاتی ہے۔ لیکن اس کے نقوش دل سے نہیں مٹ سکتے۔ کیا یہی زندگی ہے؟

بابو رشید نے زیر لب جواب دیا، نہیں محترمہ! زندگی کے نقوش بھی زندگی کی طرح بنتے اور مٹتے رہتے ہیں۔ اگر آپ انیس سال کی عمر میں آنکھوں پر فلسفے کی عینک لگا کر بھٹک گئیں، تو زندگی کا نخلستان کہیں نہیں آئے گا۔ اور اسے اپنے فلسفے پر حیرت ہوئی کہ اس سے پہلے اس نے کبھی فلسفہ آرائی کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن آج یہ فلسفیانہ نکتہ لطیف اس کے ذہن کے کون سے چشمے سے پھوٹا۔ اس نے کچھ دیر سوچا۔ اور کوئی جواب نہ پا کر مڑنے ہی والا تھا کہ تحریر نے گویا پھر اس کو اپنی طرف بلا لیا۔ بابو رشید نے سوچا بڑی مشکلوں سے یہ کواٹر ملا ہے، کل اس کی دیواروں پر سفیدی کراؤں گا۔ تصویریں لٹکاؤں گا۔ فرش پر دری بچھا کر عین درمیان میں میز رکھوں گا۔ اس کی دونوں طرف دو آرام دہ کرسیاں بچھاؤں گا۔ لیکن میز پوش۔ یہ میرے بس کی بات نہیں، اس کی ذمہ دار بیگم رشید ہوں گی۔۔۔ بیگم رشید اور تخیل کیا ڑان کے ساتھ بیگم رشید کی مخروطی انگلیاں بڑھیں۔ اور خیالی میز پوش پر قوس قزح کے سات رنگ اور بہار کے لالہ زار کاڑھ گئیں۔ اور پھولوں سے رنگ و بو کے طوفان اٹھے۔ اور بابو رشید کے ذہن میں روشنیوں کا چشمہ نور پھوٹا، فلسفے زندگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ بیگم رشید کی میٹھی آواز نے سرگوشی کی۔ یادوں کے نقوش زندگی سے تشکیل پاتے ہیں۔

اور زندگی سے ہی کسب زندگی کر کے جاوداں بھی ہو جاتے ہیں۔اور یادوں ک اپہلا نقش ایک لمحے کے اندر اندر جاوداں ہو کر اس کے دل میں مدغم ہو گیا۔

اتوار کی صبح کو سفیدی کرنے والے مزدور سے پہلے اس نے چھت پر سے اور کونے کھدروں پر سے جالے اتارے،مزدور آتے ہی کام مین جٹ گیا۔ بڑے کمرے میں دوپہر سے پہلے پہلے سفیدی ہو گئی،

چھوٹے کمرے میں مزدورن یکام شروع کیات ووہ برآمدے میں کرسی بچھا کر بیٹھ گیا۔پھر بھوک نے اسے تنگ کیا تو وہ بڑے کمرے کے اندر ضروری سامان رکھ کر اور تالا لگا کر بازار چلا گیا۔کھان اکھا کر جب لوٹا تو مزدور کا برش دیوار کے اس حصے کے قریب تھا۔جہاں نیلی پنسل سے یادوں کے کچھ نقوش مرتسم تھے۔برش اس حصے پر پہنچا تو بابو رشید کا جی چاہا، کہ مزدور کو روک دے۔اور کہے ان یادگار الفاظ کو سفیدی کی تہہ مین دفن نہ کرو۔لیکن الفاظ اس کے ہونٹوں پر آ کر ٹوٹ گئے۔

اس نے سوچا مین کتنا جذباتی ہوں۔اور مزدور کا برش نیلے الفاظ کو سفیدی کی تہہ میں چھپا کر چھپاک سے آگے بڑھ گیا۔ اور بابو رشید کا دل جیسے گھٹ گیا، گویا اس نے نازک پھول کی پتیوں کو انگلیوں مین مسل دیا ہو۔

سہ پہر ہوئی تو مزدور کام ختم کر کے رخصت ہو گیا، اس نے سوچا بیگم رشید اگلے اتوار جب اس گھر میں قدم رکھے گی تو ہماری زندگی کا نیا دور شروع ہو گا۔ میں ان کے آنے سے پہلے پہلے اس گھر کو سجا کر نئی زندگی کی خوش آمدید کے لئے تیار کر دوں گا۔

اور پھر یکا یک کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ بابو رشید نے بڑھ ک ردروازہ کھولا، تو دروازے میں جھاڑو ہاتھ میں لیے بھنگن کھڑی تھی۔بھنگن نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لیا۔پھر اس نے پوچھا بابو یہ لوگ؟ بابو رشید نے مسکرا کر کہا۔وہ چلے گئے یہ کواٹر مجھے مل چکا ہے۔

چلے گئے؟ بھنگن نے دہلیز پر بیٹھتے ہوئے کہا،، کب؟ وہ سبھی چلے گئے؟

کل صبح بابو برکت علی نوکری سے فارغ ہو چکے ہیں۔

اوہ بھنگن نے آہ بھر کر کہا سبھی،،،، مجھے کل بخار تھا،،،،، میں آ نہ سکی، مین ان سے مل بھی نہ سکی، بڑے اچھے لوگ تھے۔

ہاں، ہاں" بابو رشید نے بے صبری سے کہا" اچھے لوگ تھے وہ اب جلدی سے اٹھواور کمروں کو صاف کر دو۔

پر بابو تم اکیلے اس گھر میں رہو گے۔

نہیں،، نہیں اگلے اتوار کو بیگم بھی تو آ رہی ہے۔اس نے چمک کر جواب دیا۔

دیکھو جمعدارنی ! بابو رشید نے سنجیدہ لہجے میں کہا" فرش شیشے کی طرح چمک اٹھیں۔

پر وہ لوگ بہت اچھے تھے، میں اتی سی تھی جب ان کے گھر کام شروع کیا۔اور اب وہ چلے بھی گئے اور مجھے پتا نہ ہوا،،،،

بھنگن نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔۔

جمعدارنی ! بابو رشید نے کچھ کہنا چاہا، لیکن بھنگن نے بات ٹوک کر تیزی سے کہا" بابو، لوگ مجھے چنبیلی کہتے ہیں۔

"چنبیلی بابو رشید ایک قدم پیچھے ہٹ گئے،" تمہارا نام چنبیلی ہے؟"

"جی ہاں، جی ہاں! چنبیلی نے بھی حیران ہو کر جواب دیا۔

اور بابو رشید نے بھنگن کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔اس میلی گٹھڑی کو لوگ چنبیلی کہتے ہیں

اور چنبیلی کا پھول کتنا نازک، کتنا حسین اور کتنا عطر بیز ہوتا ہے۔اس لڑکی کو جس کے سر پر گندگی کا ٹوکرا، اور ہاتھ میں جھاڑو ہے چنبیلی سے کیا نسبت، برعکس نام نہند زنگی کافور۔اور ایک لمحے کے لئے اس نے بھنگن اور چنبیلی کی اس نسبت کو نفرت کے

ابلتے ہوئے آتش فشاں میں ڈال دیا۔ ہوں! چنبیلی فطرت کے حسین ترین کرشمے کی اتنی ہتک۔ ایک شاہکار کو سڑاند اور کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینا کتنا بڑا ظلم ہے۔ لیکن دوسرے لمحے بابو رشید کی نظریں اسکے گندے پاؤں سے اٹھیں، اور سارے سراپے کو طے کر کے بھنگن کی آنکھوں تک پہنچ گئیں۔ اور اسے اپنی نفرت پر شرم محسوس ہوئی۔ بھنگن کے دل کا تاسف اسکی آنکھوں میں ایک ایک چمکدار اور مقدس آنسو کے شہکار کی شکل پا چکا تھا۔ اور اس کی آنکھیں چنبیلی کے وہ پھول بن گئی تھیں۔ جنہیں شبنم کے ایک ایک قطرے نے دھو کر پاکیزہ بنا دیا ہو۔ اس نے کہا، چنبیلی لوگ آتے اور جاتے رہتے ہیں چلو اٹھو کوارٹر صاف کرو۔

شام ہونے سے پہلے پہلے چنبیلی نے کوارٹر کا ہر کمرہ صاف کر دیا تھا۔ فرش چمک کر آئینہ بن گئے۔ اور بابو رشید ایک نیا ولولہ لے کر بیگم رشید کے استقبال کے لئے تیار ہو گیا۔

چنبیلی ٹوکرا سر پر رکھ کر اور ہاتھ میں جھاڑو لیے جانے کے لئے مڑی تو اس نے کہا بابو بی بی کو جلدی بلا لو۔ اکیلے میں تمہارا جی کیسے لگے گا۔

اچھا، اگلے اتوار کو،،،،

بابو رشید نے چنبیلی کے متعلق مزید کچھ نہ سوچا،

آخر اسے سوچ میں گم رہنے کی فرصت بھی کہاں تھی، بیگم رشید گھر سے نکل کر پہلی بار اس کی اور صرف اس کی بن کر رہنے کے لئے آ رہی تھی، اس سے قبل وہ ایک دوسرے کے قریب آئے ضرور تھے۔ لیکن قرب کی وہ منزل ابھی نہیں آئی تھی، جہاں روحیں ایک دوسرے میں رنگ و بو کی طرح رچ جاتی ہیں۔ ماں، باپ، بھائی، بہنوں کے جمگھٹے میں یہ منزل محبت بھرے اشارے ضرور کرتی رہی تھی، لیکن اس تک پہنچنے کے لئے ایک ہجوم میں سے گزرنا تھا۔ جو اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اور اب یہ منزل قریب تھی بابو رشید اس کے تصور سے ہی کانپ کر رہ گیا۔ نجانے اس منزل پر

اتصال کی کون سی کیفیت درپیش ہو؟ وہ اتسال جو دو قطروں کو ملا کر فنا کر دیتا ہے۔ یا وہ جو قطرے کو سیپ میں ڈال کر در شہوار کی لا فانی چمک عطا کرتا ہے۔ اور بابو رشید کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔ البتہ احساس قربت کی یہ شدت اس کی روئیں روئیں میں

جھرجھری بن کر تیرتی رہی، انتظار کے یہ دن رینگ رینگ کر گزرنے لگے،

چنبیلی ہر صبح بابو سے پوچھتی، کہ بی بی کب آئیں گی۔ اور وہ ہر صبح یہی کہتا اتوار کی شام کو،، اور ہر صبح اس جملے پر نہ جانے بابو رشید چنبیلی کو اپنی بیگم کے ساتھ ساتھ اپنے قریب تر آتا ہوا محسوس کرتا۔ جیسے چنبیلی بھی ان کی وحدت کا ایک سا سالہ بنتی جا رہی ہے۔ وہ نقش جس کے بغیر تصویر کی تکمیل وترتیب تشنہ سی رہتی۔

بابو رشید انتظار کے ان دنوں میں بڑا مصروف رہا۔ دفتر سے آکر وہ دیواروں پر رنگین کاغذ اور کیلنڈر لگاتا۔ ایک دو تصویروں کا مناسب مقام مقرر کرنے کے لیئے اسے اپنا بہت سا وقت قربان کرنا پڑتا۔ اسے کپڑے لٹکانے کے لئے کیلیاں ٹھونکنی پڑیں۔ اور انگیٹھی پر دو گل دان اور درمیان میں آئینہ رکھنے کے لئے اسے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو کڑی آزمائش میں سے گزارنا پڑا۔ لیکن جب وہ ان مرحلوں کے ساتھ کامیابی سے گزر گیا تو اس نے مسکرا کر اپنے آپ کو کہا، بابو رشید تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو گی جب بیگم رشید کے حسن کارانہ ہاتھ اس کی نوک پلک نہ سنواریں گے۔

جمعہ کی صبح جب چنبیلی جھاڑو دے کر فارغ ہوئی تو اس نے حسب معمول بڑی بے تکلفی سے پوچھا'' کیوں بابو کب جا رہے ہو بی بی کو لینے۔ بابو رشید نے نہایت خوش دلی سے کہا۔ آج شام کو،،،،،

پرسوں تک یہ کوارٹر آباد نظر آئے گا۔۔ بابو رشید نے نہایت خوش دلی سے کہا۔

اور اس شام وہ دفتر سے سیدھا اسٹیشن پہنچا، بیگم رشید کے تصور میں کھویا کھویا گاڑی پر سوار ہوا،

گاڑی نے خراٹے بھرے، انجن نے بھک بھک، ٹھک ٹھک کے نغمے بکھیرے، ڈبے میں بھانت بھانت کے لوگوں نے بھانت بھانت کی بولیاں بولیں۔لیکن بابو رشید اپنے آپ میں اور اپنے سے زیادہ اپنی زندگی کے مستقبل میں گم رہا۔گاڑی منزل مقصود پر پہنچ ہی گئی۔ ہفتے کا دن تیاریوں میں صرف ہوگیا، اتوار کی صبح کو وہ پھر گاڑی پر سوار ہوا، لیکن اب بیگم رشید ساتھ تھیں، مگر انہیں زنانہ ڈبے میں بیٹھنا پڑا۔وہ ہر اس ٹیشن پر گاڑی سے اترتا۔اور زنانہ ڈبے کے سامنے ٹہل کر بیگم رشید کی ایک جھلک پا کر سرشار لوٹ آتا۔

اپنے اسٹیشن پر پہنچ کر اس نے ٹانگہ لیا۔سامان رکھوا کر وہ بیگم کے پہلو سے پہلو ملا کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔بیگم برقعے میں لپٹی ہوئی تھی،

بابو رشید نے کہا ''بیگم بھرے گھر سے نکلی ہو اس لئے تم اداس ہو۔زندگی کے اس موڑ پر اداسی کی یہ کیفیت ضرور آتی ہے۔لیکن......نہیں......بیگم نے دھیمے سے کہا، میں اداس نہیں ہوں......

کوارٹر میں تمہیں خوش آمدید کہنے کے لیئے بھی کوئی نہیں ہوگا۔بابو رشید نے کہا، لیکن شاید چنبیلی ہمارا انتظار کر رہی ہو......

ہاں چنبیلی......وہ کوارٹروں کی بھنگن ہے......روز پوچھتی ہے کہ بی بی کب آئیں گی......بابو رشید نے مسکرا کر کہا۔

بیگم بابو رشید چنبیلی کا نام سن کر حیران ہوئی تھی، لیکن جب اس کے ساتھ بھنگ کا لفظ سنا تو ان کی حیرت پر ایک عجیب سی بے حسی چھا گئی۔۔۔۔

کیا اچھا نام ہے اور کتنی غلط جگہ پر استعمال ہوا ہے۔

''لیکن جب تم چنبیلی کو دیکھو گی تو تمہیں اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑے گا۔

کیوں......اس کی بیوی پھر چونک گئی۔

اس لئے کہ اس کی آنکھیں کبھی کبھی شبنم سے دھلے ہوئے چنبیلی کے پھول معلوم

ہوتی ہیں۔

چنبیلی کے پھول۔بیگم نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

بائیں طرف مڑ جاؤ۔بابو رشید نے تانگے والے سے کہا۔

اس کھمبے کے پاس ٹھہر جانا۔اور دو ایک منٹ کے بعد ان کا کوارٹر آ گیا۔بابو رشید ایک پر اشتیاق بچے کی طرح کود کر تانگے سے اترا۔بیگم کو اس نے سہارا دے کر اتارا۔اور پھر سامان اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔تانگے والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا۔اور جذبات سے لرزتی ہوئی آواز مین کہا یہ رہا ہمارا کوارٹر،،چار دیواری کے دروازے کا تالا کھول کر اس نے سامان اندر رکھنا شروع کر دیا۔کئی بار رک کر اس نے گلی کی دونوں طرف نظر دوڑائی،لیکن چنبیلی کہیں نظر نہ آئی۔آخری سوٹ کیس اٹھا کر اس نے کہا چلو بیگم قدم رنجہ فرماؤ۔بیگم نے منہ سے برقعہ الٹ لیا۔اور مسکرا کر دہلیز کے اندر قدم رکھا۔معاً گلی کے نکڑ پر چنبیلی نظر آئی۔اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھا نہ سر پر ٹوکرا۔بابو رشید نے کہا۔

دیکھو بیگم چنبیلی آ گئی۔چنبیلی نے قریب آ کر کہا،بی بی تم آ گئیں،،اور اس کے لہجے میں خوش آمدید کی لرزش تھی۔بیگم رشید جواب میں مسکرائیں،اور بیگم کی یہ مسکراہٹ گویا چنبیلی کی آنکھوں کی شوخ چمک بن کر ابھری۔

آج پہلی بار اس نے محسوس کیا،کہ وہ دفتر سے فارغ ہو کر گھر جا رہا ہے۔ایک رات کاٹنے کے لئے۔ایک زندگی بسر کرنے کے لئے۔دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر وہ صحن میں داخل ہوا،تو سامنے چنبیلی کھڑی تھی۔چنبیلی نے شکایت بھرے لہجے میں کہا"بابو،بی بی سارا دن گھر میں اکیلی رہیں۔اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔

آج ایک ضروری کام تھا،چنبیلی کل سے دیر نہیں ہو گی۔بابو رشید نے مسکرا کر کہا۔اور اسے چنبیلی کی یہ ادا بھی بھا گئی۔اور یادوں کے لالہ زار میں ایک اور پھول کھلا۔

بیگم رشید نے کہا آج چنبیلی اپنا کام ختم کر کے میرے پاس بیٹھی رہی۔ اس نے غائبانہ طور پر مجھے کواٹروں مین رہنے والے ایک ایک کنبے سے متعارف کرایا۔ اس کواٹر کے پرانے باسیوں کے حالات سنائے۔

اگر وہ آج نہ آتی تو یہ پہاڑ سا دن کیسے کٹتا۔ اور

بابو رشید کا سر چنبیلی کے اس احسان تلے جھک گیا

بابو رشید اور بیگم رشید کی زندگیاں جزبات واحساسات کے طوفان میں سے گزر کر ایک مقررہ نہج پر رواں دواں ہوگئیں۔ ایک ڈگر، ایک راستہ، ایک منزل، صبح و شام، دن رات لمحوں کا ازلی اور ابدی تسلسل۔ دفتر اور گھر، گھر اور دفتر۔

معمولات کا ایک سلسلہ، جسمیں نغمہ شادی اور غم کے ہنگامے بھی کوئی طوفان پیدا نہیں کرتے۔ بس زندگی کی سوئی گھسے پٹے ریکارڈ کی لکیروں میں گھومتی رہتی ہے۔ اور نغمہ زندگی کی ہر تان ٹوٹ کر فضاؤں کی گردش کا ایک جزو بن جاتی ہے۔ جب دو جسموں، دو روحوں، کے اتصال نے ایک نئی روح کی تخلیق کی۔ یہ تخلیق آزمائیش کے بڑے کڑے مرحلوں میں سے گزری۔ تخلیق آدم سے لے کر آج تک حوا کی ہر بیٹی نے خون، گوشت اور پوست کی قربانی دی ہے۔

بیگم رشید کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ ہونٹوں کی سرخی جاتی رہی۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک جسمانی انقلاب آیا۔ ..... ایک طوفان جو خزاں کے سرد دنوں میں چلتا ہے۔ اور پھر ..... انقلاب سے ایک نیا نقش ابھرا۔ تصویر کی تکمیل میں ایک اور آہنگ کا اضافہ ہوا۔ عظمت کے رنگ کا ایک اور چھینٹا مصور

کے موقلم کی ایک اور لرزش۔ اور یہ نقش بھی کتنا جاندار تھا۔

کہو چنبیلی! بیگم رشید نے مسکرا کر کہا۔

نہ بی بی بات کرتے ہوئے لاج آوے ہے۔ چنبیلی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

لاج ..... کس بات کی؟ بیگم رشید نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ مجھے روج لینے آوے ہے۔

کون؟

''وہ چنبیلی نے اور جھینپ کر کہا۔

''صاف صاف بات کیوں نہیں کرتیں؟ وہ کون؟......اوہ......بیگم رشید نے چہک کر کہا......تمہارا دولھا......

واہ......واہ......پر تمہارا بیاہ کب ہوا تھا؟

''بچپنے میں جب میں چھوٹی سی تھی،

''تو تم اس کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں؟

''پر بی بی میں کواڑوں کو چھوڑ کر کیسے جاؤں؟

تم لوگوں میں اتنی عمر بیت گئی۔

نہیں......چنبیلی......ہر عورت کو جانا پڑتا ہے......بیگم رشید نے یکا یک سنجیدہ ہو کر کہا۔ آج نہیں تو کل تمہیں ضرور جانا پڑے گا۔ یہ تو دنیا کی ریت ہے۔ ٹھیک ہے بی بی پر جن لوگوں کے ساتھ جی لگ گیا ہو؟ انہیں چھوڑتے ہوئے دکھ تو ہوتا ہے۔ سبھی کہتے ہیں تم چلی جاؤ۔

چنبیلی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔۔کوئی یہ نہیں کہتا چنبیلی تم رہ جاؤ۔

یکا یک اندر پنگھوڑے میں ننھے ارشد نے جاگ کر ایک تان اڑائی۔ بیگم رشید بے قرار ہو کر اٹھیں۔ اور لپک کر کمرے کے اندر چلی گئیں۔ چنبیلی نے بیگم کی اسے قراری کو اپنے تن بدن مینجلی کی رو بن کر گزرتے ہوئے محسوس کیا۔ اور اس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔ ایک نادر جذبے نے اسے جھنجھوڑا۔ سر سے لے کر پاوں تک جسم کا ایک ایک بال ستارے ک بتار کی طرح جھنجھنایا۔ چنبیلی اپنے اس احساس کو، اس ایک لرزش کو۔ اس کپکپاہٹ کو، ایک آہنگ کو جس میں کئی نغمے ڈھل گئے تھے شعوری طور پر نہ پاسکی۔ لیکن نغموں کے طوفان میں تخلیق کے غیر مرئی ہاتھ نے رنگ بھرے، اور

تخلیق کے ازل اور ابد ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ اس کے دم سے نور کی ایک کرن پھوٹی۔ اور اس کے جسم و روح میں رچ گئی۔ اور اس کی آنکھیں والہانہ رقص بن گئیں۔ جب بیگم رشید منے کو لے کر باہر آئیں۔ تو چنبیلی نے کہا، بی بی اب وہ مجھے لینے آوے تو میں چلی جاؤں!

ہاں، ہاں! بیگم رشید نے بڑے پر زور انداز میں لیکن دلدوزی اور شفقت سے مسکرا کر کہا، اور اس پر اسرار مسکراہٹ میں اس پیغمبر کا پر خلوص فخر بھی شامل تھا۔ جو ایک گم شدہ راہی کی تخلیق کے مقدس فرض کی طرف بلانے میں کامیاب ہو گیا ہو،

"چار دنوں بعد چنبیلی کا وہ اسے لینے آ گیا،

چنبیلی نے اس دن سرخ جوڑا پہن کر، کلائیوں پر چوڑیاں، ناک میں سونے کی کیل اور بالوں میں تیل ڈال کر مانگ نکالی، اور ہاتھوں پر مہندی کی سرخیاں رچائے، ہر کواٹر میں گئی، اور ہر جاننے پہچاننے والے سے رو کر رخصت ہوئی۔ بڑی بوڑھیوں نے دعائیں دیں۔ ہم سنوں نے بڑی پر معنی مسکراہٹ کے ساتھ اسے رخصت کیا۔ سب سے آخر میں چنبیلی بیگم رشید کے کواٹر میں گئی۔ بیگم رشید نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔ چنبیلی سرخ کپڑوں کی گٹھڑی بن کر برآمدے کے فرش پر بیٹھ گئی۔ بیگم رشید نے کہا "کیوں چنبیلی آج جا رہی ہو اپنے پیا کے ساتھ......"

چنبیلی نے کوئی جواب نہ دیا، بلکہ لاج کے مارے سکڑ سمٹ گئی۔ بیگم رشید نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا، جیسے وہ بڑی بہن ہو۔ اور چھوٹی بہن کو زندگی کے اس نئے سفر پر الوداع کہہ رہی ہو۔

چنبیلی کا جسم اس ہاتھ کے مقدس لمس سے کانپا۔ اس نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں صبح کی شبنم کے چند قطرے کانپے۔ اور اس کی آنکھیں ڈھل کر چنبیلی کا پھول بن گئیں۔ بیگم رشید نے رندھی ہوئی آواز میں کہا، چنبیلی! جاؤ زندگی کا نیا سفر تمہیں مبارک ہو۔

اگلی صبح چنبیلی کی بجائے اس کی بوڑھی ماں آئی۔

وہ صحن میں جھاڑو دینے لگی، تو بابو رشید نے بیگم سے پوچھا۔ آج چنبیلی کہاں گئی بیگم؟

جہاں سب عورتیں جایا کرتی ہیں۔

ہائیں! بابو رشید نے حیران ہو کر پوچھا، یعنی...... پھر خود سمجھ کر اس نے نظریں جھکا لیں۔ اور ایک آہ بھر کر کہا، تو چنبیلی بھی چلی گئی، ...... گویا...... تصویر زندگی سے ایک نقش جدا ہو گیا۔''

کیا بیگم رشید نے چونک کر پوچھا۔

کچھ بھی تو نہیں...... میں سوچ رہا تھا...... تصویر زندگی میں کچھ نقش ابھرتے ہیں، تو کچھ مٹتے بھی رہتے ہیں۔ کیا زندگی اسی کا نام ہے۔؟ اور بابو رشید نے چاہا، کہ اپنے اس تاثر کو کواٹر کی کسی دیوار پر نقش کر دے۔ لیکن اب وہ زندگی کی اس منزل پر پہنچ چکا تھا۔ جہاں اس رومان پرور فلسفہ آرائی کی عشرت کی بھی اجازت نہیں مل سکتی۔

چنبیلی کے چلے جانے کے بعد کواٹر میں کافی فرق آ گیا۔

نہ فرش چمک کر آئینہ بنتے، نہ کونے کھدروں میں سے گرد و غبار صاف ہوتا، بوڑھی جمعدارنی جھاڑو دینے سے زیادہ کھانستی۔ اور صحن کے گرد و غبار سے زیادہ اپنی بلغم کو جھاڑو میں لپٹتی۔ اور جب وہ کھانس، کھانس کر بے حال ہو جاتی تو کہتیہ یہ بوڑھی ہڈیاں اب ان میں اتنا ست کہاں۔ دھیاں جوانی لے جائیں۔ اور اللہ نے پوت کا منہ نہ دکھایا ہو، ت وجیتے جی نرک ہے بی بی نرک۔

بیگم رشید دو چار دن تو بوڑھی جمعدانی کو ٹوکتی رہی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے بڑھاپے پر ترس کھا کر مطمئن ہو گئی۔ اور جھاڑ پھونک کا کام خود نمٹا کر اس سے کہتی ''جمعدارنی کوڑا اٹھا کر لے جایا کرو۔

باقی سارا کام میں خود کر لیا کرونگی۔ بوڑھی جمعدارنی تشکر آمیز گدلی، گدلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر کہتی۔ بی بی! بڈھ سہاگن رہو! دودھوں نہاؤ۔ پوتوں پڑپوتوں کا منہ دیکھو! بیگم رشید مسکرا کر کہتیں۔ نہ......نہ......جمعدارنی اتنی لمبی لمبی دعائیں مت مانگو۔ دعا کرو، کہ تمہاری عمر تک پہنچنے سے پہلے پہلے خدا موت دے دے۔

بوڑھی جمعدارنی لرز کر کہتی ''ایسا مت کہو بی بی جان بڑی پیاری چیز ہے۔

پورے تین ماہ بعد ایک صبح چنبیلی جھاڑو ہاتھ میں لیے ہوئے صحن میں آئی، بیگم رشید بے تاب ہو کر بول اٹھیں۔چنبیلی......چنبیلی......تم پھر آ گئیں؟

ہاں بی بی سسرال میں کیسی گزری؟ تمہارا جمعدار کیسا آدمی ہے؟۔تمہیں ہاتھوں ہاتھ لیا ہو گا۔پھول کی طرح رکھا ہو گا۔

''بی بی چنبیلی نے کہا، ایسا مت کہو۔

کیوں بیگم رشید حیران ہو گئیں۔

بی بی وہ جوا کھیلتا ہے، گانجا پیتا ہے۔اس نے مجھے دوبارا تنا پیٹا، کہ میں چارپائی سے اٹھ نہ سکی۔برا جالم ہے بی بی۔میں تو جیتے جی دوزخ میں پڑ گئی

اب مرتی مر جاؤں گی، پر اس کے پاس نہ جاؤں گی۔

چنبیلی کی آنکھیں بھر آئیں۔

چل پگلی! بیگم رشید نے مسکرانے کی ناکام کوشش کی۔تو جس کے پلے بندھ گئی، اسی کی ہو کر رہنا پڑے گا۔چنبیلی نے کوئی جواب نہ دیا۔اس نے اپنا کام ختم کیا۔کچھ دیر بعد بیگم کے پاس بیٹھ کر دوسرے کوارٹر میں چلی گئی۔اس طرح ایک ماہ گزر گیا۔

چنبیلی کا جمعدار اسے کئی بار لینے آیا۔لیکن اس نے ہر بار جانے سے انکار کر دیا،

ایک دن بابو رشید دفتر سے آ رہا تھا، کہ سڑک کے کنارے ایک بھیڑ دیکھ کر رک گیا۔

بھیڑ میں مرد عورتیں اور بچے ایک بے ہنگم سا شور وغل کر رہے تھے۔ اس نے پہلے تو گزر جانا چاہا۔ پھر فطرت کے اس پہلو کی تسکین کے لئے جسے جستجو کہتے ہیں۔ وہ بھیڑ کی طرف بڑھا۔

جمعداروں کی بستی کی ساری آبادی بھان بھانت کی بولیاں بول رہی تھی، کچھ جمعدارنیاں ابھی تک سروں پر ٹوکرے اور ہاتھ میں جھاڑو لیے کھڑی تھیں۔

بابو رشید نے غور سے دیکھا، تو مجمع کے درمیان چنبیلی کو کھڑے پایا۔ اس کا ہاتھ ایک سرخ آنکھوں والے مضبوط کاٹھ کے کالے بھجنگ جمعدار کے ہاتھوں میں تھا۔ اور وہ اسے کھینچ رہا تھا۔ چنبیلی پورا زور لگا کر مدافعت کر رہی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، اور اس آنسوؤں مین وحشت تھی، جیسے اسے کوئی غیر مرد کھینچ رہا ہو۔

بابو رشید کچھ دیر حیران کھڑا رہا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے، اچانک چنبیلی کی نظر اس پر پڑ گئی، اس نے چیخ کر کہا، بابو مجھے اس موذی سے بچاؤ، بابو رشید کا خون سنسنایا اور کھول اٹھا۔ اس نے چاہا کہ بڑھ کر اس کے ہاتھ کو کاٹ ڈالے۔ جو ایک مظلوم عورت کی کلائی پر تھا۔ لیکن ابھی وہ معاملہ کی تہہ تک نہ پہنچ پایا تھا۔

اس لئے کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑا رہا۔ چنبیلی کی دوسری پکار پر وہ لپک کر آگے بڑھا، کہ ظلم کا ہاتھ جھٹک دے، مگر ایک بوڑھے جمعدار نے کہا نہ...... بابو...... تمھیں پرائی آگ میں کودنے کی کیا جرورت ہے؟ یہ جمعدار چنبیلی کا خصم ہے، تم اپنی بے اجتی کیوں کرواتے ہو؟ بے عزتی کے لفظ پر بابو رشید نے حقیقت کے خوفناک چہرے کو دیکھ لیا، اس نے سر جھکا کر منہ موڑ لیا۔ چنبیلی نے کہا بابو! یہ جالم روج نشہ کرے ہے۔ اور مجھے پیٹے ہے۔ جو کچھ میں کماؤں اسے بھی چھین لے ہے۔ میں تو اس کے ساتھ نہ جاؤنگی۔ لیکن بابو رشید بے عزتی کے خوف سے بھیڑ سے نکل آیا۔ اور سر جھکا کر سڑک پر ہو لیا۔ چنبیلی کے جمعدار نے قہقہ لگا کر کہا، دیکھ لیا

اپنے یار بابو کو......آ تا میرے سامنے،......ہا، ہا......ہا......اور چنبیلی نے غصے سے چیخ کر ایک تھپڑ جمعدار کے منہ پر جھڑ دیا۔ جمعدار نے تلملا کر اس کی کلائی کو زور سے مروڑا، اور چنبیلی درد سے چیخ اٹھی، بابو رشید نے کانوں مین نگلیاں دے لیں۔ کوارٹر تک یہی کوئی ایک دو فرلانگ کا راستا تھا، یہ فرلانگ میلوں کی کٹھن مسافت بن گئے۔

جب اپنے صحن میں قدم رکھا تو اس کی پیشانی پر پسینہ تھا، اور اس کی کن پٹیاں جل رہی تھیں، سینے میں ایک طرفان تھا، کچلے ہوئے غصے، شکست کھائے ہوئے مردانہ غرور کا، آتش فشان جو اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ اس نے خاموشی سے کپڑے اتارے نہ ننھے راشد کو پیار کیا۔ نہ اسکی ہمکتی ہوئی مسکراہٹ پر توجہ دی، بیگم رشید نے کچھ دیر کے بعد پوچھا، کیا کسی سے لڑ کر آئے ہو؟

نہیں تو بابو رشید نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

پھر کچھ عجیب سے لگ رہے ہو۔

بیگم آج چنبیلی کو اس کا جمعدار کھینچے لیے جا رہا تھا۔ چنبیلی نے مجھے پکارا۔ پر میں جھوٹی عزت کے خوف سے ظلم کا ہاتھ نہ جھٹک سکا۔ بیگم رشید کچھ دیر حیران رہیں، پھر اس نے مسکرا کر کہا ''واہ آپ تو خدائی فوج دار ہیں'' سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے۔ اور بیگم کی یہ مسکراہٹ اس کے زخم پر ملائی کا پھاہا بن گئی۔

اس بار چنبیلی زمانے کی گردشوں میں کھو گئی۔ ت ودوبارہ اسکا سراغ نہ مل سکا۔ اور زمانے کے لامتناہی چکروں میں ثانیے ساعتوں میں بدلے، اور ساعتوں نے دن اور رات کے پروں پر اڑ کر برسوں کا سفر طے کر لیا۔ بابو رشید کی کن پٹیوں کے بال سفید ہوئے، بیگم رشید کے گداز بدن پر گرما و سرما، بہار و خزاں نے خوب خوب دست درازیاں کیں۔ اور یکے بعد دیگرے چار بچے پیدا ہوئے۔ اور بیگم رشید نے اپنے خون کی حدت، گوشت پوست کی سختی، اور نرمی اور نسوانیت کی ہر ظاہری دل کشی کو ان کی تربیت اور غور پرداخت پر قربان کر دیا۔ اب وہ میلے کپڑے پہن کر چولہے کے

سامنے بیٹھتیں، تو بچوں کو نہلانے دھلانے کی فرصت نہ مل سکتی، انہیں نہلاتیں دھلاتیں تو اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہتا۔ اور کبھی اپنے بکھرے ہوئے بال درست کرنے بیٹھتیں۔ تو بچے کھیل کود میں لگ کر مٹی اور کیچڑ میں لت پت ہو جاتے۔ کبھی کبھار کوئی بچہ زکام یا خسرے میں مبتلا ہو کر رو رو کر مسلسل شور مچاتا تو ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔ اس ہنگامے میں بابو رشید اور بیگم رشید کی زندگیوں کی انفرادیت گم ہو کر ایک پر شور دھارے میں بہہ گئی۔ کبھی کبھار کوئی لمحہ ایسا آتا جب بابو رشید اور بیگم تنہائی میں ایک دوسرے کو دیکھتیاور حیران ہو کر رہ جاتے۔ جیسے طوفانی لہروں کے تھپیڑوں پر بہنے والے انسان ایک دوسرے کے قریب آئے ہوں۔ اور پھر ایک اور لہر ان کے درمیان حائل ہو کر رہ گئی ہو۔

سب سے بڑے لڑکے ارشد کی مسیں بھیگیں اور اس نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ تو بابو رشید اور بیگم رشید بہت خوش ہوئے۔ جیسے زندگی کے سفر کی ایک منزل طے ہو گئی ہو۔ لیکن جب ارشد سے چھوٹی اس کی بہن راشدہ نے آٹھویں کا امتحان پاس کیا اور بلوغت کی پہلی سیڑھی پر پہلا قدم دھرا تو

بابو رشید نے سوچا۔ اب زندگی کا بڑا کٹھن مرحلہ شروع ہوا ہے۔ اور چند دنوں تک وہ پریشان سے رہے۔

ایک مشرقی باپ کی ذمہ داریوں کا دور شروع ہوا۔ جب غیرت روح اور ذہن کا بوجھ بن جاتی ہے۔ اور

انہوں نے بیگم سے کہا راشدہ ماشاءاللہ اب جوان ہو چکی ہے۔

ہاں ہاں، بیگم رشید نے مسکرا کر کہا "اب تو وہ گھر کے کام کاج میں میرا ہاتھ بٹایا کرے گی۔

"لیکن لڑکیاں جب جوان ہو جائیں تو ماں باپ کے سینے کا بوجھ بن جاتی ہیں۔

''وہ کیوں''

میرا مطلب ہے ہم مشرق کے لوگ ضرورت سے کچھ زیادہ غیرت مند واقع ہوئے ہیں۔اور زمانے کے تقاضوں نے ہمیں عجیب سنگھم پر لاکر کھڑا کیا ہے۔ابھی ہماری لڑکیاں معاشرے میں وہ مقام نہیں حاصل کر سکیں، کہ اپنی ذمہ داریوں کو خود سمجھ سکیں۔اور پھر اگر لڑکیوں کو تعلیم نہ دو تو، معاشرہ

انہیں قبول نہیں کرتا۔انھیں اچھا رشتہ نہیں مل سکتا۔اگر سکول بھیجو تو جی کو ہر وقت کھٹکا لگا رہتا ہے۔

بیگم رشید بھی سمجھ کر خاموش ہو رہیں۔لیکن ذمہ داریوں کا یہ بوجھ ان کے دل کی پھانس بن گیا۔بیگم رشید اب راشدہ پر وہ کڑی نظر رکھتیں، جس میں مادرانہ شفقت کے ساتھ ساتھ سختی بھی ہوتی۔جو اپنے شاگرد کے راستے کے ہر موڑ پر اس کی رہنما بن جاتی ہے۔

اور راشدہ ماں باپ کے سوتے جاگتے واہموں کا بھوت بن کر بھی کڑوی بیل کی طرح بڑھتی رہی۔بابو رشید اپنی زندگی کے کسی منزل پر رومان اور اچھی محبت کے قائل نہ تھے، لیکن کبھی کبھار وہ بیگم کے گداز جسم اور چمکتی ہوئی آنکھوں مین ضرور کھو جایا کرتے تھے، لیکن اب راشدہ کے جوان ہوتے ہی وہ اس ذہنی عشرت اور روحانی عشرت سے بھی محروم ہو گئے۔وہ راشدہ کی موجودگی میں بیگم کے ساتھ کھل کر بات کرتے ہوئے بھی ڈرتے۔دفتر سے آتے ہی راشدہ کے متعلق پوچھتے۔اور اگر کبھی راشدہ کو گھر میں نہ پاتے تو کہتے'' کیوں بیگم ابھی تک راشدہ سکول سے واپس نہیں آئی۔؟

نہیں کسی استانی نے روک لیا ہوگا۔اور جب تک راشدہ گھر نہ آجاتی وہ مضطرب سے رہتے۔اور کبھی کبھار وہ گلی میں سے گزرتے ہوئے دیکھ لیتے، تو دل ہی دل میں دعا مانگتے یا عزیز مجھے اپنی رحمت کے حصار میں لے لے۔!

دو سال بعد راشد نے ایف۔اے کر لیا اور راشدہ نے میٹرک۔ ایک منزل اور ختم ہو گئی، بیگم رشید نے کہا۔ بیگم اب اور آگے توفیق نہیں۔ راشد ٹائپ اور شارٹ ہینڈ سیکھ لے، تو اسے اپنے ہی دفتر میں ملازم کروا دوں گا۔ راشدہ کے لئے مناسب رشتہ مل جائے تو یہ فرض بھی ادا ہو جائے۔

آپ راشدہ کے متعلق فکر نہ کریں، اسے میں نے گھر کے کام کاج میں لگا لیا ہے۔ راشد کے متعلق سوچیے۔

بیگم نے بڑی خود اعتمادی سے کہا۔ اور بابو رشید نے سوچا، کہ بیگم ان کی ذمہ داریوں میں برابر کی شریک ہیں۔ کٹھن راہوں پر باوفا ساتھی مل جائے تو کانٹے بھی پھول بن جاتے ہیں۔

اسی کواٹر میں راشد اور راشدہ پیدا ہوئے اور پروان چڑھے، اسی کواٹر مین راشد نے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی کواٹر میں راشد کے رخ پر سہرے کی لڑیاں اور راشدہ کے ہاتھوں پر حنا کی سرخیاں دیکھیں۔ اسی کواٹر میں راشد اور راشدہ سے چھوٹا حامد دسویں کا امتحان پاس کر کے کالج میں داخل ہوا۔ اور اسی کواٹر نے نغمہ غم کی وہ تان بھی سن لی

جو موت کی گھمبیرتا میں گم ہو جاتی ہے۔ جب بابو رشید اور بیگم رشید کے سب سے چھوٹے بیٹے نے دو سال تک توتلی باتوں کا جادو جگا کر قبر کی تنہائیوں کو اپنا لیا۔

راشدہ اپنے سسرال چلی گئی تو اچانک بابو رشید کو ایک دوسرے شہر میں ہیڈ کلرک بنا کر بھیج دیا گیا۔

اور بابو رشید اور بیگم رشید ایک اور شہر میں ایک اسی قسم کے کواٹر میں زندگی کے اس دور کو مکمل کرنے کے لئے چلے گئے۔ جس کی ازل ہے نہ ابد۔

بابو رشید اور بیگم رشید نئے شہر کے ایک نئے کواٹر مین پہنچ کر مدتوں بعد دوسری بار تنہائی میں ملے، تو ایک دوسرے کو پہچان نہ سکے۔

زمان مکان کے ہزار بعد کے باوجود وہ لمحہ زندہ ہو گیا۔ جب تنہائی میں پہلی بار انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس ایک لمحے کی شدت لطافت اور گریز پا۔ لیکن جاوداں تپش پھر سے زندہ ہوئی۔ لیکن اس دیئے کی لو کی طرح تلملا کر بجھ گئی۔ جس کا تیل بتی تک نہ پہنچ سکتا ہو۔ بابو رشید نے اپنی جوانی کی مسکراہٹ کا سہارا لیا۔ لیکن یہ مسکراہٹ بھی ان پژمردہ ہونٹوں۔ اور ان کے چہرے کی سوکھی جھریوں میں کچھا سطرح کھو گئی جیسے دن کی روشنی کی تاب نہ لاسکی ہو۔ انھوں نے بیگم کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا، بیگم زندگی کو ہم کئی منزلوں میں تقسیم کر لیتے ہیں۔ اکثر طے ہو گئی ہیں۔ اب شاید ایک منزل باقی رہ گئی ہے۔

وہ کون سی؟ بیگم نے پوچھا

وہی جو جھریوں، سفید بال، گنٹھیا اور نظر کی کمزوری پر ختم ہوتی ہے۔

نہیں! بیگم رشید نے ایک خیال میں کھو کر کہا۔ وہ آخری منزل

اور ان کی آواز پاتال میں ڈوب کر نکلی، جیسے وہ ایک لمحے کے اندر اندر اس وادی کی سیر کر آئی ہو۔ جہاں موت کے تاریک اور خنک سایوں کی ظلمات ہیں۔ بابو رشید کے جسم میں کپکپی آئی۔ ان کا ہاتھ تھرایا۔ اور بیگم کا ہاتھ ان کی گرفت سے نکل کر لٹک گیا۔

"آخری منزل، کیا ہم اس منزل پر اکٹھے نہیں پہنچ سکتے۔

"کون جانتا ہے کون کہہ سکتا۔؟ بیگم نے خالص فلسفیانہ انداز میں کہا، پھر نجانے وہ کیوں مسکرائیں؟

بابو رشید نے ظلمات میں سیایک کرن کو ابھرتے ہوئے اور لرزتے ہوئے دیکھا، اس میں بھرپور زندگی کی بے پناہ حرارت نہ تھی۔ تو وہ خنکی ضرور تھی، جس کے سایہ عاطفت میں زندگی کے ہر مسافر کو ایک گریزپا لمحہ ضرور میسر آسکتا ہے۔ یہ لمحہ ماں کی مقدس آغوش کا کیف ہوتا ہے۔ اور اس کے خنک بوسوں کی لذت، بابو

رشید بھی جواب میں مسکرائے۔لیکن بیگم رشید کی مسکراہٹ پھر بادلوں میں چھپ گئی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔بابو رشید نے چونک کر کہا،نہیں ......نہیں...... بیگم......ابھی وہ منزل دور ہے تم اپنے آنسو پونچھ لو۔لیکن بیگم رشید کے آنسو نہ تھمے۔ ان آنسوؤں میں وہ درد بھی تھا جو ہر اس ماں کے دل پر نقش ہو جاتا ہے۔جس کے بھرے باغ میں سے ایک پھل توڑ لیا گیا ہو۔آخر اس تک بھی موت کا ہاتھ کیوں پہنچا؟۔یہ تو خزاں کا میوہ تھا۔جو ثمرہ ءبہار سے بھی زیادہ عزیز ہوتا ہے۔

کہتے ہیں جب جوانی آتی ہے،تو طوفان کی طرح پھٹ پڑتی ہے۔لیکن جب زندگی کی سہ پہر شروع ہوتی ہے۔تو لڑھکتے ہوئے سورج کا راستا کون روک سکتا ہے،سہ پہر اور شام کے درمیان چند پیاری کرنوں کا پردہ حائل نہ ہو تو شاید سہ پہر اور شام میں کوئی فرق نظر نہ آسکے،لیکن سہ پہر کا نور اتنی جلدی تاریکی کا تعاقب کیوں اوڑھ لیتا ہے۔آہ یہ زندگی کا ایک دن!

بابو رشید کی آنکھوں پر دبیز شیشوں کی کئی تہیں چڑھیں۔چندیا انڈے کی طرح سپاٹ بن گئی۔اب کبھی کبھار کام کرتے ہوئے ان کے ہاتھ کانپتے۔گھٹنوں میں درد بھی اٹھتا،اور چلنے پھرنے میں چستی بھی نہ رہی،اور ابھی تک ان کی مدت ملازمت میں پانچ چھ سال باقی تھے۔بیگم رشید اب جوانی کا کھنڈر بن کر رہ گئی تھی، چہرے پر شکنوں کا جال۔آنکھوں کی چمک مرجھا گئی تھی۔ہاتھ کھردرے ہو چکے تھے۔اور کھال لٹک کر شکن ہو چکی تھی۔

حامد کی طرف ان دونوں کا بہت خیال رہتا۔حامد نے ایف،اے کیا تو بابو رشید نے اسے بھی ارشد کے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی،لیکن وہ ارشد کی نسبت زیادہ عزائم پسند واقع ہوا،اسے ٹائپ کی کھٹ،کھٹ اور کلاکی کی گھس گھس سے سخت نفرت تھی،اس نے کندھوں پر سٹار لگانے کے لئے خوب تگ و دو کی۔اور آخر کامیابی نے اس کے سر سہرا باندھ دیا۔وہ منتخب ہو کر ٹریننگ کے لئے چلا گیا،تو یہ کوارٹر بھی سونا ہو

گیا۔ بیگم رشید اس دن بولائی، بولائی سی پھرتی رہی۔ بابو رشید نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا، بیگم زندگی اسی کا نام ہے بچوں کو کب تک سینے سے چمٹائے رکھنا چاہتی ہو۔

راشد نے بھی بلندیوں کی طرف پرواز کی اور اسے بھی کراچی کی ایک غیر ملکی فرم میں سٹینو ٹائپسٹ کی جگہ مل گئی۔ وہ بیوی بچوں کو بابو رشید اور بیگم رشید کے پاس چھوڑ گیا۔ دونوں بڈھوں کو نئی زندگی مل گئی۔ کوارٹر میں پھر نئی پود کا چلبلی زندگی کا رقص شروع ہوا، اور وہ نغمہ جو عارضی طور پر منقطع ہو گیا تھا۔ پھر زندگی کے ساز سے ابھرا، بابو رشید دفتر سے واپس آئے تو زندگی کا نیا اور تازہ خون دوڑ کر ان کی رگ رگ میں گردش کرنے لگتا۔ وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے اور بچہ بن جاتے۔ راشد کا بڑا لڑکا ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتا۔ وہ ہاتھوں اور پاؤں کے بل فرش پر چلتے تو وہ توتلی زبان میں کہتا چل میرے دھوڑے ٹخ، ٹخ۔ اور بیگم رشید کھل کھلا کر ہنس پڑتیں۔ اور کہتیں ارے شاہ سوار تیرے گھوڑے کی ایال کہاں ہے۔ اور کبھی کبھار جب راشدہ بھی اپنے ننھے کو لے کر آ جاتی، تو پھر کوارٹر میں سارا دن دھما چوکڑی مچی رہتی۔ اس چہل پہل میں دن رات ایسے گزرتے جیسے ان کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔

لیکن اس کوارٹر نے بھی گردش دوراں کا ازلی ابدی چکر دیکھا، حامد کے سہرے بندھے، ارشد اور راشدہ بھی آئے ایک ہنگامہ برپا ہوا، اور چند دنوں کے بعد یہ کوارٹر بھی زندگی کا جوار بھاٹا دیکھ کر خالی ہو گیا

حامد اپنی دلہن کو لے کر کسی دور کی چھاؤنی میں زندگی کا آغاز کرنے کے لئے چلا گیا۔ راشد اپنے بیوی بچوں کو کراچی لے گیا اور راشدہ سسرال میں۔

کوارٹر سائیں سائیں کرنے لگا۔ تو بابو رشید آنسوؤں کو نہ روک سکے۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

دھیاں جوائی لے گئے اور نوئیں لے گئیں پوت

تم منوہر جانگلی رہ گئے اوت کے اوت

اور اس رات دونوں میاں بیوی اکیلے رہ کر پھر ایک دوسرے کی ذات میں گرمئ محبت کی جان بخش اداؤں کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی۔ لیکن تنہائی کا بھوت اپنے سرد سایوں کے ساتھ فضاؤں میں چھایا رہا،

بیگم رشید پر دل کے دورے پڑنے لگے۔

بابو رشید نے سوچا آخری منزل پر دوراہی کہیں بچھڑ نہ جائیں!

اور ایک شام بیگم رشید کی بجھتی ہوئی شمع زندگی نے آخری سنبھالا لیا۔ اور بابو رشید نے گلاس میں دوا ڈالی، لیکن پیشتر اس کے کہ بیگم کے ہونٹوں سے لگائیں، شعلہ بجھ گیا۔

بابو رشید اس خلا میں گم ہو گئے جہاں زندگی اور موت کے سایے ایک دوسرے کے ساتھ الجھ جاتے ہیں۔

مرنے والی کی آنکھوں کا کرب آخر میں ان کے اپنے حواسوں پر اتر آیا تھا۔ ان کی آنکھیں پتھرا گئیں، وہ یقین اور بے یقینی کے اس سنگم میں پر آ کر رک گئیں۔ جہاں نہ شام کا دھندلکا ہوتا ہے۔ نہ شفق کی سرخیاں، نہ دن کا اجالا، نہ شب دیجور کی سیاہیاں۔

نہ جانے کب اس حالت میں رہتے، اگر ان کے ایک دوست دروازے پر آ کر دستک نہ دیتے۔ یہ کبھی کبھار گپیں ہانکنے کے لئے رات کو ان کے پاس آ جایا کرتے تھے۔ بابو رشید کچھ دیر مرنے والی کی پٹی کے ساتھ لگ کر دوائی کا گلاس لیے بیٹھے رہے۔ پھر ہلکی سی دستک کی آواز ان کے سر پر توپ کے گولے کی طرح پھٹی۔ اور انہوں نے چیخ کر کہا کون ہے۔ اور پھر وہ دوڑتے دوڑتے دروازے تک پہنچے، دیوانے کے سے جوش کے ساتھ دوست کی کلائی پکڑ کر بیوی کے کمرے میں لے آئے۔ ان کے دوست نے کہا بابو رشید صاحب کیا کرتے ہیں آؤ چلیں بیٹھک میں

بیٹھیں۔

نہیں ادھر آؤ، دیکھوتو یہ کون ہے۔

دوست نے بابو کو دیوانہ سمجھا اور خائف ہو کر بھاگ جانا چاہا، پھر کچھ سوچ کر رک گیا، اور پوچھا کیا بیگم بیمار ہیں؟ میں کسی ڈاکٹر کو بلا لاؤں۔ اور دوسرے لمحے موت کا سایہ گہرا ہوا تو دوست نے لرز کر کہا،...... مجھے اپنے لواحقین کا پتا دو میں ان کو تار دوں۔ بابو رشید نے یہ الفاظ سنے اور پھر جیب سے ڈائری نکالی اور اس کے ہاتھ میں تھما دی،

بابو رشید اس کواٹر کی تنہائیاں برداشت نہ کر سکے، اور انہوں نے درخواست دے کر اپنا تبادلہ اسی شہر میں کروالیا، جہاں سے زندگی کا کارواں روانہ ہوا تھا۔

جانے والے ہیڈ کلرک نے کہا بابو رشید میرا تبادلہ برا بے موقع ہوا ہے۔ بچوں کے امتحان سر پر ہیں۔ اگر اجازت دیں تو بچے ایک دو ماہ اس کواٹر میں رہ لیں۔

بڑی خوشی سے میں دفتر کے کسی کمرے میں گزارا کرلوں گا۔ نہیں ایک چھوٹا کواٹر ابھی خالی ہوا ہے۔

کوئی مضائقہ نہیں وہی سہی۔ مجھے تو سر چھپانے کے لئے ایک چھت کی ضرورت ہے۔

چارج لے چکنے کے بعد شام کے وقت انہوں نے دفتر کے چپڑاسی کو ساتھ لیا۔ اور مزدوروں کے سر پر سامان رکھ کر وہ کواٹر کی طرف آئے۔ وہی جانی پہچانی گلیاں۔ ایک کواٹر کے سامنے رک کر چپڑاسی نے کہا۔ صاحب یہ رہا آپ کا کواٹر۔ اور بابو رشید سر سے لے کر پاؤں تک کانپ گئے۔

یہ کواٹر نہیں...... اس میں میری زندگی کا آغاز ہوا تھا، انہوں نے زیر لب کہا۔ لیکن کچھ دیر بعد انہوں نے اپنے جذبات پر قابو پالیا۔ کواٹر کے اندر قدم رکھا تو گویا دیواروں نے بڑی غم زدہ مسکراہٹ کے ساتھ

ان کا استقبال کیا۔ چپڑ اسی نے ان کا سامان اندر رکھوالیا۔ چارپائی بچھا کر بستر لگادیا۔ بلب لگا کر بٹن دبایا اور چلا گیا، کمرے کا کونہ کونہ منور ہو گیا۔ اور بابو رشید کا نہاں خانہ دل بھی جگمگا اٹھا۔ ماضی کا ایک ایک نقش اچانک زندہ ہوا، دیواروں سے قہقہے ابلے۔ بیگم رشید مسکرا کر جاگیں۔ اور جاگ کر چودھویں کا چاند بن گئیں۔ وہی زندہ تابندہ آنکھیں جو زندگی کا رس پی کر ضیاپاش ہوگئی تھیں۔ خاموش فضا کے خوابیدہ تار جھنجھائے۔ راشد اور راشدہ کے چہچہے نغموں کی طرح ابھر کر تھرتھرائے۔ کوارٹر کی مردہ دیواروں نے گیت گائے۔ وہی زندگی مر کر بھی زندہ ہو جاتی ہے۔

راشد نے کہا واہ۔ واہ، ابا جان آئے ہیں۔ آج ساری مٹھائیاں میں ہی کھا جاؤں گا۔ راشدہ کو ایک ٹکڑا بھی نہیں دوں گا۔ اوں...... اوں...... راشدہ نے ٹھنک کر کہا۔ ابا تو میرے ہیں۔ ابا راشدہ نے مجھے مارا تھا۔ اسے ایک ٹکڑا بھی نہ دینا۔ بیگم رشید نے کہا کیا شور مچا رکھا ہے تمہارے ابا تھکے ہوئے آئے ہیں۔

انہیں دو لمحے آرام تو کرنے دو۔

اور بابو رشید نے کہا نہیں بیگم ٹوٹے ہوئے خواب پھر سے نہ جڑنے دو، راشد چلے جاؤ۔ راشدہ میرے نزدیک مت آؤ۔ میں اس خوشی کو برداشت نہیں کرسکوں گا۔ اور انہوں نے بجلی بجھادی اور لحاف میں منہ چھپالیا۔

میں اتنی بڑی خوشی برداشت نہیں کرسکتا۔

بابو رشید صبح اٹھے تو بڑے مضمحل سے تھے۔ انہوں نے وضو کیا، نماز پڑھی۔ قران پاک کے ایک پارے کی تلاوت کی، پھر مصلے لپیٹ کر سٹو روشن کیا۔ چائے کی دو پیالیاں بنائیں۔ اور صبح کے سورج کی پہلی کرن نے مسکرا کر ان کے صحن مین قدم رکھا۔ انہون نے کرن کے تھرکتے ہوئے حسن کو دیکھا، تو کہا دنیا کی ہر چیز زندہ ہو جاتی ہے۔ انسان مرجائے تو دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا۔

کیوں نہیں، کل رات ماضی کا ہر نقش مسکرا کر زندہ نہیں ہوا تھا۔

یکا یک دروازے پر دستک ہوئی۔

بابو رشید نے بڑھ کر دروازہ کھولا، تو دروازے میں ہاتھ میں جھاڑو لیے بھنگن کھڑی تھی، بھنگن نے حیران ہو کر انہیں دیکھا، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے پوچھا، بابو یہ لوگ۔

کون یہ لوگ چلے گئے ہیں۔ یہ کوارٹر مجھے مل چکا ہے۔ لوگ چل بسے جاتے ہیں اور مجھے پتا بھی نہیں چلتا۔

بابو تم اکیلے ہو

ہاں جمعدارنی۔

بابو! چنبیلی نے سنجیدہ ہو کر کہا، لوگ مجھے چنبیلی کہتے ہیں۔

چنبیلی بابو رشید نے چیخ کر کہا ''تمہارا نام چنبیلی ہے۔ جی ہاں، اس نے حیران ہو کر کہا ''چنبیلی تم نے مجھے پہچانا''

نہیں، چنبیلی نے ذرا قریب آ کر بابو کے چہرے پر نظریں جما دیں۔

اوہ..... آپ پر بابو، بی بی کہاں ہے۔ چنبیلی نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

بی بی، بابو نے تلخ ہنسی کے ساتھ کہا۔

بی بی، چنبیلی نے پھر پوچھا؟

''بی بی اپنی آخری منزل پر پہنچ گئیں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں،

تو بی بی تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں۔ بابو رشید، انہوں نے اچھا نہ کیا۔ پر بابو دنیا کی یہی ریت ہے۔ وہ بھی تو چلا گیا۔

کان بابو نے کانپ کر پوچھا؟

وہی، چنبیلی نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

میں سمجھ گیا۔ بابو رشید نے خلاؤں مین گھورتے ہوئے کہا۔

ساری عمر اس نے مجھے کانٹوں کی سیج پر رکھا۔ وہ نشہ کرے تھا اور مجھے روج پیٹے تھا،

پر جب وہ اٹھا تو دنیا میری آنکھوں مین اندھیر ہو گئی۔

ایسا ہی ہوتا ہے بابو نے بڑے درد سے کہا۔

چنبیلی نے جھاڑو زمین پر رکھا، پھر گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر زمین پر بیٹھ گئی۔اس ک تچہرے کی جھریوں پر پچاس سال کی تھکن نمودار ہوئی۔اور اس کی کیچ بھری آنکھوں میں کرب و اذیت کا اندھیرا چھا گیا۔چند لمحوں تک بابو چنبیلی کو دیکھتے رہے لیکن وہ منظر زندہ نہ ہوا۔جب انہون نے چنبیلی کو پہلی بار دیکھا تھا۔پھر نور کا ایک کھٹکا ہوا اور گردش ایام دوڑ کر پیچھے چلے گئے۔پردے ہٹے اور بابو نے اپنی جوانی کی اس چنبیلی کو دیکھ لیا۔جس کی آنکھیں آنسوؤں سے دھل کر چنبیلی کا پھول بن گئی تھیں۔تصویر کا جو نقش جدا ہو گیا تھا۔پھر تصویر پر ثبت ہو گیا۔

بابو نے چنبیلی کا ہاتھ چھو کر کہا ''چنبیلی بابو کی اس بات کو نہ سمجھ سکی۔اس نے زمین پر نظر گاڑھ کر کہا، بابو اس نے مجھے سکھ نہ دیا۔پر جب وہ آنکھ سے اوجھل ہوا تو میں نے سمجھا۔میں نے سب سکھ کھو دیا۔پوت بہو لے کر چلا گیا۔اور دھی اپنے خصم کے ساتھ تھی۔میں گھر میں اکیلی تھی، جب اس نے دم توڑا۔

اور چنبیلی کی گدلی آنکھیں ایک ایک قطرے سے تر ہوئیں، بابو رشید نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، لیکن اچانک اس کے سینے پر ایک بوجھ آن پڑا۔ایک غبار چھایا، ایک بادل گہرا ہوا، اور مدتوں سے رکے ہوئے آنسو ان چشموں کی طرح بند توڑ کر نکل آئے۔جو پتھریلی زمین کے سینے کے نرم ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ دونوں دیر تک چپکے چپکے روتے رہے۔دونوں کا درد بجلی کی رو کی مانند ایک سینے سے دوسرے سینے میں منتقل ہوتا رہا۔اور پھر بابو رشید اٹھ کر کمرے کے اندر چلے گئے۔ انہوں نے رومال آنکھوں سے لگا لیا۔چنبیلی نے جھاڑو ہاتھ میں لیا اور اسے فرش پر گھسیٹنے لگی۔بابو رشید نے ماضی کے ایک ایک نقوش کو ایک لمحے کے لیئے ابھرتے دیکھا۔اور ماضی کے موقلم کی چند جنبشوں میں تصویر مکمل ہو گئی۔اور وہ سکون جو مدت

سے غائب تھا ایک دم پلٹ آیا۔

انھوں نے تر رومال کو آنکھوں سے ہٹا لیا۔ اور باہر نکل آئے۔ صحن میں صبح کی نرم دھوپ چنبیلی کے تازہ پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ اور چنبیلی کی آنکھوں کے پھول ڈھل کر اجلے جامے پہن چکے تھے۔

IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

لوہے کا کمر بند

افسانہ نگار : رام لعل

بہت عرصہ گزرا کسی ملک میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اتنی خوبصورت کہ اس کی محض ایک جھلک دیکھنے کے لئے عاشق مزاج لوگ اسکی گلی کے چکر لگایا کرتے تھے۔ یہ بات سوداگر کو بھی معلوم تھی۔ اس لئے اس نے اپنی بیوی پر سخت پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ اس کی اجازت کے بغیر وہ کسی سے مل نہیں سکتی تھی۔

اس کے قریب قریب تمام ملازم دراصل اس سوداگر کے خفیہ جاسوس تھے۔ جو اس کی بیوی کی حرکتوں پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ سوداگر کو کبھی کبھی دو، دو تین، تین سال کے لئے دور دور کے ممالک میں کاروبار کے لئے جانا پڑتا۔ کیونکہ سفر میں کئی سمندر بھی حائل ہوتے، جنہیں عبور کرتے وقت کئی بار بحری قزاقوں سے بھی واسطہ پڑ جاتا۔

ایک بار وہ ایک ایسی ہی تجارتی مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔ گھر چھوڑنے سے پہلے ایک رات وہ اپنی بیوی کی خواب گاہ میں آیا تو اس سے بولا،

جانِ من! تم سے جدا ہونے سے پہلے میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے یہ تحفہ تمہیں ہمیشہ میری یاد دلاتا رہے گا۔ کیونکہ یہ تمہارے جسم کے ساتھ ہمیشہ چپکا رہے گا۔

یہ کہہ کر سوداگر نے اپنی بیوی کے چاندی جیسے بدن پر کمر کے نچلے حصے کے

ساتھ ایک کمربند جوڑ دیا۔ اور کمربند میں ایک تالا بھی لگا دیا۔ پھر تالے کی چابی اپنے گلے میں لٹکاتا ہوا بولا۔

یہ چابی ہر وقت میرے سینے پر لٹکی رہے گی۔ اس کی وجہ سے میں بھی تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔

سوداگر کی بیوی نے کمربند کو غور سے دیکھا، تو سمجھ گئی کہ یہ دراصل اسے بدکاری سے باز رکھنے کی خاطر پہنایا گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور بولی،

آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں ہے نا! ۔ اسی لئے آپ نے ایسا کیا ہے۔ لیکن میں تو آپ سے بہت محبت کرتی ہوں۔ کبھی آپ کو شکایت کا موقع ملا۔

سوداگر نے جواب دیا۔

میرے دل میں تمہاری طرف سے کوئی شبہ نہیں۔ لیکن چونکہ زمانہ بہت خراب ہے۔ اور میں مردوں کی ذات سے بخوبی واقف ہوں۔ وہ ہمیشہ کمزور اور بے سہارا عورتوں کی تاک میں رہتے ہیں۔

اسی خیال سے میں نے تمہیں محفوظ کر دیا ہے۔ اب کوئی تمہاری عصمت نہیں لوٹ سکے گا۔

یہ کہہ کر سوداگر تو اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔ لیکن اسکی بیوی لوہے کے کمربند کی وجہ سے سخت پریشانی محسوس کرنے لگی۔ یہ تکلیف جسمانی کم تھی ذہنی زیادہ۔

کمربند کی وجہ سے وہ خود کو ایک قیدی سمجھنے لگی، اٹھتے بیٹھتے اسے کمر کے گرد کسے ہوئے لوہے کے کمربند کا شدید احساس تھا۔ اس کمربند کی وجہ سے اسے دوسرے مردوں کا زیادہ خیال آنے لگا۔ جن سے بچانے کے لئے اس کے شوہر نے یہ انوکھا طریقہ اختیار کیا تھا۔ وہ اس کی غلام تو نہ تھی۔ لیکن اسکی زندگی غلاموں سے بدتر تھی۔ اور

یہ سب اس کے بے پناہ حسن کی وجہ سے ہوا تھا۔

وہ اتنی حسین نہ ہوتی تو اس کے ساتھ ہرگز اتنا ظالمانہ سلوک نہ کیا جاتا۔ اپنے شوہر کے ظلم کو یاد کر کے اور آئینے میں اپنے حسن کو دیکھ کر وہ دکھی ہو جاتی۔ اور کبھی رونے بھی لگتی، لیکن وہ کر ہی کیا سکتی تھی۔ اب تو وہ ہر طرح سے بے بس تھی۔ بند کھڑکیوں اور دروازوں کے باہر اسے کئی مردوں کی سیٹیاں سنائی دیتی تھیں۔ بعض لوگ تو اس کا نام پکارتے ہوئے یا شعر پڑھتے ہوئے گلی سے گزرتے۔ یہ شعر اس کے بے پناہ حسن کی تعریف میں یا خود ان کی اپنی اندرونی کیفیتوں کے غماز ہوتے۔

لیکن وہ کبھی دروازہ یا کھڑکی کھول کر باہر نہیں جھانکتی تھی، کیونکہ وہ اپنے شوہر سے بہت محبت کرتی تھی، اس کے ملازم اس قسم کی آواز سن کر ہمیشہ چوکنے ہو جاتے۔ اور وہ اپنے دل میں کبھی کبھی پیدا ہو جانے والی اس خواہش کو بڑی سختی سے دبا لیتی۔ کہ وہ کسی روز کھڑکی کو ذرا سا کھول کر اپنے عاشقوں کی شکل ہی دیکھ لے۔

لیکن کبھی کبھی اس کے ذہن میں یہ خیال بھی آتا،

کہ اس کے عاشقوں میں ایک بھی ایسا بہادر آدمی نہیں، جو مکان کی اونچی دیوار پھاند کر اسے اغوا کر کے لے جائے۔

رفتہ رفتہ اغوا کیے جانے کے تصور محض سے ہی اسے تسکین ملنے لگتی، اسے لگتا کہ وہ ایک اجنبی مرد کے آگے گھوڑے پر سوار ہے۔ وہ گھوڑے کو سرپٹ بھگائے لیے جا رہا ہے۔ اور اسے گھر سے کوسوں دور ایک گھنے جنگل میں لے جاتا۔ جہاں سے اسے کوئی بھی واپس نہیں لے جا سکے گا۔ اب وہ اپنے شکی مزاج شوہر کی قید سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو چکی تھی۔ لیکن جب وہ اپنے اجنبی عاشق کے ساتھ جسمانی تعلق کی بات سوچنے بیٹھتی، تو اس کے آنسو نکل پڑتے۔ کمر میں لوہے کی کمر بند کی وجہ سے وہ کسی بھی مرد کے کسی کام کی نہ رہی تھی، جب تک اس کمر بند کو کھول نہ دیا جائے۔ لیکن اس کی چابی تو اس کے شوہر کے پاس تھی۔

ایک مرتبہ سوداگر کی بیوی کے کانوں میں ایک مغنی کے گانے کی آواز آئی، جسے

سنتے ہی وہ مضطرب ہو گئی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے اپنے قیمتی زیورات اپنے نوکروں کو انعام کے طور پر دے دیئے، اور ان سے کہا

اس مغنی کو تھوڑی دیر کے لئے میرے پاس لے آؤ۔ اس کا گانا سنوں گی۔ اس کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ جس نے میرے دل میں میرے پیارے شوہر کی یاد تازہ کر دی ہے۔ جو ایک مدت سے مجھ سے ہزاروں کوسوں دور پردیس میں ہے۔ اور میں اس کے فراق میں دن رات تڑپا کرتی ہوں۔

ملازم فوراً اس مغنی کو بلا کر لے آئے، وہ اس علاقے کا مشہور و معروف مغنی تھا۔ لوگ اس کی آواز سن کر وجد میں آ جاتے تھے، وہ مردانہ حسن و شکوہ کا ایک بے مثال نمونہ تھا، اونچا قد، مضبوط جسم، لمبے لمبے بازو، سانولا رنگ، اور لہراتے ہوئے گھنگھریالے بال۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی کشش تھی۔

اور محبت کی ایک عجیب سی شدت بھی۔ اس نے بھی سوداگر کی بیوی کے حسن کے چرچے سن رکھے تھے۔ اور غائبانہ طور پر اس سے محبت بھی کرنے لگا تھا۔ اب جب وہ اس حسینہ کے سامنے اچانک پہنچا دیا گیا، تو متعجب سا رہ گیا۔ پہلے تو اسے اعتبار ہی نہ رہا، کہ یہ حقیقت ہو سکتی ہے۔ اس لئے اس نے اپنی آنکھیں بار بار ملیں۔ لیکن جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنے دل کی ملکہ کی حضور کھڑا ہے۔ تو پہلے وہ دل ہی دل میں اپنی خوش نصیبی پر مالک دو جہاں کا شکر بجا لایا۔ پھر سر جھکا کر بولا۔

اے حسینہ عالم میں آپ کی کون سی خدمت سرانجام دے سکتا ہوں۔

سوداگر کی بیوی مغنی کے مردانہ حسن پر پہلی ہی نظر میں فریفتہ ہو گئی۔ لیکن اپنے ملازمین کی موجودگی میں اس نے اپنی کیفیت کا اظہار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا۔

نامور مغنی میں اپنے شوہر کی جدائی میں تڑپ رہی ہوں، جس کے لوٹنے کی ابھی تین سال تک توقع نہیں ہے۔ تم مجھے کوئی ایسی غزل سناؤ۔ جس سے میرے دل

کوراحت نصیب ہو۔ مجھے یقین ہے، تمہاری پر سوز آواز میرے زخم دل پر مرہم کا کام کرے گی۔

یہ کہتے کہتے وہ مغنی کی آنکھوں میں ڈوب سی گئی۔ لیکن پھر فوراً سنبھل سی گئی۔ مغنی اس کی حقیقی کیفیت کچھ کچھ بھانپ گیا، سوچنے لگا کہ کہیں وہ اس کی محبت میں گرفتار تو نہیں۔؟ ممکن ہے وہ اپنے ملازموں کی موجودگی میں اس کا اظہار نہیں کر سکتی ہو! بہر حال اس کی خواہش کے احترام کے لئے اس نے باہر کھڑے ہوئے اپنے رفیقوں کو بھی اندر بلا لیا۔ ساز بجنے لگے۔ ڈھول پر تھاپ پڑنے لگی۔ اور سوداگر کی عالی شان عمارت اس کی پر سوز آواز سے گونجنے لگی،

مغنی نے اس کے سامنے اپنے ایک پسندیدہ شاعر کی ایک منتخب غزل چھیڑ دی۔ جس کے ذریعے وہ اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار بھی کر سکتا تھا۔

زمیں والوں پہ یہ مشق ستم اس آسماں کب تک
بہت نازاں ہے جس پہ تو وہ دور کامراں کب تک
کہاں تک باغباں کا ناز اٹھائیں گے چمن والے
رہے گا گلشن امید بر باد خزاں کب تک

اس کی آواز میں ایک عجیب سا جادو تھا۔ جس کا اسے خود بھی احساس تھا، آج تک جہاں بھی اس نے اپنی آواز کا جادو جگایا تھا، وہ ہمیشہ کامیاب و کامران رہا تھا۔ اب تو اس نے اپنی آواز میں ایک نیا ہی جذبہ شامل کر لیا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا۔ یہاں بھی وہ کامیاب رہے گا۔ یہ حسینہ اپنا دل ہار کر اس کے قدموں میں رکھنے پر ضرور مجبور ہو جائے گی۔ جب وہ اشعار گا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں شدت جذبات سے لال ہو گئی تھیں۔ ادھر سوداگر کی بیوی کی آنکھیں بھی بار بار نم ناک ہو جاتیں۔ لیکن دیکھنے والے یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے شوہر کی یاد میں آنسو بہا رہی ہے۔

جب مغنی نے اگلا شعر پڑھا تو سوداگر کی بیوی کی کیفیت اور بھی غیر ہونے لگی۔

بجھانے سے کہیں بجھنے کی ہے یہ آتش الفت

ارے او دیدہ گریاں یہ سعی رائیگاں کب تک

مغنی نے پہلے مصرعے کو اتنی مرتبہ دہرایا۔اس قدر مستی سے دہرایا کہ ہر مرتبہ اس سے ایک نیا ہی تاثر ابھرتا چلا گیا۔ملازموں کو اب یہ خدشہ ستانے لگا کہ ان کی مالکن کہیں بے ہوش نہ ہو جائے۔اس لئے انہوں نے مغنی کو خاموش ہو کر چلے جانے کا اشارہ کر دیا۔لیکن سوداگر کی بیوی نے مغنی کو جانے سے روک لیا اور بولی۔میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

مغنی نے اپنے سارے ساتھیوں کو واپس بھیج دیا۔اور خود سوداگر کی بیوی کے قدموں میں جھک کر بیٹھ گیا۔اور بولا۔

"فرمائیے میں حاضر خدمت ہوں"

سوداگر کی بیوی کی آنکھیں ابھی تک آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔وہ خاصی دیر تک تو کچھ نہ کہہ سکی۔آخر تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

تمہاری آواز میں اس قدر سوز کیوں ہے...... کیا تم کسی سے محبت کرتے ہو؟

مغنی نے جواب دیا۔

میرے سر سے میرے والدین کا سایہ بچپن سے اٹھ گیا تھا، میں بہت چھوٹی عمر سے جگہ جگہ گھوم رہا ہوں۔موسیقی سے مجھے خاص رغبت ہے۔اسی میں مجھے خاصی تسکین ملتی ہے۔اب سے پہلے میں نے کسی سے محبت کی ہے یا نہیں۔اس کے متعلق میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔میں نے بے شمار عورتیں دیکھی ہیں، حسین سے حسین ترین عورتیں۔

بادشاہوں، امیروں اور سرداروں کی محفلوں میں ہمیشہ شریک ہوتا رہا ہوں۔ وہاں عورتوں کی کمی نہیں رہی۔لیکن میں سچے دل سے اس بات کا اقرار کرسکتا ہوں کہ

حقیقی محبت کا آغاز مجھے آپ کا غائبانہ ذکر سن سن کر ہی ہونے لگا تھا۔ آج تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ......

اس سے آگے سوداگر کی بیوی نے اسے بولنے نہ دیا، اور کہا۔ بس، بس میں سمجھ گئی۔ لیکن آئندہ ایسی بات زبان پر مت لانا۔ سمجھ لو میں اپنے شوہر کی پاک دامن بیوی ہوں۔ اس کے علاوہ میں کسی بھی دوسرے کا خیال دل میں نہیں لا سکتی۔ لیکن تمہارے جذبات کی میں اس حد تک قدر ضرور کروں گی۔ کہ تم کبھی کبھی یہاں آ کر مجھے اپنا گیت سنا جایا کرو۔ کیونکہ اس سے تمہارے جذبات کو تسکین حاصل ہو گی۔ ایسی تسکین یقیناً مجھے بھی حاصل ہو گی، کیونکہ تمہارے گانے کی وجہ سے میرے دل میں میرے شوہر کی یاد تازہ رہے گی۔

جب میرا شوہر واپس آجائے گا۔ اور اسے یہ معلوم ہو گا، کہ اس کی غیر حاضری میں تم نے اپنی موسیقی سے میرے دل میں اس کی محبت کو ہمیشہ جگائے رکھا۔ تو وہ بہت خوش ہو گا۔ اور ممکن ہے تمہیں انعام و کرام بھی دے۔

سوداگر کے ملازم جو پردے کے پیچھے سے ان کی باتیں سن رہے تھے۔ اب پوری طرح مطمئن ہو گئے۔ کہ ان کی مالکن اپنے شوہر کی محبت میں پوری طرح سرشار ہے۔ اس سے بے وفائی کی توقع رکھنا اب بے کار ہو گا۔ چنانچہ جب مغنی نے سوداگر کی بیوی کی پیش کش قبول کر لی۔ تو پھر اسکے آنے جانے پر بالکل پابندی نہ لگائی گئی۔ مغی قریب قریب روز ہی آنے لگا۔ اب وہ بڑی آزادی سے سوداگر کی بیوی سے تنہائی میں بھی مل لیتا۔ انہیں اس طرح ایک دوسرے سے ملتے ہوئے ایک سال کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن دونوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو نہیں چھوا تھا۔

مغنی اس غم میں دن بدن کمزور ہوتا گیا۔ اس کے چہرے کی تازگی رخصت ہونے لگی، لگتا تھا اسے رات کو کبھی نیند نہیں آتی تھی۔

سوداگر کی بیوی یہ دیکھ کر فکر مند بھی رہتی تھی۔ لیکن وہ مغنی کو ابھی تک اپنے

سامنے صاف صاف محبت کرنے کی اجازت نہ دے سکی تھی۔ وہ جانتی تھی آگے بڑھنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔ جب مغنی کو یہ معلوم ہو جائے گا، کہ اس کے جسم پر پہنے ہوئے بھاری لبادے کے نیچے، اس کی کمر کے نچلے حصے پر لوہے کا مضبوط کمر بند لگا ہوا ہے۔ تو وہ کتنا مایوس ہوگا۔ اس کے لئے یہ صدمہ نا قابل برداشت ہو جائے۔ ہوسکتا ہے وہ خودکشی کرلے۔

اس لئے وہ ابھی تک اسے اپنے جسم سے دوری رکھتی چلی آرہی تھی۔

ایک دن جب مغنی اس کے ساتھ تنہا بیٹھا تھا۔ اور اس کے سامنے اپنے عشق کا اظہار کر رہا تھا۔ تو اچانک جذبات کے ہاتھوں بے قابو ہوگیا۔ اور اس کے قدموں سے لپٹ کر زار زار رونے لگا۔

اب میرے لئے زندہ رہنا ناممکن ہوگیا ہے۔ میں آپ کو اس قید خانے سے لے جانے کے لئے تیار ہوں۔ بس آپ کے اشارے کی دیر ہے۔ اگر آپ نے انکار کیا تو ہوسکتا ہے کہ میں زبردستی بھی اٹھا لے جانے کی گستاخی کر بیٹھوں۔

اغوا کیے جانے کا سن کر سوداگر کی بیوی اپنے حسین ترین خوابوں میں کھوگئی۔ اس قسم کے خواب اس نے کئی مرتبہ سوتے جاگتے دیکھے تھے۔

مغنی کو جب اپنی درخواست کا کوئی جواب نہ ملا تو وہ اور بھی غمگین ہوگیا۔ بے خود سا ہو کر ایک نئی غزل گانے پر مجبور ہوگیا۔

اب سحر کا نہ انتظار کرو
دامن شب کو تار تار کرو
زندگی رنج و غم کا نام سہی
مل گئی ہے تو اس سے پیار کرو

موسیقی بڑے بڑوں کی کمزوری ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو یہ اچانک ایسا سیلاب بن جاتی ہے۔ مغنی اب سمجھ گیا کہ وہ اپنی محبوبہ کو اپنے فن سے ہی شکست دے سکتا ہے۔

اس لئے اس نے پوری طرح اپنے اندر ڈوب کر ایک لے نکالی،

ہم سے خوئے وفا نہ چھوٹے گی
تم کوئی جبر اختیار کرو
اور چمکاؤ آئینہ رخ کا
زلف کو اور تابدار کرو

گاتے گاتے اسے کافی دیر ہوگئی۔ وہ بے حال ہوگیا۔

سوداگر کی بیوی کی بھی یہی حالت تھی، آخر اس نے مغنی کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ میں بھی تم سے محبت کرتی ہوں۔ زندگی بھر کرتی رہوں گی۔ تم نہیں جانتے، اس گھر کو چھوڑ کر بھی میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے نہیں کرسکتی۔ اس کے بعد اس نے مغنی کو لوہے کے کمر بند والی بات بتادی۔ جس کی چابی اس کا شوہر اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ یہ سن کر مغنی ہکا بکا سا رہ گیا۔ اسے یقین نہ آیا کہ جو کچھ اس کی محبوبہ نے کہا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ اس نے لباس کے اوپر سے نیچے کے کمر بند کو چھوا، تب ہی اسے یقین ہوسکا۔ کئی لمحوں تک وہ کھڑا سوچتا رہا۔ اس کے چہرے پر کئی لہریں آئیں اور گئیں۔ آخر اس نے زبان کھولی۔

میں اس کمر بند کو کاٹ کر پھینک دوں گا۔ ابھی بازار جا کر اتنے تیز اوزار لے کر آتا ہوں۔ جو پلک جھپکنے میں اس غیر انسانی کمر بند کو کاٹ دیں گے۔ یہ سن کر سوداگر کی بیوی کو غصہ آگیا، بولی۔

یہ کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ کیا تمہارے خیال میں جب تم لوہے کے کمر بند کو کاٹ رہے ہوگے تو میں تمہارے سامنے کپڑے اتار کر ننگی کھڑی رہوں گی۔

مغنی نے اپنی غلطی کے لئے فوراً معذرت چاہی، لیکن ساتھ ہی اس نے ایک اور تجویز پیش کردی،

یہ کام میں اپنے ایک لوہار دوست کے بھی سپرد کرسکتا ہوں، میں اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دوں گا۔ تاکہ وہ تمہاری حسین کمر پر نگاہ نہ ڈال سکے۔ لیکن وہ اپنے کام میں اتنا ماہر ہے کہ وہ آنکھیں بندھ ہونے پر بھی یہ کام انجام دے لے گا۔

سوداگر کی بیوی نے یہ بات بھی منظور نہ کی اور کہا، جاؤ، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

مغنی کو وہاں سے جاتے جاتے ایک اور بات کا خیال آیا۔ چنانچہ اس نے پلٹ کر کہا۔

حسین عورتوں کا سب سے بڑا دشمن ان کا موٹاپا ہوتا ہے۔ اگر آپ اپنا وزن کم کرنا شروع کردیں، تو آپ کے جسم کی کشش بھی برقرار رہے گی، اور اس کمر بند سے بھی نجات حاصل ہوجائے گی۔

سوداگر کی بیوی اچھی اچھی غذاؤں کی بڑی دلدادہ تھی، اس قسم کی تجویز کو وہ کسی صورت قبول نہیں کرسکتی تھی۔ چمک کر بولی، اس کا مطلب ہے۔ تمہاری خاطر میں اپنے آپ کو بھوکا ماردوں۔

کھانا پینا چھوڑ دوں،

لیکن بھوکا پیاسا رہنے سے بیمار ہوجانے کا خطرہ بھی تو ہوسکتا ہے۔

پھر بھلا تم میری طرف ایک نظر اٹھا کر بھی کیوں دیکھو گے۔ جاؤ، جاؤ تمہاری ایک بھی تجویز معقول نہیں ہے۔

مغنی کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ بہت افسردہ ہوکر اب وہ وہاں سے جانے والا تھا، پلٹ کر پھر آیا اور بولا۔

خدا کے لئے میری ایک تجویز پر ضرور غور فرمالیجئے۔ کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دے سکتی ہیں۔ کہ میں آپ کے سامنے مسلسل کئی روز تک گاتا رہوں؟، مجھے یقین ہے کہ میں اپنی موسیقی کی بدولت آپ کے جسم میں ایک ایسی سنسنی پیدا کردینے

میں کام یاب ہو جاؤں گا۔ جس سے آپ کا کمر بند خود بخود کمر سے نیچے پھسل جائے گا۔ انتہائی ہیجان کے کسی بھی لمحے میں ایسا ہو جانا ممکن ہے۔ آپ کو پتا بھی اس وقت لگے گا، جب کمر بند پھسل کر آپ کے قدموں میں آ گرے گا۔

سوداگر کی بیوی نے اس کی نئی تجویز کو بھی ہنسی میں اڑا دیا۔

کہنے لگی تم پہلے بھی کئی بار گانا سنا چکے ہو؟

کبھی ایسا ہو سکا، میں جانتی ہوں تم مجھے صرف افسردہ بنا سکتے ہو۔ کسی اور بات میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اب وہ وہاں سے بالکل ہی مایوس ہو کر چل دیا۔ پھر کئی مہینوں تک پلٹ کر سوداگر کی بیوی کو اپنی صورت نہ دکھائی۔ لیکن سوداگر کی بیوی کو اپنے ملازموں سے اس کے بارے میں خبریں ملتی رہیں۔ کہ وہ گلی کوچوں میں مارا مارا پھرتا رہتا ہے۔ اب اسے اپنے تن بدن کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ کسی کی فرمائش پر گانا بھی نہیں گاتا۔ بس خاموش پڑا رہتا ہے۔

لوگوں میں یہ بھی مشہور ہو گیا ہے کہ وہ سوداگر کی بیوی کے عشق میں مبتلا ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب وہ بالکل پاگل ہو جائے گا۔ آخری خبر سوداگر کی بیوی کے لئے کافی پریشان کن تھی۔ کیونکہ اس سے اس کی بدنامی ہو رہی تھی۔

لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی اس کی محبت میں گرفتار ہونے لگی۔ اسے احساس ہونے لگا کہ محبت کے میدان میں مغنی زیادہ ثابت قدم نکلا۔ اور وہی اس سے سچا عشق کر رہا ہے، اگر مر گیا تو لوگ ہمیشہ اس کے چرچے کیا کریں گے۔ لیکن اسے کبھی اچھے نام سے یاد نہیں کیا جائے گا، کیونکہ مغنی کی موت کا سبب وہی بنے گی۔ اس معاملے مین تھوڑی سی قربانی وہ بھی دے سکے تو اس کا نام بھی امر ہو سکتا ہے۔ یہ سوچ کر سوداگر کی بیوی نے فاقے کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ شروع شروع میں تو اس نے کھانے پینے کی مقدار میں کمی کی۔ پھر غذائیت سے بھرپور اور لذیذ چیزیں ترک کر دیں۔ جس سے وہ

جلد ہی پتلی ہوگئی، پرکشش ہوگئی۔ آئینے کے سامنے جا کر وہ اپنے آپ کو دیکھتی تو خوش سے پھولی نہ ساتی۔ کبھی کبھی اس کا جی وہ ساری میٹھی اورلذیذ چیزیں کھانے کو مچل اٹھتا۔۔ جو اسے ہمیشہ ہمیشہ مرغوب رہ چکی تھیں۔ وہ چیزیں اس کے خوابوں میں بھی آتی تھیں۔

ایک روز اچانک اچھے اچھے کھانوں کو یاد کر کے وہ رو پڑی۔ اس نے اسی دم اپنے محبوب کا خیال دل سے نکال پھینکا۔ اور اپنے ملازموں کو حکم دیا کہ وہ اس کے سامنے بہترین قسم کے سارے کھانے فوراً حاضر کریں۔ پہلے تو نوکر بہت حیران ہوئے، کیوں کہ اس نے ایک عرصے سے عمدہ قسم کے کھانوں کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ لیکن وہ فوراً ہی گھی، دودھ، شہد اور چینی سے بنائے ہوئے قسم قسم کے لذیذ ترین کھانے لے کر حاضر ہوگئے۔ جنھیں دیکھتے ہی وہ ان پر ٹوٹ سی پڑی۔ کھاتے ہوئے وہ دل میں یہ عہد بھی کرتی گئی کہ اب وہ کبھی بھوکا رہنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ زندگی کی بہترین مسرت ایسے ہی لذیذ کھانوں کے کھانے مین ہے۔

کچھ ہی دنوں میں اس کے جسم کی قوسیں پھر سے بھر گئیں۔ جن پر سے خوراک میں کمی کر دینے کی وجہ سے گوشت غائب ہونے لگ گیا تھا۔ اور وہ اس بات کی قائل ہوگئی کہ کسی سے عشق کرنے کے لئے بھوکا رہنا قطعاً ضروری نہیں ہے۔ مغنی بھی اب شہر چھور کر جا چکا تھا۔ معلوم نہیں وہ اب زندہ بھی تھا یا نہیں،

ایک روز اچانک وہی مغنی پھر اس کے دروازے پر حاضر ہوگیا۔ اس نے ملاقات کی اجازت چاہی۔ سوداگر کی بیوی نے اسے ایک مدت سے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے مغنی کو فوراً اندر بلوالیا۔ مغنی نے آتے ہی اس کے سامنے ایک نئی تجویز پیش کر دی۔

میں آپ کی خاطر دور دراز کے علاقوں میں بھٹکتا رہا۔ میں نے ایک ایسی جڑی بوٹی تلاش کرلی ہے۔ جس کے استعمال سے جسم کی فالتو چربی بھی کم ہوجاتی ہے۔ اور

انسان کو لذیذ کھانوں سے بھی محروم نہیں رہنا پڑتا۔

سوداگر کی بیوی اس وقت بڑے اچھے موڈ میں تھی وہ اس وقت شکر چڑھے باداموں کی ایک پلیٹ اپنے سامنے رکھے بیٹھی تھی، وہ ایک ایک بادام اٹھا کر منہ میں رکھتی۔ دانتوں کے درمیان آہستہ آہستہ پیستی۔ اور مسکراتی جاتی تھی۔

اچھا تو پھر تم نے وہ جڑی بوٹی حاصل کر لی؟

مغنی نے جواب دیا۔ اس کا صحیح پتا تو ایک جادوگرنی بڑھیا کو ہے۔ اس نے بے شمار امیر گھرانوں کی بہو بیٹیوں کو جو خوش خوراکی کی وجہ سے بہت فربہ ہو چکی تھی۔ ان کو دبلا اور دل کش بنا دیا ہے۔ اور ان کی صحت پر بھی برا اثر نہیں پڑا۔

یہ کہہ کر مغنی نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی، اور کہا۔ اسے آپ چند روز تک بلاناغہ کھائیے

کھانے پینے کا کوئی پرہیز نہیں ہے۔

سوداگر کی بیوی نے خوش ہو کر وہ ڈبیا لے لی اور تھوڑی سی دوا اس نے اسی وقت چاٹ لی۔

اس کے بعد وہ دن میں کئی مرتبہ اسے استعمال کرنے لگی۔ دوا نے واقعی ہی اپنا اثر دکھایا۔ وہ کچھ ہی روز میں دبلی ہو گئی۔ اس کے بدن مین جگہ جگہ بھرا ہوا پلپلہ گوشت غائب ہو گیا۔

ایک دن وہ مغنی کے ساتھ اپنے مکان کے پائیں باغ میں ٹہل رہی تھی، کہ اچانک اسکی کمر کے ساتھ چپکا ہوا لوہے کا کمر بند سرک کر نیچے گر پڑا۔ پاؤں کے پاس پڑے ہوئے کمر بند کو اس نے حیرت سے دیکھا، پھر مسرت کے ایک عجیب سے جوش میں مبتلا ہو کر اس نے کمر بند کو ایک زور سے ٹھوکر ماری، کمر بند ایک پیڑ کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اس نے خود کو مغنی کے حوالے کر دیا۔ لیکن اسی وقت کسی نے دروازے کی زنجیر کھٹ کھٹائی۔ اس کے ملازم کسی غیر ملکی شہری کی خبر لے کر آئے

تھے۔اس نے گھبرا کر اس آدمی کو بلوا بھیجا۔پردے کھینچ دیئے گئے۔اس نے پردے کے عقب سے اس غیر ملکی کو دیکھا جو اپنے ساتھ کئی صندوق بھی لایا تھا۔اس نے کہا یہ سارے صندوق ہیروں اور جواہرات سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہیں آپ کی خدمت میں پہنچا دینے کا حکم مجھے آپ کے شوہر نے ہی دیا تھا۔ان کا انتقال ہو چکا ہے۔انہیں ایک زہریلے سانپ نے ڈس لیا تھا۔آپ کا نام مرتے دم تک ان کی زبان پر رہا۔مرنے سے پہلے انہوں نے ایک اور چیز بھی آپ تک پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔یہ ایک چابی ہے۔

اس کے ساتھ ایک رقعہ بھی بندھا ہوا تھا، جس میں لکھا تھا۔

میری پیاری بیوی

اب تم آزاد ہو۔

خدا حافظ......

وہ چابی سینے سے لگا کر زور زور سے رونے لگی۔مغنی نے جو اس خبر سے بہت خوش تھا، اسے سمجھایا۔

اب تو آپ مکمل طور پر آزاد ہیں۔کوئی خطرہ نہیں رہ گیا، اب ہم شادی کر کے ہمیشہ ساتھ رہ سکتے ہیں۔

لیکن اسکی بات سن کر سوداگر کی بیوی کو اچانک غصہ آ گیا۔

چلا کر بولی۔

نکل جاؤ یہاں سے۔اب کبھی مت آنا۔ میں تمہاری صورت تک دیکھنا نہیں چاہتی، میں اپنے پیارے شوہر کو کبھی نہ بھلا سکوں گی۔اور بقیہ عمر اس کی یاد میں گزار دوں گی۔

یہ میرا ایک مقدس فریضہ ہوگا۔

یہ کہہ کر روتے روتے اس نے کمر بند کو اٹھایا۔جسے وہ کچھ دیر پہلے ٹھوکر مار چکی

تھی۔اس میں چابی لگا کر اسے کھولا۔اور اپنی کمر کے گرد پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ کس لیا۔اور چابی تالاب کے اندر پھینک دی۔

مغنی دل برداشتہ ہو کر وہاں سے چل دیا۔اس کو حاصل کرنے کی اب اس کے دل میں کوئی امید نہ رہ گئی تھی۔وہ کسی دور دراز شہر میں جا کر رہنے لگا۔لیکن محبوبہ کی یاد ہمیشہ اس کے دل میں بستی تھی۔اور اسے بے قرار رکھتی تھی۔

ایک روز اس کا ایک شاگرد جو اسی سوداگر کی بیوی کے شہر میں رہتا تھا۔اس سے ملنے گیا۔اس نے سب سے پہلے اپنی محبوبہ یعنی سوداگر کی بیوی کا حال پوچھا۔

شاگرد نے کہا۔استاد کیا عرض کروں۔وہ بڑی عجیب غریب قسم کی عورت ہے۔ پہلے سے بہت زیادہ موٹی ہو گئی ہے۔اور اس کی کمر میں بہت شدید درد رہتا ہے۔ لیکن وہ اس کا علاج بھی نہیں کراتی۔اگرچہ ہمیشہ درد کی شدت سے تڑپا کرتی ہے۔

لوگ یہاں تک بتاتے ہیں کہ وہ کبھی کبھی تالاب کے کنارے جا بیٹھتی ہے۔ اس نے کئی بار تالاب کا پانی خارج کرایا ہے۔اور تہہ مین جمی ہوئی مٹی کے ذرے ذرے کو اپنی نگرانی میں ہٹوا کر دیکھا ہے

معلوم نہیں وہ کس چیز کی تلاش میں ہے۔شاید کوئی بہت ہی قیمتی چیز ہو گی۔جو تالاب میں گر گئی تھی......اور اب اسے نہیں مل رہی ہے۔؟

اس کے شاگرد نے کہا۔

مغنی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا روئے۔

تیسرا آدمی

افسانہ نگار : شوکت صدیقی

دونوں ٹرک سڑک پر تیزی سے گزرتے رہے۔

چیتمبر پور روڈ، مشرق کی طرف مڑتے ہوئے ایک دم ہی نشیب میں چلی گئی۔ اور جھکے ہوئے ٹیلوں کے درمیاں کسی زخمی پرندے کی طرح ہانپتی ہوئی معلوم ہوئی تھی۔ رات اب گہری ہو چکی تھی، اور آغاز سرما کی بپھری ہوئی ہوائیں چل رہی تھیں۔ دونوں ٹرک کھڑکھڑاتے ہوئے گزر رہے تھے، ان کا بے ہنگم شور پتھریلی چٹانوں میں دھڑک رہا تھا۔

ایکا ایکی اندھیرے میں کسی نے چیخ کر کہا۔

اے کون جا رہا ہے ٹرک روک لو،

رات کے سناٹے میں یہ آواز بڑی پراسرار معلوم ہوئی۔

لیکن ٹرکوں کے اندر بیٹھے ہوئے لوگون نے اس کی طرف توجہ نہ دی، وہ اسی طرح خاموش بیٹھے رہے۔ اور دونوں ٹرک جھکی ہوئی چٹانوں کی گہرائی میں سے تیزی سے گزرتے رہے۔ اس دفعہ ذرا دور سے آواز سنائی دی، روکو، روک لو ٹرکوں کو۔ اور اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی گھڑگھڑاہٹ ابھرنے لگی۔ اس کی تیز روشنی دھوپ چھاؤں کی طرح ٹرکوں کے پچھلے حصے پر لہرا جاتی، لیکن ٹرک رک نہیں سکتے تھے، اس لئے کہ یہ خطرے کا الارم ہے۔ ان کی رفتار اور تیز ہو گئی ہے۔ اور دونوں ڈرائیور بڑے ایکسپرٹ ہیں۔!!

موٹر سائیکل کی روشنی قریب ہوتی جا رہی تھی، اور قریب قریب اس کا شور ٹرکوں کے قریب ہی دھڑکنے لگا تھا۔ ان کی رفتار اب زیادہ نہیں بڑھ سکتی تھی، اس لئے کہ

ڈھلوان پر ٹرکوں کے الٹنے کا اندیشہ تھا۔ دونوں ڈرائیوروں کے سہمے ہوئے چہرے خوف زدہ ہوتے جا رہے تھے۔ لیکن نیلی آنکھوں والا وانچو خاموشی سے بیٹھا ہو اسگریٹ پیتا رہا۔ اور برابر سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ پھر یک بارگی کوہستانی ٹیلوں میں ریوالور کی چلنے کی بڑی بھیانک آواز سنائی دی۔ اور گولی ٹرک کے پچھلے پہیوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔

روک لو ٹرکوں کو نہیں تو میں ٹائر برسٹ کر دوں گا۔

اس وارننگ کے ساتھ دونوں ٹرک رک گئے۔ ٹرکوں کے اندر سے صرف وانچو اتر کر نیچے آیا۔ باہر پت جھڑ کی شوریدہ ہوائیں چل رہی تھیں۔ اور ان کی تیز خنکی جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وانچو نے اپنے لمبے کوٹ کی کالر کو درست کیا۔ اور جلتی ہوئی سگریٹ کو جھنجھلاہٹ کے انداز میں سڑک پر پھینکتے ہوئے کہا۔

اس طرح ٹرک رکوا لینے کا مقصد؟

کیا چاہتے ہیں آپ؟

لیکن موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر وانچو سے ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ بلکہ بڑی بے نیازی سے کہنے لگا میں انٹی کرپشن کا انسپکٹر ہوں۔ اور دونوں ٹرکوں کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔

وانچو نے غور سے اس کی طرف دیکھا، دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا کرخت معلوم ہو رہا تھا۔ اور ریوالور اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ہے۔ اور بھاری بھر جسم والا انسپکٹر اب پوری طرح خوفزدہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اس نے جھٹ سے کاروباری پینترا بدلا اور بے تکلفی سے کہنے لگا۔ اچھا تو آپ ہیں۔ اور پھر مسکرا دیا۔ اگر آپ آفیشلی پوچھ رہے ہیں، تو دیکھیے دونوں ٹرکوں پر آلوؤں کے بورے لدے ہوئے ہیں۔ ثبوت میں ڈسٹرکٹ آکٹرا آفس کی رسید پیش کر سکتا ہوں۔ چونگی کا یہ محصول ابھی پچھلے ناکے پر ہی ادا کیا ہے۔ اور جو کچھ اصلیت ہے۔ وہ تو آپ جانتے ہی ہو

ں گے۔ اس لئے کہ آئرن شیٹس کو لے جانے کا یہ کوئی پہلا اتفاق تو نہیں ہوا ہے۔ یہ سلسلہ تو ایک مدت سے چل رہا ہے۔

انسپکٹر گردن ہلا کر بولا، جی ہاں سنا تو میں نے بھی یہی کچھ ہے۔ اس لئے کئی گھنٹوں سے اس سڑک پر تپسیا کر رہا ہوں۔ وانچو ہنسنے لگا یہ تپسیا تو آپ نے خواہ مخواہ اپنے سر لی۔ میں نے آپ کو دو مرتبہ دفتر فون کیا اگر آپ مل جاتے تو یہ پریشانی کیوں اٹھانا پڑتی۔ اور خود مجھے یہاں سردی میں نہ آنا پڑتا۔ مگر چلیئے یہ بھی ٹھیک رہا۔ اس بہانے سے آپ کے درشن ہو گئے۔ وہ تین سو روپے احمد پور کے اس ٹرپ سے بچا لینا چاہتا تھا۔

آخر اس نے کرنسی نوٹوں کو اندرونی جیب میں سے نکالا۔ اور انسپکٹر کی طرف بڑھا کر کہنے لگا۔ آپ سے پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ نذرانہ تو دینا ہی پڑے گا۔ لیجیئے ان کو رکھ لیجیئے۔ فرمایئے اور کیا سیوا کیجیئے۔

انٹی کرپشن انسپکٹر روکھے پن سے بولا۔ مہربانی کر کے ان کو اپنے پاس ہی رکھ لیجیئے۔

وانچو ذرا سنجیدہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ اور غور کرنے لگا کہ یہ آسانی سے ماننے والی آسامی نہیں ہے۔ اس سالے کو ابھی کچھ اور دکشنا دینا پڑے گی۔ اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ ہر کامیاب جرم کی سازش پہلے پولیس اسٹیشن ہی ہوتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ سودا بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ سب مایا کے کھیل ہیں اور مایا کے روپ نیارے ہیں۔ اس لئے جرائم کی نوعیتیں جداگانہ ہیں۔ جیب کاٹنے والا زیادہ سے زیادہ ہسٹری شیٹر ہی بن سکتا ہے۔ اور کارہائے نمایاں انجام دینے والا سرمایا دار بن جاتا ہے۔ البتہ اتنا ضروری ہے کہ ہسٹری شیٹر بننے کے لئے پولیس کی سرپرستی درکار ہوتی ہے۔ اور سرمایا داری کے لئے گورنمنٹ سے سازباز کیے بغیر کام نہیں چلتا۔ وانچو نے جیب کے اندر سے کچھ اور کرنسی نوٹ نکالے اور

آہستہ سے کہنے لگا۔

انسپکٹر تیواری جب تک رہے ہماری کمپنی سے برابر ان کا حصہ پہنچتا رہا۔ پھر خوشامد کرنے کے سے انداز میں وہ مسکرا کر بولا۔ لیکن آپ کو اس جھگڑے میں پریشان ہونا پڑا۔ لیجیے۔ یہ دو سو اور ہیں۔ دیکھئے اب اور کچھ نہ کہیئے گا۔ اور ہاں اب اپنا ریوالور اندر رکھ لیجیے۔ خواہ مخواہ آپ سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔

مگر بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر اسی طرح ناراضگی کے انداز میں بولا۔ دیکھئے آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں ان دونوں ٹرکوں کو پولیس اسٹیشن لے جائے بغیر نہیں رہوں گا۔ آپ خواہ مخواہ میرا بھی وقت ضائع کر رہے ہیں اور اپنا بھی۔ اور وہ موٹر سائیکل اسٹارٹ کرنے لگا۔

اس دفعہ وانچو کی مسکراہٹ نے دم توڑ دیا۔ اس نے بڑی تیکھی نظروں سے انسپکٹر کو گھور کر دیکھا۔

اس عرصہ میں اس کو پہلی بار خطرے کا احساس ہوا۔ اس لئے کہ دونوں ٹرک کسی طرح بھی پولیس اسٹیشن نہیں جا سکتے تھے۔ کمپنی کا یہی حکم تھا۔ یہی ہدایت تھی۔ اور اس کام کے اس کو کمپنی کی طرف سے نو سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔

اس کے علاوہ منیجر کی طرف سے چھ سو روپے ایکسٹرا آلاؤنس بھی ملتا تھا۔ وانچو کئی ماہ سے اپنی اس ڈیوٹی کو بڑی مستعدی سے انجام دے رہا تھا۔

کمپنی کئی ماہ سے اس کی کارگزاریوں کو سراہتی رہی ہے۔ اور بورڈ آف ڈائریکٹر کی میٹنگ میں اس کو بہت سی باتوں کے لئے جوابدہ بھی ہونا پڑتا تھا۔ اور اکثر ایسے بے تکے سوالوں سے اس کو سابقہ پڑتا کہ وہ بدحواس ہو جاتا۔ اس لئے وہ پانچ سو سے زیادہ دو ٹرکوں کے لئے رشوت نہیں دے سکتا تھا۔ ورنہ آئیندہ میٹنگ میں اگر کوئی ڈائریکٹر الجھ گیا تو زائد رقم اس کو اپنی تنخواہ سے ادا کرنا پڑے گی۔ دراصل فیکٹری کی تعمیر کے لیئے کمپنی ابھی تک اپنے پاس سے روپیہ لگا رہی تھی۔ شوگر

پلانٹ کا کنسٹرکشن ابھی تک مکمل نہیں ہوا۔ البتہ کمپنی کے وہ فارم جن میں ایکھ کی کاشت ہوگی۔ ان میں ٹریکٹر چلنے لگے ہیں۔ اور آلو کی فصلیں تیار کی جا رہی ہیں۔ اور یہ آلوؤں کی بوری کے ساتھ سیمنٹ کی بوریاں اور آرٹ شیٹیس بھی ٹرکوں میں لاد کر پوشیدہ طور پر مارکیٹوں میں جاتے ہیں۔ کمپنی کو اپنی انڈسٹری کی تعمیر کے لئے بہت بڑا سرپلس کوٹا مل گیا۔ جس کی سمگلنگ سنسان راتوں میں بڑے پراسرار طریقے سے ہوتی ہے۔ اور اس سازش میں پولیس کے علاوہ دوسرے محکمے بھی کمپنی کے شریک ہیں۔

وانچو غور کرنے کے انداز میں کاموش کھڑا رہا۔

اس کی گھنی بھنویں آنکھوں پر جھکی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ پھر یک بار گی اس نے طے کر لیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔ انہیں وحشت ناک موقعوں کے لئے وہ ہمیشہ کہا کرتا تھا، کہ جو کچھ کہنا ہے اس کے لئے منٹ بھر کا عرصہ بہت ہے۔ اور جو لوگ صرف انجام ہی پر غور کرتے ہیں۔ وہ کبھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتے۔ اور پھر ربو جھل قدموں سے چلتے ہوئے وہ آگے والے ٹرک کے پاس پہنچ گیا۔ اور سرگوشی کے انداز میں آہستہ آہستہ پکارنے لگا۔

نیل کنٹھ، اے نیل کنٹھ، مہاراج

اور ٹرک کے اندر سے مضبوط جسم والا اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ دھنسی ہوئی آواز میں بولا کیا ہے سکڑی ساب۔ پھر وہ اتر کر نیچے آ گیا۔ اس کا آبنوسی جسم رات کے گہرے اندھیرے میں پرچھائیوں کی طرح دھندلا رہا تھا۔ وانچو کہنے لگا۔

دیکھو نیل کنٹھ یہ سالا انسپکٹر تو کسی طرح مانتا ہی نہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ یہ دونوں ٹرک تھانے بھی نہیں جا سکتے۔

وہ سینہ تان کر بولا تو پھر حکم ہو۔

گہری آنکھوں والے وانچو نے اس کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ اور پھر سازش

کرنے کے سے انداز مین کہا۔ مجھے تو لائین کلیر چاہیئے۔ زیادہ جھنجھٹ نہیں چاہیئے۔ پھر مڑتے ہوئے اتنا اور کہا۔ میں جا کر اس سے باتیں کرتا ہوں۔ تم ٹرکوں کی پشت پر سے گھوم کر آ جانا۔ اور نیل کنٹھ جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اس کی آنکھیں جرائم پیشہ لوگوں کی طرح خونخوار نظر آنے لگیں۔ وانچو وہاں سے سیدھا اینٹی کرپشن انسپکٹر کے پاس چلا گیا۔ وہ اس کو آتے دیکھ کر تیزی سے بولا۔

آپ نے ٹرکوں کو اسٹارٹ نہیں کروایا۔ بلا وجہ دیر ہو رہی ہے۔ وانچو بڑی سنجیدگی سے بولا۔

آپ تلاشی لیں گے یا ٹرک اسی طرح چلیں گے۔

وہ کہنے لگا بظاہر تو بس اس کی ضرورت نہیں، یوں جیسے آپ کی مرضی"

وانچو ایک بار پھر کاروباری انداز سے مسکرا دیا۔ انسپکٹر صاحب ہماری مرضی کہاں مرضی تو آپ کی ہے۔ ہم نے تو اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ مگر آپ کی ناراضگی ختم ہی نہ ہوئی۔

وہ بے نیازی سے بولا دیکھئے ان بے کار باتوں سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ آپ کو جو کچھ کہنا ہو۔ تھانے چل کر کہہ لیجیئے۔

وانچو سنجیدہ ہو گیا بہت اچھا۔ لیکن اتنا میں آپ کو ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو لوگ آئرن شیٹیس اور سیمنٹ کا سرپلس کوٹا لے سکتے ہیں۔ اور جو اس کو سمگل بھی کرا سکتے ہیں وہ اپنے بچاؤ کے طریقے بھی جانتے ہوں گے۔ چور چوری کرنے جاتا ہے تو باہر کا راستا پہلے دیکھ لیتا ہے۔ اور اس مین شک بھی نہیں وانچو ٹھیک کہتا تھا۔ اس لئے کہ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کے وڈ ڈائریکٹر ایم، ایل، اے ہیں۔ اور ان میں سے ایک تو ریونیو منسٹر کا داماد بھی ہے۔ اور اسی لئے سرکاری محکموں میں کمپنی کا اثر بھی ہے۔ اور شور بھی ہے۔ لیکن بھاری بھر جسم والا انسپکٹر ان رازہائے سربستہ کو نہیں جانتا۔ اور اس سرکل میں ابھی اسکا نیا نیا ٹرانسفر ہوا ہے۔ اس لئے پورے علاقے میں

وہ اپنی دھاک بٹھا دینا چاہتا ہے۔ اور اس لئے ایک آدھ بڑا کیس بنائے بغیر بات نہیں بنتی۔ اور پولیس کی تکنیک کے مطابق ایک ابر جہاں ہوا بندھ گئی تو کامیابی خود آ کر قدم چومتی ہے۔ اور اسی لئے وہ کسی طرح باز نہیں آ سکتا تھا۔

وانچو کی باتوں پر اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

ممکن ہے آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں۔ ابھی تو آپ ذرا چل کر حوالات میں ٹھہریے۔ پھر دیکھیں گے، کہ آپ لوگ اپنے بچاؤ کا کون سا طریقہ جانتے ہیں۔

اس دفعہ وانچو بھی بپھر گیا۔ اس نے تیزی سے کہا۔ انسپکٹر صاحب مجھے بھی کیلاش ناتھ وانچو کہتے ہیں۔ میں تھانہ جانے سے پہلے بات کو یہاں بھی طے کر سکتا ہوں، آپ کے ایسے انٹی کرپشن کے انسپکٹروں سے یہاں اکثر سابقہ پڑا کرتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی مل گیا ہوتا، تو اس طرح مونچھ اونچی کرکے آپ کو بات کرنے کی جرات نہ ہوتی۔

انسپکٹر کے چہرے پر اور بھی خشونت آ گئی۔ وہ اس کو بڑی تیکھی نظروں سے گھورنے لگا، اور اسی وقت آبنوسی جسم والے نیل کنٹھ نے اندھیرے میں سے نکل کر اس کے سر پر آہنی راڈ اٹھا کر زور سے دے مارا۔ انسپکٹر نے دبی ہوئی کراہ کے ساتھ ہائے کر کے پھٹی ہوئی بھیانک آواز نکالی۔ اور لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس کی انگلیوں میں دبا ہوا ریوالور ابھی تک کانپ رہا تھا، وانچو نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ کو اپنے جوتے سے مسل دیا۔ اور ریوالور کو چھین کر ٹیلوں کی طرف پھینک دیا۔ اور اس کی ریڑھ کی ہڈی پر بھرپور لات مار کر بڑبڑانے لگا۔

دھت تیرے کی سالا کسی طرح مانتا ہی نہ تھا، اور پھر وہ نیل کنٹھ سے کہنے لگا'' مہاراج ڈال دو سالے کو ادھر کنارے کی طرف اا ور پھر اطمینان سے ایک سگریٹ سلگا کر پوچھنے لگا۔ ہاں دیکھ لو، کہ زخم گہرا تو نہیں۔ ورنہ بلا وجہ بات اور بڑھ جائے گی۔

نیل کنٹھ کہنے لگا۔ہاتھ بھر پور نہیں پڑا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔

پھر نیل کنٹھ نے سڑک پر بے سدھ پڑے ہوئے بھاری بھرکم جسم والے انسپکٹر کا بازو پکڑا۔اور اس کو گھسیٹتا ہوا دور تک چلا گیا۔اس کا کرخت چہرہ خون میں ڈوب کر بڑا بھیانک نظر آ رہا تھا، اور سانس سہمی ہوئی چل رہی تھی، وہ اسی طرح جھکے ہوئے کوہستانی ٹیلوں میں کسی لاش کی طرح بے جان پڑا رہا۔اور آغاز سرما کی تیکھی ہوائیں پتھریلی چٹانوں کو ڈھانپتی رہیں۔اور ایک بار گی کہیں گیدڑوں نے کہیں شور مچانا شروع کر دیا۔

دونوں ٹرکوں کے اسٹارٹ ہونے کی گھڑ گھڑاہٹ سنسان رات میں ابھرنے لگی، اور وہ موٹر سائیکل کو بری طرح روندتے ہوئے، سڑک پر پھر چلنے لگے۔لیکن احمد پور جانے کی بجائے اب وہ جنوبی ٹیلوں کی طرف مڑ رہے تھے۔اور کوئی سترہ میل کا چکر کاٹنے کے بعد وہ دونوں ٹرک پھر اسی چوراہے پر پہنچ گئے۔ جہاں لوہے کے کھمبے پر لگے ہوئے بورڈوں پر لکھا تھا۔

بلیر گھاٹ، اکیاون میل۔

بھوان کلاں، آٹھارہ میل۔

شیام بارہ، چوراسی میل

احمد پور، ایک سو باون میل۔

قریب ہی ڈسٹرکٹ آکٹرائے آفس تھا۔جس کے جھکے ہوئے سائبان کے نیچے ایک دھندلا سا لیمپ جل رہا تھا۔اور بوڑھا محرر رجسٹروں کو کھولے ہوئے کھانس رہا تھا۔ابھی کچھ عرصہ قبل یہاں دونوں ٹرکوں کی چنگی کا محصول ادا کیا گیا تھا۔وانچو ٹرک پر سے اترا۔اور سیدھا سائبان کے نیچے چلا گیا۔اور سرگوشی کے لہجے میں آہستہ سے بولا۔

منشی جی میرے خیال میں، آپ کے رجسٹروں پر ٹائم تو درج نہیں ہوتا ہوگا۔اور

پھر بغیر جواب کا انظار کیے اس نے چوکنا نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ اور تیں روپے کے کرنسی نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے، لیجیئے ان کو رکھ لیجیئے۔ کوئی دریافت کرنے آئے تو کہہ دیجیئے کہ دونوں ٹرک کوئی ساڑھے آٹھ بجے یہاں آئے تھے۔ سمجھ گئے نا آپ؟

اور بوڑھے محرر نے گردن ہلا دی۔ ایسا ہی ہو جائے گا۔ پر کوئی گھبرانے والی بات تو نہیں۔

وانچو ڈرامائی انداز میں قہقہہ لگا کر کہنے لگا۔ جب تک ہم موجود ہیں۔ آپ پر بھلا کوئی آنچ آسکتی ہے۔ وہ بھی ہنسنے لگا۔ سو بات تو ہے۔ پر بات اتنے ہے سرکار، کہ اب زمانہ بڑا خراب لگ گیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر سر بال کی کھال نکالتے ہیں۔

اور پھر چونگی کے محرر کو مطمئن کر کے وہ مسکراتا ہوا ٹرک کے اندر بیٹھ گیا۔ دونوں ٹرک پھر روانہ ہو گئے۔ سامنے پتمبر روڈ اندھیرے میں بل کھاتی ہوئی چلی گئی ہے۔ مگر دونوں ٹرک پھر اس طرف جانے کی بجائے راہیل روڈ کی طرف مڑ گئے۔ وانچو نے گھڑی میں وقت دیکھا، اب ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اور پھر دو بجنے سے پہلے ہی دونوں ٹرک امیر گڑھ پولیس اسٹیشن کے قریب جا کر ٹھہر گئے۔ وانچو تھانہ کے اندر چلا گیا۔ اور ڈیوٹی انسپکٹر کو ڈیڑھ سو روپیہ دے کر ایک ٹرک کا چالان کرا دیا۔ روزنامچہ میں دیا گیا۔

ٹرک نمبر ۳۱۳۶، نو بجے شب کو راہیل روڈ سے گزرتے ہوئے بغیر ہیڈ لائیٹس کے پایا گیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ اس کی بیٹری خراب تھی۔ ٹرک مذکور یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی ملکیت ہے۔ اور اس میں آلو کے بورے لدے تھے۔

اور اسی طرح کھیم پورہ کے تھانہ پر مزید ڈیڑھ سو روپیہ رشوت دے کر دوسرے ٹرک کا بھی چالان کرا دیا گیا۔ اور ہیڈ کانسٹیبل سرکاری روزنامچہ میں اندراج کرنے

لگا:

''پونے دس بجے شب کوٹرک نمبر ۶۲۲۸ راشیل روڈ پر

اتنی تیز رفتار سے گزر رہا تھا، کہ کسی حادثہ کے ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ڈیوٹی انسپکٹر ھرنام سنگھ نے اس کو رکوا کر تحقیقات کی، تو یہ بھی دریافت ہوا، کہ ڈرائیور مسمی نظر محمد کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی موجود نہ تھا۔

اس کے بعد دونوں ٹرک پھر راشیل روڈ پر تیزی سے گزرنے لگے۔ اور صبح کاذب کی گہری دھند میں دونوں ٹرک بلیر گھاٹ پہنچ گئے۔ اور پھر چھ بجے سے پیشتر ہی وانچو بھارت انجینیر نگ ورکس کی نئی سٹوڈیو بیکر پر واپس لوٹ پڑا۔ اور ابھی دھوپ اچھی طرح پھیلنے بھی نہ پائی تھی کہ اس کی کار فیکٹری کے اندر داخل ہو گئی۔

وانچو اپنے دفتر میں جا کر حسب معمول کمپنی کے کاموں میں الجھ گیا۔ اور رات کے حادثے کی اہمیت

سنیچر کے روز ہونے والے اس ڈریلمنٹ سے زیادہ نہ رہی، جس مین ریلوے کی ایک کیرج فیکٹری کے یارڈ کے اندر ڈیچ ہو گئی۔ اور اس نقصان کے لئے ریلوے نے کوئی چار ہزار کا کلیم کیا تھا۔ اور عدالتی کاروائیوں کے لئے ھرندر پرشاد ایڈووکیٹ کمپنی کے مشیر قانونی ہی موجود تھے۔

پولیس تحقیقات کرتی رہی، تفتیش برابر ہوتی رہی۔ اور اینٹی کرپشن کا بھاری بھر کم جسم والا انسپکٹر، ہسپتال میں پڑا کراہتا رہا۔ اور مضبوط پٹھوں والا نیل کنٹھ بھن گرجھ اکر ٹھاٹھ سے گالیاں بکتا رہا۔

اگر تمہاری بات نہ مانی جائے تو

''پھر تو کنور صاحب اس کا نتیجہ کچھ اچھا نہیں نکلے گا۔

''لیکن دیپ چند تمہیں معلوم ہونا چاہیئے میں اس کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہوں۔

کمرے کے اندر اسی طرح تیز تیز باتیں ہوتی رہیں۔

آتشدان میں کوئلے چیخ رہے تھے۔دہکتے ہوئے سرخ انگاروں کی روشنی میں وانچو کا گنجا سر چمکنے لگا۔مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا اپنا بھدا سا پائپ پیتا رہا۔دریچے سے ہوا کے یخ بستہ جھونکے نظر آ رہے تھے۔اور فیکٹری کی ورکشاپ میں دھڑکتی ہوئی لوہے کی جھنکاروں کا شور سنائی دے رہا تھا۔باہر ہلکی نیلگوں کہر کے لچھے منڈلا رہے تھے۔اور اس دھند میں لپٹی ہوئی مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی اونگھتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔جس کے باہری ورانڈے میں نیل کنٹھ دیوار سے پیٹھ ٹکائے ہوئے چپ چاپ بیٹھا ہوا تھا۔ورانڈے میں بالکل اندھیرا تھا۔اور اس گہری تاریکی مین نیل کنٹھ کا آبنوسی جسم آسیب زدہ سایہ کی طرح ڈراونا معلوم ہو رہا تھا۔

نیل کنٹھ اس طرح اندھیرے میں خاموش بیٹھا رہا۔اور جب کبھی دیپ چند تیزی سے بولتا،تو وہ چونک کر گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھتا۔جیسے اب کچھ نہ کچھ ہونے ہی والا ہے۔لیکن دیپ چند اندر بیٹھا اطمینان سے باتیں کرتا رہا۔اس کے چہرے پر ٹیبل لیمپ کے سیڑ کی پرچھائیں پڑ رہی تھیں۔اور اس دھندلی روشنی میں اسکا منحنی جسم ناٹک کے کسی مسخرے کی طرح حقیر نظر آ رہا تھا۔مگر دیپ چند کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہے۔اور کمپنی کی غیر قانونی سازشوں میں اس کا کردار بہت اہم ہے۔یہ بات نیلی آنکھوں والا وانچو بھی جانتا ہے۔اور اس کی اہمیت مینجنگ ڈائریکٹر کو بھی معلوم ہے۔

جس کو فیکٹری کے اندر سب کنور صاحب کہتے ہیں۔اس لئے کہ وہ رانی بازار کے علاقے کا جاگیردار بھی ہے۔وہ کاروباری ٹکنیک سے زیادہ،گھوڑوں کی نسلیں اور عورتوں کی مختلف قسموں کےمتعلق بہت کچھ جانتا ہے۔اس لئے کہ اس نے زندگی بھر ریس میں گھوڑے دوڑائے ہیں۔اور عورت کے جسم پر

کسی کیمیا گر کی طرح کوک شاستری تجربے کیے ہیں۔اور جب سے جاگیر

داری پر زوال آنے کی افواہیں سرکاری حلقوں میں گشت کرنے لگی ہیں۔اس نے بھی اپنے سرمایے کومحفوظ کرنے کے لئے کسی انڈسٹری میں داخل ہو جانا ہی اپنے حق میں بہتر سمجھا۔اوراس دوراندیشی نے اس کو کنور

شیو راج سنگھ سے یک بارگی یونائیٹڈ انڈسٹریز کا مینجنگ ڈائریکٹر بنا دیا۔لیکن کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا، بلکہ اس نے بڑی بے نیازی سے کہہ دیا:

اورآپ کو یہ بھی معلوم ہے۔کہ میں کمپنی کا چیف اکاؤنٹنٹ ہوں۔سارے رجسٹر میرے ہی پاس رہتے ہیں۔

مینجنگ ڈائریکٹر یک بارگی برافروختہ ہوکر بولا،ٹھیک ہے، کہ تمام رجسٹر تمہاری نگرانی میں رہتے ہیں۔مگراس بات سے تمہارا مطلب؟

وہ کہنے لگا، چوٹ کھایا ہوا انسان بڑا خطرناک ہوتا ہے۔کنور صاحب! آپ میرے ساتھ حق تلفی کریں گے۔تو میں بھی کل سارے رجسٹروں کوکل دائریکٹروں کی میٹنگ میں پیش کرسکتا ہوں۔

مینجنگ ڈائریکٹر کی سانس کی رفتار یک دم تیز ہوگئی۔اوروہ منحنی جسم والے دیپ چند کوعقابی نظروں سے گھورنے لگا۔لیکن دیپ چند بیٹھا مزے سے اپنی کنپٹی کھجاتا رہا۔اس لئے کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ مینجنگ ڈائریکٹر اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔وہ پوری طرح اس کے قابو میں ہے۔دیپ چند اس کی سازش کے اتنے بڑے راز کا محافظ ہے کہ وہ جس وقت چاہے اس کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔بات دراصل یہ ہے کہ سیمنٹ اور آئرن جن داموں پر چور بازار میں فروخت ہوتا ہے، کمپنی کے رجسٹروں میں ان کی قیمت بہت کم درج کی جاتی ہے۔اور اس طرح مینجنگ ڈائریکٹر نے پوشیدہ طور پر کوئی دولاکھ روپے غبن کرلیا ہے۔لیکن دیپ چند کواعتماد میں رکھنے کے لئے اس نے دس فی صدی کا شریک دار بنالیا تھا۔اوراس بیس ہزار کی

ادائیگی کے لیۓ اسکی نیت بدل گئی۔اور دیپ چند کے اکثریا دولا نے پر بھی اس کو وہ برابر ٹالتا رہا۔لیکن دیپ چند آج یہ فیصلہ کر کے آیا تھا، کہ کچھ نہ کچھ آج طے ہو جائے۔اس لیۓ کہ اس کی بڑی لڑکی کرشناوتی کے بیاہ کی بات ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر کے لڑکے سے طے پا چکی تھی۔گھر اچھا ہے۔اس لیۓ کوئی شبھ گھڑی دیکھ کر لگن ہو جانا چاہیئے۔لیکن اس کے لیۓ کاستھوں کے رواج کے مطابق ابھی اس کو دس ہزار روپیہ تلک میں دینا ہے۔ورنہ یہ سگائی نہیں ہو گی۔لیکن مینجنگ ڈائریکٹر چاہتا ہے کہ بورڈ آف ڈائریکٹرز سے سفارش کر کے اس کی تنخواہ ڈھائی سو ماہانہ سے ساڑھے تین سو ماہانہ کروا دے۔مگر دیپ چند کو یہ رشوت منظور نہیں۔اسے بیس ہزار روپیہ چاہیئے ہے۔اس لیۓ کہ وہ اپنی لڑکی کا بیاہ جلد ہی کر دینا چاہتا ہے۔

مینجنگ ڈائریکٹر کا چہرہ جھنجلاہٹ کے اثر سے غضبناک ہوتا جا رہا ہے۔اس کی کاروباری زندگی پر جاگیرداری کا روپ برابر حاوی ہوتا جا رہا ہے۔پھر یک بارگی وہ کمپنی کے مینجنگ ڈائریکٹر سے صرف

رانی بازار کے علاقے کا کنور شیو رراج سنگھ رہ گیا۔

اس نے میز پر زور سے گھونسا مار کر کہا:

نکل جاؤ میرے کمرے سے۔اور پھر چیخ کر بولا۔جاؤ جو تمہارے جی میں آئے کرو۔

اور منحنی جسم والا ناٹک کا مسخرہ مسکین سی شکل بنائے ہوئے خاموشی سے کمرے سے اٹھ گیا۔اور دروازے کے باہر چلا گیا۔کمرے کے اندر گہری خاموشی چھا گئی۔آتش دان میں کوئلے کبھی کبھی چٹخنے لگتے۔اور باہر لان میں دیپ چند کے قدموں کی آواز سنائی دی۔اور پھر وانچو نے اپنا بھدا پائپ میز پر رکھ دیا۔اور مینجنگ ڈائریکٹر سے کہنے لگا۔

کنور صاحب یہ آپ نے کیا کر دیا۔

کچھ نہیں سب ٹھیک ہے۔ کل سویرے ہی اس کو نوٹس دے کر نوکری سے فارغ کر دو۔

وانچو گھبرا کر بولا۔ لیکن اسطرح سے کام تو نہیں چلے گا۔ بلکہ اب تو وہ ہم کو آسانی سے بلیک میل کر سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس ک یپاس ہمارے خلاف بہت سے ڈاکو مینٹری ثبوت موجود ہیں۔

کنور شیو راج سنگھ گہری خاموشی میں کھو گیا۔ اور خود کو بڑا بے بس محسوس کرنے لگا۔ پھر اس نے بڑی بے چارگی سے کہا۔ اچھا اب تم ہی کچھ کرو۔

وانچو کہنے لگا آپ ذرا کوٹھی میں تشریف لے جائیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میرے ہوتے ہوئے بھلا آپ پر کوئی حرف آ سکتا ہے۔

کنور شیو راج نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا، اور پھر کرسی سے اٹھ کر وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد وانچو نے نیل کنٹھ کو اندر کمرے میں بلایا۔ اور اس سے کہنے لگا۔

نیل کنٹھ مہاراج، دیکھو دیپ چند ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ تم جا کر اس کو بلا لاؤ۔ کہنا کہ سیکرٹری صاحب نے بلایا ہے۔ اور نیل کنٹھ تیز تیز قدموں سے کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ لوٹا۔ تو اس کے ساتھ دیپ چند تھا۔

نیل کنٹھ پھر جا کر دروازے میں بیٹھ گیا۔ اور وانچو دیپ چند سے کہنے لگا:

اکاؤنٹنٹ صاحب آپ بھی بڑے عجیب آدمی ہیں۔ بوڑھے ہونے کو آئے۔ مگر مزاج پہچاننا آپ کو ابھی تک نہیں آیا۔ بھلا اس طرح بھی کوئی بات طے ہوتی ہے۔

لیکن دیپ چند بھی کم سیانا نہ تھا۔ وہ پہلے ہی بھانپ گیا تھا۔ کہ اس کا ترپ ٹھیک پڑا ہے۔ اور اب وہ اس کے قابو سے نکل کر جا نہیں سکتے۔ اس دفعہ وہ بھی ذرا نرمی سے بولا۔ مگر سیکرٹری صاحب یہ بھی تو دیکھیے کہ کنور صاحب تو میرا ہی گلا کاٹنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ ہی بتائیے میں کرتا بھی کیا۔

وانچو اپنے خاص انداز میں ہنسنے لگا، کمال کر دیا آپ نے تو۔ اتنا تو آپ جانتے ہی ہیں، کہ زندگی میں پہلی بار وہ اس کاروباری بکھیڑے میں پھنسے ہیں۔

انہوں نے تو ہمیشہ حکم چلائے ہیں۔ اور اپنی جاگیر میں من مانی حکومت کی ہے، دیکھیے رئیسوں سے بات کرنے کا اور ہی گر ہوتا ہے، ان کے سامنے تو ہر بات پر بس ہاں ہاں کرتے جایئے۔ پھر جو کام جی چاہے ان سے کرا لیجیے۔

اور دیپ چند نے جیسے اپنی غلطی کو تسلیم کر لیا۔

ذرا پشیمانی کے سے انداز میں کہنے لگا، اب کیا عرض کروں سیکرٹری صاحب۔ مجھے بھی اس وقت نامعلوم کیا سوجھی، کہ ان کے سامنے ذرا تیزی سے بات کرنے لگا، دراصل میں اپنی لڑکی کی سگائی کے سلسلے میں ادھر بڑا پریشان ہوں، آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بواسیر کا پرانا مریض ہوں۔ روز بروز تندرستی گرتی جا رہی ہے، اپنی زندگی ہی میں اس کے ہاتھ پیلے کر دوں، بس اب تو یہی لگن ہے۔

وانچو ہمدردی کرنے لگا، جی ہاں لڑکی کا ہونا بھی اس سوسائٹی میں اچھی خاصی مصیبت ہے۔ لیکن بات کے اسی پہلو پر آپ نے زور دیا ہوتا، تو بھلا کنور صاحب انکار کر سکتے تھے، انھوں نے لاکھوں روپیہ ریس بازی پر تباہ کیا ہے، کیا اس کنیا دان کے لئے وہ کچھ نہ کرتے۔

منحنی جسم والے دیپ چند کے روکھے چہرے پر ایک بار زندگی کی رمق پیدا ہو گئی، وہ مسکرا کر بولا تو اس کام کو آپ ہی کرا دیجیے، سیکرٹری صاحب آپ کا بڑا احسان ہوگا۔

وانچو جلدی سے بولا'' آپ خواہ مخواہ مجھ کو شرمندہ کر رہے ہیں، پھر اس نے میز کی دراز مین سے کنجی نکالی، اور دیپ چند کے سامنے اس کو ڈال کر کہنے لگا، لیجیے ذرا سیف میں سے چیک بک نکال لیجئے۔ میں آپ کے لئے ابھی چیک تیار کیے دیتا ہوں۔ اس وقت تو کنور صاحب کا موڈ بگڑا ہوا ہے۔ سویرے آفس پہنچنے سے پہلے ہی

میں ان سے دستخط کروا دوں گا۔ آپ بالکل اطمینان رکھیں۔ اوور دیپ چند جیسے واقعی مطمئن ہو گیا۔ اس نے کچھ بھی نہ کہا۔ اور چپ چاپ گھبرائے ہوئے انداز میں چابی اٹھائی اور دیوار کے پاس بکھرے ہوئے آہنی سیف کے پاس پہنچ گیا۔ پھر دیپ چند نے اس کے اوپر لگے ہوئے گہرے سبزی مائل چھوٹے سے بلب کو دیکھا۔ جو اپنی ایک آنکھ سے اس کی طرف گھور رہا تھا، گویا خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے تالے کو کھول کر دروازے کو باہر کی طرف کھینچ لیا۔ آہنی سیف کا اندرونی حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آنے لگا۔ اور وانچو گردن موڑے ہوئے مجرمانہ نظروں سے یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ اور جیسے ہی دیپ چند نے آہنی سیف کے نچلے خانے کا ہینڈل مضبوطی سے پکڑ کر اس کو کھولنا چاہا، اسی وقت وانچو نے دیوار میں لگے ہوئے سوئچ کو دبایا۔ دیپ چند ایکا ایکی بھیانک آواز سے چیخا، پھر اسکے کراہنے کی دبی دبی آوازیں گہری خاموشی میں ہانپنے لگیں۔ اور وانچو نے جھٹ سے کمرے کے اند اندھیرا کر دیا، آتش دان کی گہری سرخ روشنی میں اس کا بے ہنگم سایہ بڑا مہیب نظر آنے لگا، دیپ چند کے حلق کے اندر سے بلیوں کے غرانے کی سی خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ اور باہر فیکٹری کے ورک شاپ میں لوہے کے ٹکرانے کی جھنکاریں دھڑک رہی تھیں۔ ہر طرف کہر بار دھندلکا چھایا ہوا تھا، اور کمرے کی آسیب زدہ تاریکی میں کھڑا ہوا وانچو بڑا پر اسرار معلوم ہو رہا تھا، اس کی آنکھوں میں وحشت تھی، اور اس کے گنجے سر پر پسینے کی نمی آ گئی تھی، پھر وہ خواب میں بھٹکنے والے سایوں کی

طرح آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا آہنی سیف کے قریب جا کر ٹھہر گیا، اور ذرا دیر تک بالکل ساکت رہنے کے بعد اس نے دیپ چند کی طرف دیکھا۔ جس کا ہاتھ ابھی تک ہینڈل سے الجھا ہوا تھا۔ اور وہ فرش پر خاموش پڑا ہوا تھا۔ دھندلی روشنی میں اسکی پھٹی ہوئی آنکھیں بڑی بھیانک معلوم ہو رہی تھیں، لیکن وانچو خون خوار نگاہوں سے کھڑا ہوا اس کو چپ چاپ تکتا رہا۔ پھر اس نے نیل کنٹھ کو آواز دی۔ اور

نیل کنٹھ سہمی ہوئی آواز میں بولا

کیا حکم ہے سیکٹری صاب۔

وانچو کہنے لگا جاؤ برآمدے میں لگے ہوئے مین سوئچ کو آف کر دو۔ اور اس کے بعد کمرے کے اندر چلے آنا۔

باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی، پھر آہنی سی فیر جلتا ہوا سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب بھی بجھ گیا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں تھی، اس کے ساتھ ہی دیپ چند کا ہاتھ ہینڈل سے چھوٹ گیا۔ اور اسکا بے جان جسم ایک طرف کو لڑھک گیا۔ پھر ذرا دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا، اور نیل کنٹھ اندر آ گیا۔

وانچو اس سے کہنے لگا:

اس کو اٹھا کر باہر لان میں لے جاؤ۔ میں ابھی ذرا دیر میں آتا ہوں۔ اس کی آواز میں دبی ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔ نیل کنٹھ نے ایک بار بھرپور نظروں سے وانچو کو دیکھا۔ جیسے وہ پوچھ رہا ہو کہ کیا یہ گیا؟

پھر اسنے دیپ چند کی لاش کو اٹھا کر اپنی چوڑی چکلی پیٹھ پر لا دلیا۔ اور کسی کبڑے کی طرح کمر کو جھکائے ہوئے سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ پھر وانچو نے دیوار پر لگے ہوئے آہنی سیف کے سوئچ کو احتیاط سے دبا کر آف کر دیا۔ اور اپنی کوٹ کی جیب سے ٹارچ کو نکال کر روشن کیا۔ پھر اس تیز روشنی میں وہ سیف کے پاس پہنچا، اور اس کی پشت پر لگے ہوئے فلیکس ایبل وائر کو الگ کر دیا، اور دیوار پر لگے ہوئے برہنہ الیکٹرک وائر پر لڈ شیٹ چڑھا کر دونوں اسکرو اچھی طرح کس دیے۔ لیکن ابھی تک آہنی سیف کا اندرونی

حصہ منہ پھاڑے ہوئے نظر آ رہا تھا، اور جب وہ اس دروازے کو بند کرنے لگا تو یک بارگی اس کو دیپ چند کی پھٹی ہوئی آنکھیں یاد آ گئیں۔ اس کا سارا جسم لرز اٹھا، اور آتشدان کے اندر دہکتے ہوئے انگارے کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح چٹخنے

لگے۔

وانچو کی سانس اب تیزی سے چلنے لگی۔ اور وہ بدحواس سا ہو کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ کوٹھی کے اندر بالکل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے مین سوئچ آن کر دیا۔ اور ایک دم سے سے دریچوں

پر روشنی کی ہلکی ہلکی سی لہریں جھلملانے لگیں۔ اس وقت کوٹھی کے اندر سے کنور صاحب کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔ مگر اس نے ادھر کوئی توجہ نہ دی، اور تیزی سے ورانڈے کی سیڑھیاں اترتا ہوا باہر لان میں چلا گیا۔ جہاں نیل کنٹھ کھڑا ہوا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وانچو نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کو دھیرے سے آواز دی۔ اور دونوں گہری دھند میں کھوئے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔ ان کے قدموں کی دبی دبی آہٹ سنسان راستا پر دور تک سنائی دیتی رہی۔

رات گئے جب نیل کنٹھ اپنے کواٹر پر واپس آیا، تو دھندلی روشنی میں اس نے ایک دبلے پتلے بچے کو دیکھا جو سردی سے سکڑا ہوا کھڑا تھا۔ اس نے پہلی ہی نظر میں پہچان لیا کہ وہ دیپ چند کا لڑکا منا تھا۔ اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں چوکیدار کو پکار رہا تھا۔ پربھو بابا، ارے پربھو بابا، اور پھر پربھو بابا اندر سے کھانستا ہوا باہر نکلا۔ اس کو دیکھتے ہی حیرت سے بولا:

ارے تم اس سمے کہاں سے نکل پڑے۔ ہائے رام کتنے زوروں کا جاڑا پڑ رہا ہے۔

سردی سے سکڑا ہوا منا کہنے لگا۔ بابو جی ابھی تک گھر نہیں گئے۔ ماں جی گھبراتی ہیں، سو انہوں نے مجھے پوچھنے کو بھیجا ہے۔ اور کرشنا دیوی تو رات کو گھر سے نکلتی ہی نہیں۔

بوڑھا چوکیدار کہنے لگا، کہ وہ کنور صاحب کی کوٹھی پر گئے ہوں گے۔ میں ابھی جا کر ان سے کہہ دوں گا، چلو میں تمہیں پہلے کواٹر تک چھوڑ آؤں، اور وہ لڑکے کو اپنے

ہمراہ لے کر چل دیا، نیل کنٹھ اندھیرے میں کھڑا سب دیکھتا رہا۔ پھر ایک بارگی اس نے سنا کہ منا کہنے لگا تھا:

پربھوداداتم جا کر بابو جی کو لے آؤ۔ میں کواٹر چلا جاؤں گا۔ تم جلدی سے آجانا۔ وہ ننھی پلو ہے نا اس کو بابو جی کے بنا نیند نہیں آتی۔ خوب کوب زور زور سے روتی ہے۔

اور جیسے نیل کنٹھ کے پاس کوئی سرگوشی سے کہنے لگا۔ جاؤ منا اب تمہارے بابو جی کبھی نہیں آئیں گے۔ اور ننھی بلو روتے، روتے ان کے بغیر ہی سو جائے گی۔ وہ فیکٹری کے پاور ہاؤس کے پاس چپ چاپ پڑے ہیں۔ نہ کچھ بولتے ہیں۔ نہ ہی کسی کی کچھ سن سکتے ہیں۔ تمہاری آواز اب ان تک نہیں پہنچ سکتی۔

اور نیل کنٹھ محسوس کرنے لگا جیسے وہ بہت تھک گیا ہو، اس کا مضبوط پٹھوں والا جسم موم بتی کی طرح پگھلنے لگا، اور اس کے چاروں طرف دبی دبی سسکیاں دھڑک رہی تھیں۔ پھر وہ خواب کے سے عالم میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کواٹر کے دروازے پر پہنچا، اور اس کو کھٹکھٹانے لگا، لیکن اس کے شور سے وہ اچانک چونک پڑا۔ اور اس کو یاد آگیا کہ دروازہ تو اندر سے بند ہے۔ پھر کواٹر کی پشت پر جا کر وہ دیوار پھلانگ کر اندر آگیا۔ بالکل اسی طرح جیسے وہ ڈسٹرکٹ جیل کی پتھروں والی اونچی دیوار کو پھاند کر رات کے سناٹے میں فرار ہوا تھا۔ اس کے پیچھے گشت کرنے والے پہریداروں کی بھیانک سیٹیاں دیر تک بجتی رہیں۔ اور پھر اپنے کمرے کے اندر لیٹا نہ جانے کیا اوٹ پٹانگ قسم کی باتیں سوچتا رہا۔

دوسرے دن فیکٹری کے تمام ڈیپارٹمنٹ بند رہے۔ اس لئے کہ فیکٹری کے چیف اکاؤنٹنٹ دیپ چند کی اچانک موت ہوگئی تھی۔ اس کی لاش پاور ہاؤس کے اندر پائی گئی۔ اس نے الکیٹرک جنریٹر کے سوئچ بس بار کو غلطی سے چھولیا تھا۔ اور اس حادثہ سے وہ جان بر نہ ہو سکا۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی فیکٹری کے اندر یہ سر

گوشیاں بھی ہو رہی تھیں کہ دیپ چند نے خودکشی کر لی ہے۔ اور اس کی وجہ جاننے کے لئے کتنی ہی سرگوشیاں ہو رہی تھیں۔ لیکن سہ پہر کو پروگرام کے مطابق ڈائریکٹرز کی میٹنگ ہوئی اور کنور شیو راج سنگھ کی سفارش پر دیپ چند کے خاندان کے لئے پانچ ہزار کی رقم گزارے کے لئے منظور کر دی گئی۔ فیکٹری کی تعمیر ایکا ایکی سست پڑتی جا رہی تھی۔

پھاگن کی مہکی ہوئی ہوائیں چلنے لگیں۔ اور ان تیز ہواؤں میں سرسوں کے گہرے زرد پھولوں کی ڈالیاں جھومنے لگیں۔ اور کھیتوں میں جیسے بسنتی آنچل لہرا جاتے ہیں۔ کھیتوں میں رات گئے تک ڈھولک اور جھانجیں بجا کرتی ہیں۔ اور ہولی کے راگ اونچے سروں میں گائے جاتے ہیں۔ پھر گاؤں کے اندر بڑے بڑے الاؤ دہکنے لگے اور عبیر و گلال اڑنے لگے۔ پھاگن کی ہوائیں چیختی پھر رہی ہیں کہ ہولی آ رہی ہے۔ ہولی آ رہی ہے۔ پھر گیہوں کی لہلہاتی کھیتیاں کٹنا شروع ہو جائیں گی۔ اور دور کے شہر میں کام کرنے والے گاؤں کے لوگ موسم سرما میں جھیلوں پر

اکٹھا ہونے والے آبی پرندوں کی طرح اپنی بستیوں میں آنا شروع ہو گئے ہیں۔ یونائیٹڈ انڈسٹریز لمیٹڈ کی فیکٹری کے یارڈ میں مزدوروں کا شور روز بروز مدھم پڑتا جا رہا ہے فصل کی کٹائی کرنے کے لئے کمپنی کے سارے قلی دھیرے دھیرے فیکٹری کا کام چھوڑ کر بھاگنے لگے ہیں۔ کمپنی نے گھبرا کر ان کی کئی ہفتہ کی مزدوری روک لی۔ اس بات سے قلیوں کے روکھے چہروں پر ہر وقت جھنجھلاہٹ چھائی رہتی ہے۔ وہ ٹائم کیپر آفس میں اکٹھا ہو کر زور زور سے چلاتے ہیں۔ یہ مزدوری کیوں نہیں ملتی۔

"یہ سب کیا ہے۔ ہولی کا تہوار آ رہا ہے۔ ہم کو پیسہ چاہیئے ہے۔ ہاں ہم کو اپنی مزدوری چاہیئے ہے۔ ہم کو اپنی مزدوری چاہیے۔

لیکن مزدوری ابھی نہیں مل سکتی۔ اس لئے کہ کمپنی چاہتی ہے، کہ شوگر کا پلانٹ

جلد ہی تعمیر ہو جائے۔ نہیں تو کمپنی کا بہت نقصان ہو جائے گا۔

مگر مزدور لوگ اس کے یاوجود بھی نہیں ٹھہرتے۔ وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیختے ہیں سب کو گالیاں دیتے ہیں۔ پھر کسی روز تاروں کی چھاؤں میں اٹھ کر اپنی بستی کو چل دیتے ہیں۔ ان باتوں کو دیکھ کر بورڈ آف ڈائریکٹر کی ایمرجنسی میٹنگ بلائی گئی۔ اور یہ طے ہوا کہ قلی لوگوں کا ریٹ بڑھا دیا جائے۔ اس لئے کہ فیکٹری کی تعمیر میں کسی قسم کی تاخیر نہیں ہونی چاہیئے۔ پھر اس کے بعد مزدوری کے ریٹ بڑھنا شروع ہو گئے۔

ایک روپیہ چھ آنے یومیہ!

ایک روپیہ دس آنے یومیہ!

ایک روپیہ چودہ آنے یومیہ!

مگر ان تین ہفتوں میں ریٹ بڑھانے کا تجربہ بھی کچھ کامیاب نہ ہوا۔ بلکہ ھولی کا الاؤ دہکتے ہی مزدوروں نے اور بھی تیزی سے کام پر سے فرار ہونا شروع کر دیا۔ ہر روز ٹائم کیپر رجسٹر لے کر مینجنگ ڈائریکٹر کے آفس جاتا، اور سہمی ہوئی آواز میں رپورٹ سناتا۔ مینجنگ ڈائریکٹر جھنجھلا کر مزدوروں کے ساتھ سہمے ہوئے ٹائم کیپر کو بھی گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ پھر ایک روز اس نے وانچو کو اپنے دفتر میں بلایا۔ اور پریشانی کے عالم میں کہنے لگا۔

مسٹر وانچو آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ یہ ریٹ اس طرح کب تک بڑھایا جائے گا۔ مگر وانچو بھی کچھ گھبرایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کہنے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کنور صاحب، بات یہ ہے کہ یہ ترائی کا علاقہ ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے۔ اس دفعہ یہی سن رہا ہوں کہ فصلیں بہت اچھی رہی ہیں۔ راشن کا زمانہ ہے کسانوں کے ٹھاٹھ ہو گئے ہیں۔ اب انہیں یہ فیکٹری کی نوکری کیا اچھی لگے گی؟ اور یہ زمین داری ابالیشن کی خبروں نے تو ان کا اور بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔

وہ اور بھی پریشان ہو کر بولا، تم نے تو پوری کتھا سنانا شروع کر دی۔ اس طرح کیسے کام چلے گا۔ یہ بتاؤ کہ لیبر کا کیسے بندوبست ہو۔

وانچو ذرا دیر تک مینجنگ ڈائریکٹر کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولا، میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے کہ، لیکن اس میں بھی خطرہ ہے۔ اور روپیہ بھی اچھا خاص خرچ ہوگا۔

مینجنگ ڈائریکٹر جلدی جلدی کہنے لگا ذرا اپنے آپ کو بچا کر رکھنا، اور روپیہ کی تم فکر نہ کرو، میں ڈائریکٹروں سے نبٹ لوں گا۔ اور یوں بھی کم خرچ ہو رہا ہے اگر آئندہ سیزن تک فیکٹری اسٹارٹ نہ ہوئی تو یہ سمجھ لو کمپنی دیوالیہ ہو جائے گی۔

وانچو پوچھنے لگا یہ بنگالی کیمسٹ سانیال کیسا آدمی ہے۔ اس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟

وہ گردن ہلا کر بولا۔ آدمی تو وہ کام کا ہے۔ انارکسٹ پارٹی میں کئی سال رہ چکا ہے۔ انہی دنوں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ بہت بری طرح اس پر ٹارچر کیا، مگر اس نے ذرا سا بھی سراغ نہ دیا، تم اس پر اعتبار کر سکتے ہو،

پھر وانچو نے چپراسی کو آواز دی۔ اور اس کو سانیال کے بلانے کے لئے بھیج دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بھدے چہرے والا سانیال کیمسٹ دفتر کے اندر آ گیا۔ وانچو نے خاموشی کے ساتھ اس کا گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اور پھر پوچھنے لگا، مسٹر سانیال، نومبر کے مہینہ میں آپ کمپنی کے کام سے بمبئی گئے تھے۔ اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ وہاں آپ نے گورنمنٹ لیبارٹری سے بھی کچھ مشورہ لیا تھا، وہاں کوئی آپ کے جاننے والا تو نہیں ہے۔

بھدے چہرے والے سانیال نے ذرا دیر غور کرنے کے بعد کہا۔ جی ہاں میری وائف کے ایک رشتے دار اس میں کام کرتے ہیں۔ جن کے فلیٹ میں دو روز تک مین ٹھہرا بھی رہا تھا۔

اور وانچو کا گھبرایا ہوا چہرہ یک بارگی جیسے دمک اٹھا۔ وہ چٹکی بجا کر بولا، پھر تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ دیکھیے آج رات کی گاڑی سے آپ دہلی چلے جائیں۔ اور وہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعے بمبئی پہنچ جائیں۔ آپ کو گورنمنٹ لیبارٹری کے ذریعے ایک بہت بڑا کام کرنا ہے۔ اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ٹیلی فون اٹھا کر دہلی کے واسطے سیٹ کی ریزرویشن کے لئے اسٹیشن ماسٹر سے گفتگو کی۔ اور سہ پہر تک دس ہزار روپے کا ڈرافٹ بنوا کر اس کو دے دیا۔ پھر شام کے وقت سانیال وانچو کے ساتھ مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی کے اندر بند کمرے میں رازدارانہ باتیں کرتا رہا۔ اور پروگرام کے مطابق شام کی ٹرین سے دلی روانہ ہو گیا۔

پانچویں دن فیکٹری میں سانیال کا بمبئی سے ٹیلی فون آیا" لکھا تھا ھارڈویر کا بازار بہت خراب ہے کرشنگ سلنڈر ابھی تک نہیں ملا، وانچو نے تار کوئی بار پڑھا۔ اور اپنے دفتر میں خاموش بیٹھا ہوا" اس کوڈ نیوز" پر غور کرتا رہا۔ پھر کئی روز اور گزر گئے۔ اور کوئی اطلاع نہ ملی اور وانچو کی بے چینی بڑھنے لگی۔ اس پریشانی میں اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھر کر اور بدنما معلوم ہونے لگیں۔ پھر ایک روز فیکٹری کا کیمسٹ سراسیمگی کے عالم میں اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے کے بھدے نقوش گھبراہٹ سے اور دھندلے معلوم ہوتے تھے۔ وانچو کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا اس کو غور سے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا

کیا خبر لائے ہو؟

کام تو بن گیا

وانچو مسکرانے لگا، پھر تم اتنے پریشان کیوں ہو؟

سانیال دروازے کی طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگا۔ پھر اس کے قریب جھک کر کہنے لگا۔ مجھے ایک شخص پر شبہ ہوا ہے کہ وہ بمبئی سے میرا پیچھا کر رہا ہے۔ وانچو لحظہ بھر کے لئے گہری خاموشی میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا،

اچھا آپ جا کر ذرا نہا دھو کر آرام کیجیے۔ اس قدر گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

سانیال ذرا دیر تک خاموش کھڑا رہا۔ پھر دفتر سے باہر چلا گیا۔ اور وانچو آہستہ آہستہ چلتا ہوا کھڑکی کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ بھدے چہرے والا کیمسٹ فیکٹری کے پھاٹک سے نکل کر اپنے کوارٹر

کی طرف جا رہا تھا، وانچو چپ چاپ کھڑا ہوا اس کو دیکھتا رہا۔ تو پھر وہ اپنی میز پر آ گیا۔ اور ٹیلی فون اٹھا کر مینجنگ ڈائریکٹر کو فون کیا۔ وہ کوٹھی پر موجود تھا۔ وانچو نے بنگالی کیمسٹ کے آنے کی اس کو اطلاع دی، اور خود بھی دفتر سے نکل کر کنور صاحب کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

اور جب رات ذرا ڈھل گئی، اور گہرے سناٹوں میں ہواؤں کا شور تیز ہو گیا تو وانچو نے فیکٹری کی جیپ اسٹارٹ کی۔ جس کی پچھلی سیٹ پر آبنوسی جسم والا نیل کنٹھ خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ فیکٹری کے احاطہ سے نکل کر جیپ روشن نگر روڈ کی طرف مڑ گئی۔ تیرہ میل تک پختہ سڑک ہے۔ اس لئے جیپ سنسناتی ہوئی تیزی سے گزرتی رہی۔ مگر جب ناہموار پتھریلی سڑک آ گئی تو جیپ کو جھٹکے لگتے۔ اور وہ کھڑکھڑانے لگتی۔ لیکن وانچو خاموشی سے بیٹھا ہوا اس کو ڈرائیو کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر بڑا پر اسرار سکوت چھایا ہوا تھا، اور نیل کنٹھ پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ جھٹکوں سے اس کا سر بوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ باہر پھاگن کی ہوائیں چل رہی تھیں۔ پھاگن کی ہوائیں جو ھولی کا سندیسہ لاتی ہیں۔ اور ھولی جواب ختم ہو چکی تھی۔ اب تو گیہوں کی فصلیں کٹ رہی ہیں۔ اور ھنسیا کی تیز باڑھ سے لہلہاتی ہوئی گیہوں کی بالیاں کھیتوں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ جانے اشیر گڑھ کے خوبصورت گاؤں میں اب بھی کوئی نیل کنٹھ مہاراج کو کوئی یاد کرتا ہے۔ جس کی کٹائی کا چوپال پر بڑا چرچا رہا کرتا تھا۔ اور ایکا ایکی باجی کی لے پر جھومنے والے ناگ کی طرح وہ بے ہوشی کے عالم میں بڑ

برانے لگا۔

میں ایک کسان ہوں۔ہاں میں ایک کسان ہوں۔

پھر کسی نے فوراً ہی اس کا گلا دبوچ لیا،نہیں تو مجرم ہے۔پولیس تیرا وارنٹ لیے ابھی تک تلاش کر رہی ہے۔

نیل کنٹھ نے چونک کر دیکھا۔سامنے وانچو اطمینان سے اسٹیرنگ پر بیٹھا ہوا تھا۔اور پتھریلی سڑک پر جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔اور ستاروں کی مدھم روشنی میں کوھستانی چٹانیں سایوں کی طرح کوسوں تک پھیلی ہوئی تھیں۔پھر ایک بارگی وانچو نے جیپ کو نیچے ڈھلوان پر گھما دیا۔نیل کنٹھ گھبرا کر اپنی سیٹ سے چمٹ گیا۔لیکن جیپ ڈگمگاتی ہوئی گنجان درختوں کے نیچے کچھ دیر تک چلتی رہی،اور پھر گھرے اندھیرے میں جا کر ٹھہر گئی۔وانچو نے آگے والی سیٹ کے نیچے سے ڈائنامائیٹ کے بھاری کیس کو باہر نکالا۔یہ ڈائنامائیٹ جس کو فیکٹری کا کیمسٹ بمبئی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔جس کو گورنمنٹ فیکٹری سے سمگل کیا گیا تھا۔اور جس پر کمپنی کا نو ہزار سے زائد روپیہ خرچ ہوا تھا۔پھر نیل کنٹھ نے اس کو اپنے مضبوط ہاتھوں میں سنبھال لیا اور دونوں اندھیرے میں چلنے لگے۔ان کے قدموں کے نیچے خشک پتے کھڑکھڑا رہے تھے۔اور درختوں سے الجھتی ہوئی ہوائیں ہانپتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔اندھیرا بہت گہرا تھا۔اور پتھریلی چٹانوں میں کوکیلا ندی کا شور سنائی دینے لگا تھا۔وہ دونوں اسی طرح کئی فرلانگ چلتے رہے

اس وادی میں کوکیلا ندی کا بہاؤ بہت تیز ہے۔دونوں طرف سر بلند کوہسار ہیں۔اور جہاں پر دریا کا دھارا بہت تیز ہو گیا ہے۔اس مقام پر سرکاری ڈیم بنا ہوا ہے۔گورنمنٹ نے ہائیڈرو الیکٹرک پیدا کرنے کے لئے اس کو تعمیر کروایا ہے۔اس باندھ کے پاس پانی گرجتا ہوا اونچائی پر سے گرتا ہے۔اور قریب ہی میں پتھروں سے بنی ہوئی ایک چھوٹی سی عمارت ہے۔جس کے سامنے دو پہرے دار سنگینوں کو

سنبھالے ہوئے مستعدی سے کھڑے ہیں۔

پھر وانچو کی ہدایات کے مطابق نیل کنٹھ ڈائینا مائیٹ کو سنبھالے ہوئے آہستہ آہستہ بکھرے ہوئے پتھروں پر چلنے لگا۔ اور وانچو اس کی وائر کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے پتھریلی چٹانوں کے اندھیرے میں بیٹھا رہا۔ اس کی تیکھی نظریں سامنے پتھروں پر جاتے نیل کنٹھ کا پیچھا کرتی رہیں۔ ڈیم کے پاس پہنچ کر اچانک وہ غائب ہو گیا۔ پھر ایکا ایکی ڈیم کے اوپر ایک انسانی سایہ لہرایا۔ اور اسی وقت پتھریلی عمارت کے نزدیک کھڑے ہوئے پہرے دار نے چیخ کر کہا۔

ہالٹ''

''ہے کون ٹھہر جاؤ''

اور اس کے ساتھ ہی بندوق کی تیز آواز وادی کے اندر دھڑکنے لگی۔ لیکن نیل کنٹھ آہنی گارڈر سے چمٹا ہوا ڈائینا مائیٹ کو فٹ کرتا رہا۔ گولی اسکی کنپٹی سے ایک بار زن سے گزر گئی۔ وانچو اندھیرے میں بیٹھا ہوا سہمی نظروں سے ڈیم کو دیکھتا رہا۔ ایک دفعہ پھر بندوق کی آواز کوہستانی چٹانوں میں چیخنے لگی، اور اس کی دھڑکن کوہساروں کی گہرائی میں دیر تک ہانپتی رہی۔ وانچو کا جسم تھرتھرا کر رہ گیا۔ پھر یک دم ڈائینا مائیٹ کا وائر زور زور سے ہلنے لگا۔ گویا اب کام شروع کر دینا چاہیئے۔ مگر نیل کنٹھ ابھی تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

کوئی دس منٹ اس کے انتظار میں گزر گئے۔

وانچو نے جھنجھلا کر سوچا، کہ وہ ڈیم کو اڑا دے۔ اس لئے کہ اب زیادہ تاخیر کرنا خطرناک تھا۔ لیکن خطرے کے شدید احساس کے باوجود بھی وہ کچھ نہ طے کر سکا۔ اس لئے کہ اگر نیل کنٹھ ڈیم کی تباہی کے ساتھ مر گیا تو اور بعد میں اس کی لاش کی شناخت ہو گئی تب تو بڑا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ اور یہی سوچ کر وہ بڑے اذیت ناک لمحوں میں سے گزرتا رہا۔ اور سامنے ڈیم کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اسے رات کی مدھم

روشنی میں نیل کنٹھ کا کبڑا جسم نظر آیا۔ جب وہ بالکل قریب آ گیا تو وانچو نے پوچھا سب ٹھیک ہے۔ اور نیل کنٹھ نے اثبات میں اپنی گردن ہلا دی۔ وانچو نے مزید تاخیر کیے بغیر فوراً ڈائینا مائیٹ کو آن کر دیا۔ اور پھر کوہستانی وادی میں بڑی ہیبتناک گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اور خوابوں میں ڈھکی ہوئی سر بلند پہاڑیاں لرزنے لگیں۔ سرکاری ڈیم چیتھڑوں کی طرح بکھر کر رہ گیا۔ اور دریائے کوکیلا کا دھارا بڑی تیزی سے نشیب میں بہنے لگا۔

نیلی آنکھوں والا وانچو، نیل کنٹھ کو اپنے ہمراہ لیے درختوں کے گھرے اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگا

مگر نیل کنٹھ ہر قدم پر لڑکھڑا جاتا۔ اس کا کندھا گولی لگنے سے بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔ اور جب وہ جیپ کے پاس پہنچا تو بے جان ہو کر گر پڑا۔ اس کے زخم سے خون بہتا رہا۔ جیپ ہچکولے کھاتی تیزی سے گزرتی رہی۔ اور جب وہ فیکٹری کے اندر پہنچی تو نیل کنٹھ پر بے ہوشی کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کا آبنوسی جسم چھپکلی کی طرح زردی مائل ہو گیا تھا۔ اس لئے اس کو مینجنگ ڈائریکٹر کی کوٹھی پر ٹھہرا دیا گیا۔ دریائے کوکیلا پر بنے ہوئے اس ڈیم کے اس طرح تباہ ہو جانے پر ترائی کے علاقے میں بڑی سنسنی پھیل گئی۔ اور سرکاری حلقوں میں بڑا تہلکہ مچ گیا۔ اس لئے کہ اس بندھ کی تعمیر پر گورنمنٹ کا کروڑوں روپیہ خرچ ہوا تھا۔ تحقیقات کرنے کے لئے سرکاری افسروں نے بڑی دوڑ دھوپ شروع کر دی۔ ڈاک بنگلہ کی مرمت ہو رہی تھی۔ اس لئے فیکٹری کے گیسٹ ہاؤس میں سب لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ اور بڑی سرگرمی کے ساتھ تفتیش ہو رہی ہے۔ ہر مشتبہ آدمی کو حراست میں لے کر پولیس بری طرح ٹارچر کر رہی ہے۔ اور انہی دنوں اچانک ریو نیو منسٹر کا داماد نرائن ولبھ فیکٹری میں آ گیا۔ وہ کمپنی کا سب سے اہم ڈائریکٹر ہے۔ رات کو مینجنگ ڈائریکٹر کے پرائیویٹ کمرے میں جب وہ اس کے پاس پہنچا تو یک دم برس پڑا۔ کنور

ساحب یہ آپ نے سب کیا کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے تو ایسے جان پڑتا ہے کہ یہ فیکٹری اب تباہ ہونے والی ہے۔

مینجنگ ڈائریکٹر پہلے ہی سرکاری افسروں کی آمد سے بوکھلایا ہوا تھا۔ نرائن ولبھ کی باتوں پر وہ اور بھی بدحواس ہو گیا۔ آہستہ سے بولا "بھئی میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔ میں تو یہاں سے عاجز آگیا ہوں۔

مگر وہ کہتا ہی رہا۔ اب تو آپ ایسا ہی کہیں گے۔ مگر آپ کو کم سے کم یہ تو سوچنا چاہیئے تھا کہ گورنمنٹ کا انٹیلیجنس ڈیپارٹمنٹ اتنا احمق تو نہیں۔ کہ اتنی بڑی بات کو نہ سمجھ سکتا۔ ہوم سیکٹری کے پاس جو رپورٹ پہنچی ہے۔ اس میں اس فیکٹری پر بھی شبہ کیا گیا ہے۔ اس لئے ادھر لیبر کی جو بالکل کمی پڑ گئی تھی، اور جس طرح یہ مشکل خود بخود حل ہو گئی ہے۔ اس بات پر کون شبہ نہیں کر سکتا۔ دراصل ہوا بھی ایسا ہی ہے۔ کہ اب کمپنی کو قلیوں کی تلاش میں اپنے ایجنٹ گردونواح کی بستیوں میں نہیں بھیجنا پڑتے۔ بلکہ اب تو فیکٹری کے باہر ہر وقت آدمیوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کمپنی کا لیبر آفیسر ہر روز صرف پچاس آدمیوں کو اندر بلاتا ہے۔ وہ ہر ایک کا جسم ٹٹول کر گوشت کے مضبوط پٹھوں کا اندازہ لگاتا ہے۔ اور جس آدمی کو وہ فٹ سمجھتا ہے۔ اس کی چوڑی چھاتی پر کھریا سے سفید نشان بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب ہے، کہ اب اس کو فیکٹری میں کام مل گیا ہے۔ اور چودہ آنے روز مزدوری ملے گی۔ اس کا نام اور پتا ٹائم کیپر کے رجسٹر میں درج کر دیا جاتا ہے۔ پھاٹک کے باہر کھڑے لوگ جانوروں کی طرح گردن اٹھا اٹھا کر دیکھتے ہیں۔ اور سہمے ہوئے لہجہ میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں۔ مینجنگ ڈائریکٹر اور بھی گھبرا گیا

وہ بڑے شکست خوردہ لہجے میں کہنے لگا۔ مجھے کیا معلوم تھا یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ وانچو تو مجھ سے برابر یہی کہتا رہا کہ کوئی خطرے کی بات نہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اس طرح وانچو پر سارا الزام رکھ کر وہ قدرے مطمئن ہو گیا۔ یوں بھی وہ

کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر ہونے کے علاوہ وہ رانی بازار کے علاقے کا جاگیردار بھی تھا۔اس لئے نرائن ولبھ یک دم وانچو پر بگڑنے لگا۔

مینجنگ ڈائریکٹر گہری خاموشی میں کھو گیا۔اس لئے کہ وہ کسی طرح یہ نہیں چاہتا تھا کہ وانچو اس کے خلاف ہو جائے۔وہ اس کے بہر خطرناک راز کو جانتا تھا۔اس طرح نوکری سے برطرف ہو جانے پر اس کے برگشتہ ہو جانے کا پورا خوف تھا۔

تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا۔اس طرح نوکری سے

ہٹانے کے بعد اگر وہ کمپنی کے خلاف ہو گیا۔تو سرکاری گواہ بن کر وہ بہت بڑی مصیبت بن سکتا ہے۔میرا خیال ہے اس کو کسی اور طریقے سے یہاں سے ہٹا دیا جائے۔بعد میں دیکھا جائے گا۔اور یہ بات نرائن ولبھ ایم، ایل، اے کی سمجھ میں آ گئی۔اور پھر دونوں کسی نتیجہ پر پہنچنے کے لئے دیر تک بیٹھے رہے۔

اور جب نرائن ولبھ کمرے سے چلے گئے۔ت وکنور صاحب نے وانچو کو بلایا۔اور ساری بات اس ک و بتا دی۔اور یہ طے پایا کہ وہ نیپال کی راجدھانی کاٹمنڈو چلا جائے۔سرحد ک و پار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوگی کیونکہ رانا دلیر سنگھ جو ریاست کے اہم رکن تھے۔کئی بار کنور صاحب کی شکار گاہوں میں شکار کھیل چکے تھے۔اور دونوں دوست تھے۔وہ جب تک کھٹمنڈو رہے گا اس کو برابر ایک ہزار روپیہ ماہانہ مینجنگ ڈائریکٹر کی طرف سے ملتا رہے گا۔پھر ایک روز وہ فیکٹری کی کار میں بیٹھ کر اسٹیشن روانہ ہو گیا۔دفتر میں کام کرنے والے سب جانتے تھے۔کہ وہ کمپنی کے کام کے سلسلہ میں کلکتہ جا رہا ہے۔

اور وانچو کار میں خاموش بیٹھا دور ہوتی ہوئی فیکٹری کی عمارت کو دیکھتا رہا۔جس کی تعمیر کے لئے اس نے خطرناک سازش کی تھی،اور وہ فیکٹری اس کی آنکھوں سے دور ہوتی جا رہی تھی۔

اس کی گہری نیلی آنکھیں بڑی پراسرار معلوم ہوتی تھیں۔

سرکاری ڈیم تباہ ہوجانے کی وجہ سے کوکیلا ندی میں بڑا بھیانک طوفان آیا تھا۔ بپھری ہوئی لہریں ترائی کے میدانی علاقوں میں شب خون مارنے والے غنیم کی طرح پھیلتی جارہی تھیں، گیہوں کی لہلہاتی فصلیں پانی کے بہاؤ میں بہہ گئیں۔اور تباہ حال کسان اپنے اپنے گھروں کو چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ اور راجہیل روڈ پر مریل انسانوں کے قافلے گزرتے ہیں۔اس لئے کہ سیلاب زدگان کے لئے امیر گڈھ میں سرکار نے ریلیف کیمپ قائم کردیا ہے۔اس سلسلہ میں جو گورنمنٹ کا پریس نوٹ شائع ہوا ہے۔اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ اس تباہی میں کیمونسٹوں کی وحشت پسندی کو دخل ہے۔جو اپنے سیاسی مفاد کے لئے ملک میں بے اطمینانی اور ہیجان پیدا کرنا چاہتے ہیں۔اور اس لئے پولیس نے کسان سبھا کے دفتر پر چھاپا مار کر کتنے ہی کسان ورکروں کو حراست میں لے لیا ہے۔

نیل کنٹھ کنور صاحب کی کوٹھی کے ایک مختصر کمرے میں پڑا کراہ رہا ہے۔اس کے کندھے پر سفید پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔اور اس کا مضبوط پٹھوں والا آبنوسی جسم چھپکلی کی مانند زرد ہوگیا ہے۔

خون کے زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے اس پر بار بار غشی کے دورے پڑتے ہیں۔اور کنور صاحب نے کمپنی کی طرف سے کمشنر کے اعزاز میں اپنی خوبصورت کوٹھی کے اندر ایک شاندار ڈنر کا انتظام کیا ہے۔جس کا ہنگامہ رات گئے تک فیکٹری کے اندر گونجتا رہا۔

خطِ سرطان

افسانہ نگار : مسعود اشعر

اس کہانی کا نام خطِ سرطان ہے۔ ہنری ملر کے ایک ناول کا نام بھی ٹرا پک آف کینسر ہے، لیکن اس کہانی کا ہنری ملر کے ناول سے کوئی تعلق نہیں ہے، یوں بھی جنہوں نے اریکا جونگ اور جارج باٹیل کو پڑھا ہے، ان کے لئے ہنری ملر محض ایک بچہ رہ گیا ہے، ہاں اس کہانی کا تعلق اس خیالی لکیر سے ضرور ہے، جو کرہ ارض کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، وہ خیالی لکیر جو ایک جیتے جاگتے کرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، لیکن اپنا وجود نہیں رکھتی۔

صبح صبح حسب معمول اس کا فون آیا۔ اور حسب معمول میں نے سوال کیا ''جی فرمان امروز کیا ہے؟ آرڈر آف ٹوڈے؟

بکومت سیدھے ادھر آ جاؤ، میری گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ بازار جانا ہے صبح اس کا فون آیا تھا۔ اس کے لئے شلوار قمیض خریدنا ہے۔ کس کا فون آیا؟

میں نے جان بوجھ کر شرارت کی، حالانکہ میں جانتا تھا، کہ کس کا فون آیا تھا۔ اور یہ بھی جانتا تھا کہ جب وہ ''اس، اور، وہ کہتی ہے۔ تو اس سے کون شخص مراد ہوتا ہے۔

ہمرے میاں کا اور کس کا۔ اس نے ڈانٹ دیا۔ پھر تھوڑا

سانس لیا، اور ٹھہر ٹھہر کر کہنا شروع کیا۔ اس کا ٹرانسفر کویت ہو گیا ہے، اچانک ہوا ہے۔ اس لئے وہ پہلے بتا نہیں سکا۔ ورنہ پہلے بتا دیتا۔ اس لئے وہ پاکستان بھی نہیں آ سکتا، اس کا ایک دوست آیا ہوا ہے، کل واپس جا رہا ہے۔ وہ چیزیں ساتھ

لے جائے گا،

اگر وہ چلا گیا تو پھر بھیجنا مشکل ہو جائے گا۔اور وہ صاحب بہادر پتا نہیں کب پاکستان واپس آئیں۔

''وہ چلا گیا تو ہم دے آئیں گے تم پریشان کیوں ہوتی ہو! میں نے مذاق کرنے کی کوشش کی جو رائیگاں گئی،اس نے نوٹس ہی نہیں لیا۔

کس وقت اٹھو گے دفتر سے اس نے اسی لہجے میں کہا۔

جس وقت تم کہو۔اب میں محتاط ہو گیا تھا،اس کے ساتھ مذاق کرتے بھی ڈر لگتا تھا۔ہمیشہ مس فائر ہو جاتا تھا۔

دو بجے آ جانا۔بازار کے بعد ورکشاپ سے گاڑی بھی لینا ہے۔

میں جانتا تھا کہ آج کا سارا دن اور ساری شام اس کے شوہر کے ذکر میں ہی گزرے گی،یہ سننا پڑے گا کہ

وہ صاحب کتنے بے پرواہ اور سنکی آدمی ہیں۔اپنا خیال بالکل نہیں رکھتے۔کپڑوں کی فکر تو دور کی بات ہے۔کھانے پینے تک سے بھی بے نیاز ہیں۔اگر باہر سے کھائے پیے بغیر آ گئے اور گھر میں کھانے کو کچھ نہ ہوا تو وہ بھوکوں مر جائیں گے۔باہر جا کر کھانے کی زحمت نہیں کریں گے۔نوکروں پر ترس کھانے کا اتنا شوق ہے،کہ نوکر اکثر چھٹی پر ہی رہتے ہیں۔

مجھے تو ہر وقت اس کی ہی فکر کھائے جاتی ہے۔ایک دن اس نے بہت ہی پریشان ہو کر کہا،

تو پھر تم چلی جاؤ اس کے پاس۔

''ہنہ۔وہ کوئی جانے کی جگہ ہے۔وہاں تو آدمی بور ہو کر مر جائے۔نہ کہیں آنا،نہ جانا،نہ ملنا نہ ملانا۔

چار پاکستانی خاندان ہیں جب ملو ان سے۔نہ ملو جب ان سے،میں تو دو دن

میں پاگل ہو جاؤں۔

ٹھیک ہی ہے نہ جاؤ۔ ورنہ وہاں تم پاگل ہو جاؤ گی۔ اور یہاں اور بہت سے لوگ پاگل ہو جائیں گے۔

اس نے میرے اس مذاق یا اعتراف پر کوئی توجہ نہ دی، اور اپنے بچوں میں لگ گئی۔ کہ بچوں کو ہوم ورک بھی وہ خود ہی کراتی تھی۔ اور سکول چھوڑ کر بھی وہ خود ہی آتی تھی۔

مجھے دیر ہو گئی تھی۔ میں دو بجے کے بعد اس کے گھر پہنچا، وہ سفید دوپٹے سے سر اور کان لپیٹے باتھ روم سے نکل رہی تھی، نماز پڑھنے کے لئے اس نے سفید دوپٹا رکھا ہوا تھا۔ خدا جانے کیوں میں نے اسے ہمیشہ سفید دوپٹا اوڑھ کر ہی نماز پڑھتے دیکھا تھا، اس وقت بھی وہ سفید دوپٹا اوڑھے اپنے آپ میں مگن تھی۔

تم دو منٹ بیٹھو۔ میں ذرا نماز پڑھ لوں...... میں بیٹھنے لگا تو وہ چلتے چلتے مڑی۔ تم نے کھانا بھی تو نہیں کھایا ہوگا، کچن میں دیکھ لو کھانا ہاٹ کیس میں گرم ہی رکھا ہے۔

اور بچے کہاں ہیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا، وہ سو رہے ہیں۔ ان کے کمرے میں نہ جانا۔

وہ نہ بھی کہتی تو میں کچن میں جا کر کھانا کھا لیتا۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی، میں جانتا تھا

اس کے دو منٹ کم سے کم بیس منٹ تو جائیں گے۔

اتنی جلدی تو اس کی نماز ختم نہیں ہو گی...... کچن میں سب کچھ تھا اور گرم، شاید اس نے بھی ابھی ابھی کھانا کھایا تھا۔

میرے کھانا ختم کرنے تک اس نے نماز ختم کر لیا اور کچن میں بیٹھ گئی، اب اس نے سفید دوپٹا اتار کر پھینک دیا، اور آزادی کے ساتھ میرے سامنے بیٹھی تھی۔

صبح صبح ہی فون آیا تھا۔" اس نے کہنا شروع کر دیا، میں تمہیں اپنے آنے کا

پروگرام بتا رہا ہے۔ مگر جب اس نے کہا کہ وہ آج ہی کویت جا رہا ہے۔ اور شاید اسے بحرین بھی جانا پڑے، تو مجھے اتنا غصہ، کہ فون پر ہی میں نے اسے خوب سنا دیں۔ میں نے کہا تم بہت فضول آدمی ہو۔ ڈیڑھ سال ہو گیا تمہارا آنے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ مگر پھر سوچا بندی وہ کرے بھی تو کیا، نوکری ہی ایسی ہے۔

ہاں ملازمت تو بہر حال ملازمت ہی ہوتی ہے۔ مین نے کہا، بہر حال مجھے کچھ تو کہنا چاہیئے تھا۔

"بس یہی میں سوچتی ہوں مجبور ہے بے چارہ وہ بھی کیا کرے۔"

پیسے بھی تو خوب کما رہا ہے۔ میں نے کہا، لیکن اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی کیونکہ اب وہ کھڑی ہو گئی تھی،

اب جلدی کرو، بہت دیر ہو جائے گی، یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف لپکی اور اچانک ٹھٹھک کر رہ گئی۔ اور میری طرف اس طرح دیکھا کہ میں گھبرا گیا

...... یہ تم نے کپڑے کیا پہن رکھے ہیں۔ کلر کومبینشن کا کچھ تو خیال کر لیا کرو۔ پوری یونیفارم پہن رکھی ہے کسی چپراسی کی......

اوہ، جلدی میں یہ کپڑے پہن لیے تھے۔ میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی مگر وہ کہاں سننے والی تھی۔ آگے بڑھ کر اس نے میری ٹائی پکڑ لی۔

یہ ٹائی دیکھی ہے بالکل اٹلی کے غنڈے نظر آتے ہو۔ گینگسٹر!،

تم نے ہی دی تھی یہ۔

میں نے دی تھی؟ لیکن ہر زمانے کا ایک فیشن ہوتا ہے۔

اس وقت یہی فیشن ہو گا

تو تم بتاتی رہا کرو نا کہ کب فیشن بدل گیا ہے؟

ان کپڑوں میں تو میں تمہارے ساتھ بازار نہیں جا سکتی، کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا، کہ کس غنڈے کے ساتھ پھر رہی ہے؟

یہ کہہ کر اس نے ایک جھٹکے سے ٹائی اتاری۔ پھر غور سے دیکھا ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب تم ایرانی نظر آتے ہو۔ وہی حجتہ اللہ، آیت اللہ قسم کے......

میری گردن کو اس زور کا جھٹکا لگا تھا کہ مجھے غصہ سا آ گیا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی ہی چلاتی تھی۔ ہمیشہ فیصلے صادر کرتی تھی، اور ہر ایک سے پوری توقع رکھتی تھی کہ وہ خوشی خوشی اس کے فیصلوں پر پوری طرح عمل کرے۔ پتہ نہیں کیا سمجھتی ہے اپنے آپ کو۔

''تم ہمیشہ اچھے لگا کرو'' معلوم نہیں کہ یہ اس نے مجھے خوش کرنے کو کہا یا صرف کہنے کے لئے، لیکن اس ایک بات نے میرا سارا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

وہ تو شاید تمہیں کبھی نہ لگوں میں نے منہ بنا کر کہا۔

اچھا اب بنو مت'' یہ کہہ کر اس نے میرے دونوں کندھے جھنجھوڑ دیے۔

بازار سے لوٹتے لوٹتے چھ بج گئے۔ کہ خریداریاں اس کے میاں ہی کے لئے نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ میرے لئے بھی ٹائیاں خریدی گئیں۔ میں نے بہت احتجاج کیا، مگر وہاں کون سنتا تھا۔ اس احتجاج کی وجہ سے بھی دیر ہوئی کہ وہ میری پسند پوچھتی اور میں ٹال دیتا۔ آخر وہی ہوا جو وہ چاہتی تھی۔ اور میں جانتا تھا کہ پسند اس کی ہی چلے گی۔

ورکشاپ بند ہو چکا تھا، اور چوکیدار بھی غائب تھا۔ سردیوں کی شام چھ بجے سے ہی اندھیری رات میں بدل چکی تھی، اس کا خیال تھا کہ گاڑی ٹھیک ہو گی اور چوکیدار کے پاس اس کی چابیاں ہوں گی۔ کہ اکثر مستری یہی کرتا تھا۔ اب ہمیں چوکیدار کا انتظار کرنا تھا۔ اس کا کہنا تھا، کہ گاڑی نہ ملی تو بچوں کو سکول کون چھوڑے گا؟

ہم ورکشاپ میں ٹین کے سائبان سے لٹکتے ساٹھ وولٹ کے بلب کے نیچے کھڑے ہو گئے، کیونکہ باہر موسم نے ہمارا امتحان لینا شروع کر دیا تھا۔ اور ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگیں تھیں۔ میں نے آس پاس دیکھا۔ رنگ برنگی گاڑیاں کھڑی

تھیں۔ وہ گاڑیاں جن کی ڈینٹنگ ہو چکی تھی اور پینٹنگ کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اور وہ گاڑیاں جنہیں ابھی ہاتھ بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ صحیح حالت میں شاید ایک بھی گاڑی نہیں تھی۔ اس کی گاڑی ان سب مین اچھی تھی، لیکن ڈینٹ اس میں بھی پڑے ہوئے تھے۔ کہ ڈینٹ کے بغیر اس کی گاڑی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

ادھر ڈینٹ نکلوائے جاتے اور ادھر پھر وہ کسی سے ٹکرا جاتی۔ وہ نہیں ٹکرائی تھی، لوگ خود ہی اس کے ساتھ ٹکرا جاتے۔

جب تم گاڑی چلاتی ہو تو تمہارا دھیان کدر ہوتا ہے۔ ایک بار میں نے اس سے سوال کیا تھا۔ مت پوچھو

کوئی ایک بات ہو تو بتاؤں، یہاں تو ایک ہی وقت میں نہ جانے کون کون اور کیا کیا میرے دماغ پر حملہ کرتا ہے۔ اصل میں میرا ہی دماغ شیطان کا گھر ہے۔

وہ رکی اور زور کا قہقہ لگاتے ہوئے بولی۔ وہ کون تھے

وشوامتر صاحب۔ جن کی تپسیا ایک ناچنے والی نے بھنگ کر دی تھی،

ہاں مینیکا نے تپسیا بھنگ کر دی تھی۔ میں نے اپنے علم کا رعب ڈالا، مگر تم تو خود مینیکا ہو۔ دوسروں کی تپسیا بھنگ کرنے والی۔

ہوں مینیکا نے تپسیا بھنگ کی تھی، اس نے میری بات پر دھیان نی دیا۔ وہ تو ایک مینیکا تھی۔ میری تپسیا بھنگ کرنے کو تو سینکڑوں مینیکائیں اور ہزاروں مینیک میرے سامنے ناچتے رہتے ہیں۔

اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو میں ابھی اور اسی وقت اپنا ناچ بند کیے دیتا ہوں۔ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔

تم! اس نے پلکیں جھپکائے بغیر جواب دیا۔ اوہ ہو...... تو تم اپنے آپ کو تپسیا بھنگ کرنے والا سمجھتے ہو!!

ماشااللہ شکل دیکھی ہے اپنی؟

یہ بات اس نے مذاق میں کہی تھی مگر مجھے بری لگی، وہ ہمیشہ ایسی ہی بات کر جاتی تھی، میرے دل کا خیال کیے بغیر۔ ایسے وقت میں میرا جی چاہتا کہ اٹھ کر چلا جاؤں یا اسی لمحے اور اسی انداز میں جواب دوں۔ لیکن پھر میں خاموش ہو جاتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو سمجھاتا ہوں، کہ یہ محض میرا احساس کمتری ہے۔ ورنہ وہ تو صاف دلی سے بات کرتی ہے۔

کیونکہ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایسی واری نیاری ہو جاتی کہ سارا غصہ ختم ہو جاتا۔

جس روز اس کے ساتھ یہ باتیں ہوئی تھیں اسی روز، اس نے جو فرمان امروز جاری کیا تھا۔ وہ ایک فلم دیکھنے کے لئے تھا۔ اس نے فون کیا تھا۔ سنو آج شام کو جلدی آ جانا۔ TERMS OFENDEARMENT مل گئی ہے۔

کون مل گئی ہے؟ میں نے واقعی ہی فلم کا نام نہیں سنا تھا۔

تمہاری چہیتی اور کون؟

میری چہیتی؟۔ مگر میری تو بہت سی چہیتیاں ہیں، تم کس چہیتی کی بات کر رہی ہو؟

شرلی میکلن کی بات کر رہی ہوں جس پر تم مرتے تھے۔

اس کی فلم ہے MENTERMS OF ENDEAR ہے۔ آج رات دیکھیں گے۔ شام کو جلدی آ جانا۔

جلدی آ جانا۔ اس نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر کہا۔ ورنہ اس کے گھر میں اس وقت تک فلم نہیں دیکھی جا سکتی تھی، جب تک بچے سو نہ جائیں۔ یا سونے کے لئے اپنے کمرے میں نہ چلے جائیں۔ پھر رات کے گیارہ بارہ بج ہی جاتے۔ کہ فلم کے بعد کافی یا چائے بھی پی جاتی اور فلم پر تبصرہ بھی ہوتا۔ ہاں ایک بات ضرور ہے کہ میں اس کے گھر بارہ ایک بجے تک تو رہ سکتا ہوں، لیکن سو نہیں سکتا۔ ہمارے تعلقات کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے۔

ہمارے تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ میری نظر میں، اس کی نظر میں اور دیکھنے

والوں کی نظر میں؟ میرا خیال ہے کہ میں اس نوعیت کو اچھی طرح سمجھتا ہوں، اور یقین رکھتا ہوں کہ وہ بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اگر وہ اس حقیقت سے واقف نہیں ہے تو دیکھنے والوں کی نظریں اسے آگاہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ کم سے کم میرا خیال یہی ہے۔ اور اس کے لئے میں وقتاً فوقتاً اس کا امتحان لیتا رہتا ہوں۔ مگر وہ میرے کسی سوال کا جواب ساف صاف نہیں دیتی، ہمیشہ ٹال جاتی ہے۔ یا پھر الٹا سوال کر دیتی ہے۔

فلم دیکھنے والی شام جب میں اس کے گھر پہنچا، تو اندر داخل ہوتے ہی میں نے سوال کر دیا۔ ہاں تو تمہارے لاڈ پیار کی کیا شرائط ہیں۔؟

شرائط؟ اس نے حیرت سے پوچھا یہ کیا کتابی زبان بول رہے ہو؟ بھئی جو فلم تم دکھا رہی ہو۔ اس کے نام کا یہی مطلب ہے نا؟ میں تو یہی سمجھا کہ یہ کوئی علاماتی یا اشاراتی قسم کی بات ہوگی۔

میں نے اپنی دانست میں مذاق کیا تھا۔ لیکن وہ سنجیدہ ہوگئی۔ شرطیں تو ساری طے ہو چکی ہیں

وہ کیا؟ میں نے پھر مذاق کیا۔

جب شادی ہوئی تھی۔ وہ اسی طرح سنجیدہ تھی۔

مگر میں سنجیدگی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس قسم کی سنجیدگی سے ڈرتا تھا۔ اس لئے میں نے پھر سوال کر دیا ''میں اپنے لئے شرطیں پوچھ رہا تھا۔

تمہارے لئے؟ وہ تو بس ایک ہی شرط ہے تم بولا کم کرو۔ زیادہ بولتے ہو تو بونگیاں مارتے ہو۔

اور پھر...... وہ ٹھہری، میری طرف دیکھا اور پھر منہ پھیر کر بولی'' اور پھر تم بہت برے لگتے ہو۔ پتہ نہیں

لوگ کیا سمجھنے لگتے ہیں اپنے آپ کو؟

یہ تم میرے لئے کہہ کر رہی ہو۔

نہ جانے کیوں اس کا موڈ بہت خراب ہو چکا تھا۔

اس نے اسی لہجہ میں کہا، ہاں تمہارے لئے کہہ رہی ہوں۔ اس لہجے نے میرے منہ کا مزہ بھی خراب کر دیا

اور میں نے اسی تلخی سے کہا تو میں جا سکتا ہوں،؟

بالکل جا سکتے ہو۔ اس نے یہ کہا اور کمرے کے اندر چلی گئی۔

میں واپس تو آ گیا۔ لیکن میرے اندر جو آگ لگی تھی۔ اس نے مجھے سونے نہ دیا۔ رات بھر میں صبح کا انتظار کرتا رہا۔ کہ صبح ہو اور مجھے کمرے کی تنہائی سے نجات ملے۔ اور وہ میری آنکھوں سے ہٹے۔

آخر وہ سمجھتی کیا ہے۔ اپنے آپ کو؟

میں نے تو اس کے ساتھ تعلق قائم نہیں کیا تھا۔ اس نے خود ہی مجھے اپنے قریب بلایا تھا۔ میں تو اسے اپنے لئے پسند بھی نہیں کرتا تھا۔ جو عورت مجھے پہلی نظر میں مجھے اچھی نہ لگے۔ وہ تو کبھی میرے دل کو نہیں بھاتی، میں تو جب پہلی بار اس سے ملا تھا۔ تو مجھے اس کے اندر دوستی کی نہیں دشمنی کی جھلک نظر آتی تھی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میرے اس کے درمیان ہمیشہ دشمنی کا رشتہ ہی رہ سکتا ہے۔ دوستی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اور پھو اس کے گرد تو چاہنے والوں کا ایک ہجوم تھا۔ اور میں کہا کرتا تھا، کہ اس کے چاہنے والوں کی انجمن بنائی جا سکتی ہے۔ اور ایک دم محض اسے جلانے کے لئے میں نے اس سے کہہ بھی دیا تھا کہ ''یار لوگ انجمن حقوق عاشقاں...... بنانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ لیکن اس بات ک وشاید اس نے چیلنج سمجھ لیا تھا۔ اور پھر خدا جانے کیا ہوا میں اس کے قریب ہوتا گیا۔ اس کا احساس مجھے اس وقت ہوا، جب میں نے کان دبا کر اس کے احکام ماننا شروع کر دیے۔ اور اس کے دوسرے دوستوں نے معنی خیز نظروں سے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔

جہنم میں جائے دوستی اور بھاڑ میں جائے عشق۔اب میں بھی اس سے بات نہیں کروں گا۔.....اور میں تہیہ کرلیا کہ اب وہ لاکھ کہے میں اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔

لیکن دوسرے صبح جب اس کا فون آیا تو انکار کے لئے میرے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا، اور بغیر کچھ کہے اس کی ہدایات پر عمل کرنے نکل کھڑا ہوا۔

اوہو میں تمہیں ایک چیز تو دکھانا ہی بھول گئی۔''ورکشاپ کے سائبان کے نیچےکھڑے چوکیدار کا انتظار کرتے ہوئے اچانک اس نے اپنے پرس سے کچھ کاغذ نکالناشروع کیے.....کل سے رکھے ہیں، تمہیں دکھانے کے لئے، رات تم جلدی ہی چلے گئے تھے، میں تو فلم کا کیسٹ لینے کمرے میں گئی تھی،

کیا چیز ہےرات کے ذکر سے میرے منہ کا ذائقہ کراب ہوگیا۔لیکن شاید اسے احساس بھی نہ تھا، میں بھی مجبور تھا۔

نظمیں ہیں''

''تمہاری نظمیں یعنی تم نے شاعری بھی شروع کردی۔

''میری نہیں اس ناجرین کی ہیں جو میرے ساتھ ایمبیسی میں کام کرتا ہے، یہ کہہ کر اس نے وہ کاغذ میرے ہاتھ میں دے دیے۔

''وہ لندن والا؟ میں نے ایک کاغذ کھولتے ہوئے کہا۔

''ہاں تمہیں بتایا تو تھا وہ ہر روز میرے لئے ایک نظم لکھتا ہے۔اور آ کر مجھے دے جاتا ہے۔

''وہ بھی تمہارے گھر آتا ہے۔میں نے چوٹ کی۔

گھر نہیں آتا سلی،.....میرے ڈیسک پر رکھ جاتا ہے۔گھر آتا تو میرا میاں اسے جان سے نہ مار دیتا

اچھا تو تمہارے میاں کو اتنی فرصت تھی؟

ہوں......اس نے کچھ سوچا اور پھر ایک لمبا سانس لیا۔

" ایک بات یاد رکھو، وہ بہت جیلس آدمی ہے، اور پوزیسو بھی، بہت ہی POSSESSIVE کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔

یہ بات اس نے پھر اسی انداز میں کہی تھی، میں غصہ کر کے اپنا اور اس کا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ میں چوٹ کرنے سے باز نہ آیا، اور سوکھا منہ بنا کر سوال کیا، ایک بات بتاؤ۔ یہ تمارے سارے عشق شادی کے بعد ہی کیوں ہوئے REPORTED عشق۔

شاید اسے اس بات پر غصہ آجاتا لیکن REPORTED کے لفظ نے مجھے بچالیا۔وہ ہنستی ہوئی میری طرف بڑھی، عشق کے بچے۔ٹھہرو تو سہی،

لیکن اتنے میں چوکیدار آگیا۔ پتا نہیں چوکیدار نے ہماری آنکھ مچولی دیکھی یا نہیں۔ البتہ میں شرمندہ شرمندہ سا تھا۔چوکیدار بھی اسے جانتا تھا۔اور مجھے بھی جانتا تھا۔اور ہمارے رشتے کا بھی علم تھا، کہ ہمارا کوئی رشتہ نہیں ہے۔

میں ڈرا ڈرا سا ایک طرف کھڑا تھا۔میرا خیال تھا وہ بھی گھبرا گئی ہوگی۔لیکن اس کیلئے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔وہ بے دھڑک چوکیدار سے باتیں کر رہی تھی، اسے میاں اور بیٹے کہہ کر پکار رہی تھی،

چوکیدار نے یہ بری خبر سنائی کہ اس کے پاس چابی نہیں ہے۔اور میں ڈر گیا۔ اب مجھے اسے چھوڑنے کے لئے اس کے گھر جانا ہوگا، اور گزشتہ دو روز کے اندر جو باتیں ہو چکی ہیں انہیں بھول کر اس کی میٹھی کڑوی باتیں سننا ہوں گی۔

اس شام اس کے گھر دعوت تھی۔وہی دعوت جو اکثر اس کے گھر ہوتی رہتی تھی، البتہ اس میں شرکت کرنے والے بدلتے رہتے تھے، ہر دعوت اور ہر محفل ہر شخص کے لئے نہیں تھی۔کسی محفل میں ایک قسم کے لوگ ہوتے تو دوسری دعوت میں کسی دوسری قسم کے، اسے سب سے تعلقات رکھنا پڑتے تھے، اپنے رشتے داروں سے بھی اور

اپنے شوہر کے رشتے داروں سے بھی۔ اپنے دوستوں سے بھی اور اپنے شوہر کے دوستوں سے بھی۔ اس کی کوشش تو یہ ہوتی کہ ایک محفل میں ایک ہی قسم کے لوگ جمع ہوں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا کہ ایک ہی محفل میں رنگ رنگ اور بھانت بھانت قسم کے لوگ جمع ہو جاتے، ایسی محفل مین بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی، کم از کم میں ضرور احتیاط کرتا۔ احتیاط وہ بھی کرتی۔ بلکہ ڈپلومیسی میں وہ مجھ سے کچھ ہاتھ آگے تھی، لیکن کبھی کبھی یوں ہوتا کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتی۔ اور پھر مجھے بھی اپنی احتیاط کو بھول جانا پڑتا۔

اس شام بھی ایسا ہوا کہ خدا جانے کہاں سے بات شروع ہوئی اور کہاں پہنچ گئی، میرا خیال ہے ہمیں خود بھی اندازہ نہ ہوتا کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں اور کس وقت اور کس جگہ کہہ رہے ہیں۔ اس شام باتوں باتوں میں ہم دونوں ہی راستہ بھول گئے۔

ایک صاحب محبت کے فلسفے پر بات کر رہے تھے۔ اور انسانی تعلقات اور انسانی رشتوں کے بارے میں اب تک جو باتیں کی جا رہی تھیں۔ اور کلیے ہمارے سروں پر مسلط کیے جا رہے تھے۔ وہ انہین بڑے خضوع وخشوع کے ساتھ دہرا رہے تھے۔ اچانک وہ چائے بناتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوئی اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر متوجہ ہوئی، میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی،

کون سی بات وہ صاحب بولتے بولتے ٹھہر گئے، یہی عشق ومحبت والی بات۔ اس نے اس صاحب کے آگے چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے کہا،

ہاں......یہی تو اصل بات ہے۔ یہ چیز سمجھنے کی نہیں ہوتی، محسوس کرنے کی ہوتی ہے۔ ان صاحب نے بڑے فلسفیانہ انداز میں گویا آسمان پ رسے بولتے ہوئے کہا۔ یہ تو ایک کیفیت ہے جس کا........

مگر...... یہ کیفیت صرف ایک مرتبہ ہی کیوں طاری ہوتی ہے۔ اس نے ان صاحب کی آنکھوں کو اپنی آنکھوں کی گرفت میں رکھا۔

یہ تو اس کی شدت پر منحصر ہے۔

یہ کیفیت ایک ہی شدت کے ساتھ کئی مرتبہ کیوں طاری نہیں ہو سکتی،

ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ہو سکتی...... یہ تو اس کی شدت اور......ابھی انہوں نے اپنا جملہ پورا نہیں کیا تھا۔ کہ ایک اور صاحب نے جو مسلسل مجھے گھورے جا رہے تھے، میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ حالات پر منحصر ہے۔

یہ کہہ کر وہ صاحب ہنسے مجھے ایسے لگا جیسے وہ شخص میرے اوپر ہنسا ہو۔ میں جھینپ سا گیا تھا۔ اچھا اب کوئی اور بات کرو۔ میرے منہ سے نکلا۔

تم کیوں پریشان ہو رہے ہو سی۔ اس نے اپنی نظریں میرے اوپر گاڑ دیں۔ یہ مردوں کی باتیں ہیں، مرد بن کے بات کرو۔

اس پر سب نے قہقہہ لگایا، مگر مجھے پسینہ آ گیا۔ جی چاہا۔ وہاں سے اٹھ جاؤں۔ لیکن اٹھنا بھی مناسب نہ تھا، اس لئے میں بھی قہقہوں میں شامل ہو گیا،

ہاں تو آپ کیا کہہ رہی تھیں، ان صاحب نے پھر سوال کیا؟

میں کہہ رہی تھی کہ آخر ہم ایک ہی وقت میں کئی انسانوں سے شدت سے محبت کیوں نہیں کر سکتے۔

شاید اس بات سے اس کا کوئی اور مطلب ہو، یا وہ مختلف محبتوں کا ذکر کر رہی ہو، لیکن مجھے ایسا لگا کہ وہ سب کے سامنے مجھے ننگا کر رہی ہے۔ مجھے ایکسپوز کر رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ میرے لئے کہہ رہی ہے۔

اس لئے میں نے جل کر کہہ دیا۔ تم ذرا لیٹ ہو گئیں

یہ سوال شیلی کو بھی پریشان کرتا تھا۔

شیلی کسی نے سوال کیا۔

انگریزی شاعر شیلی؟ یہ اس نے کہا،

ہاں انگریز شاعر وہ بھی اس کشمکش میں مارا گیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ وہ انیسویں

صدی کے شروع میں تھا۔ اور تم بیسویں صدی کے آخر میں ہو۔...... میں نے غصے میں جلدی جلدی کہہ دیا۔ میں اس کے چاہنے والوں کے ہجوم سے تنگ آ گیا تھا۔

اور یہ سب سے بڑا فرق ہے،،، اس نے پورے زور سے کہا

اور یہ بھی فرق ہے کہ وہ مغرب میں تھا اور آپ مشرق میں ہیں،،، یہ کسی اور نے کہا،

ہوں یہ سب سے بڑی دھمکی ہے۔ اس نے قہقہ لگایا۔ سب سے برا خطرہ......

ڈینجر...... خطرے کا نشان

سب ہنسنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ موضوع ختم ہوگیا۔ کیونکہ سب چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ لیکن شاید وہ اسی بات پر سوچ رہی تھی، کہ اچانک اس کی خاموشی کو اس کی آواز نے توڑا، ایک ہی شخص کی محبت سے ملکیت کی بو نہیں آتی،

اس نے یہ سوال گویا مجھ سے کیا تھا۔ اسی لئے میرے منہ سے نکل گیا۔ ''اپنے آپ کو کسی کی ملکیت میں دے دینا ہی سب سے برا ہے۔

اور اس نے مجھے یہ جملہ پورا نہیں کرنے دیا۔ سب کے سامنے میرے کندھے پر اس زور سے تھپڑ مارا، کہ میرے ساتھ باقی لوگ بھی اچھل پڑے۔۔ ہائے بے چارے تم رہے پینڈو کے پینڈو ہی،،،،

اس رات میں سو نہ سکا۔ محفل سے سب کے ساتھ ہی اٹھا تھا، اور اسے یہ احساس بھی نہیں ہونے دیا کہ مجھے اس کی باتوں سے تکلیف ہوئی ہے۔ اور شاید اس کے سامنے اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ تھی۔

لیکن میرے اندر غصہ تھا۔ وہ غصہ جو رات بھر میرے سینے کے اندر سلگتا رہا، اور جس نے رات بھر مجھے سونے نہ دیا۔

پہلے میں ٹہلتا رہا، پھر کتاب پڑھنے کی کوشش کی، پھر آنکھیں کھول کر بستر پر

لیٹ گیا، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا حتیٰ کہ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آ رہا تھا کہ میرا رویہ صحیح ہے یا اس کا؟ وہ جو کچھ کر رہی ہے وہ تو وہی ہے جو ہمیشہ سے کرتی آ رہی ہے، پھر میں پریشان کیوں ہوں؟ دراصل مجھے نیند اس لئے نہیں آئی کہ میں اپنی آپ سے لڑ رہا تھا۔ اور اپنے آپ سے لڑنے والے کبھی فتح حاصل کرتے ہیں کبھی شکست اور کبھی بیک وقت دونوں،

صبح کو مجھے رکشا پر دفتر جانا پڑا۔ میری گاڑی کا کلچ مجھے کئی دن سے پریشان کر رہا تھا۔ اس دن اس نے اتنا تنگ کیا، کہ میں نے مشکل سے گاڑی ورکشاپ تک پہنچائی۔ اور پھر رکشا کا انتظار کرنے لگا۔۔۔۔ اور اب سوچتا ہوں کہ مجھے اس دن رکشا کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس رکشا ہی نے میرے سارے خواب اور میرے خیالوں کے سارے گھروندے تہس نہس کر دیئے۔

لیکن وہ رکشا میں نے نہیں لیا تھا۔ رکشا والا تو مجھے وہاں کھڑا دیکھ کر خود ہی میرے پاس آ گیا تھا۔ اور جلدی کرنے لگا فوراً بیٹھ جاؤ۔ وہ رکشا ان رکشاؤں میں سے تھا جس کے مالک اسے دلہن کی طرح سجا کر رکھتے ہیں۔ اس کا ڈرائیور بھی ایسا ویسا نہیں تھا، خاصا گورا چٹا صحت مند جوان تھا،

رکشا ڈرائیور نہیں لگتا تھا۔

پہلے تو میری سمجھ مین نہیں آیا کہ وہ مجھے جلدی کیوں بلا رہا ہے۔ پھر میں نے سڑک کی دوسری جانب دیکھا، تو ایک عورت وہاں کھڑی اسے آوازیں دے رہی تھی۔

میں نے کہا کہ بھئی وہ خاتون تمہیں بلا رہی ہے۔ تم انہیں لے جاؤ میں کوئی اور رکشا پکڑ لوں گا۔

ہنہ خاتون...... یہ کہہ کر اس نے موٹی سی گالی دی"

جلدی بیٹھ جاؤ بابو جی، ورنہ میں جا رہا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے مجھے گھسیٹ کر

اندر بٹھالیا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر بات کیا ہوئی۔ میں نے ھنستے ہوئے پوچھ لیا کہ کیا جھگڑا ہوا ہے؟

ہنہ اپنے بندے کو بھیج دیتی ہیں باہر، اور ہمیں تنگ کرتی پھرتی ہیں۔..... یہ کہہ کر اس نے زور سے گیر لگایا۔ اور ایکسی لیٹر پر سارا غصہ نکال دیا۔ رکشا گھوں کر کے ایک فرلانگ آگے نکل گیا۔

میں نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے سامنے والی سلاخ پکڑ لی، ایسا لگا،،، جیسے اس نے میرے منہ پر نہایت

غلیظ گالی دی ہو۔..... گندگی مل دی جیسے اس نے میرے چہرے پر۔ راستے بھر میرے کان سنسناتے رہے۔

اور میرے دماغ میں اسی کی آواز گونجتی رہی۔ دفتر پہنچ کر میں نے اسے پیسے دیئے تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں.....شاید شرم کے مارے۔۔۔۔۔۔

لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی میرے سامنے ایک اور دروازہ کھل گیا۔ میں آہستہ آہستہ اپنی کرسی پر بیٹھا، سوچتے ہوئے غور کرتے ہوئے۔ اس واقعے پر۔

یہ واقعہ میرے لئے دو دھاری تلوار بن سکتا ہے۔ میں اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کرسکتا ہوں۔ میں اسے کرچی کرچی کرسکتا ہوں۔ چکنا چور کرسکتا ہوں اسے۔ ایک بار وہ ٹوٹ جائے تو پھر میرے ہاتھوں میں ہوگی۔ پھر میں اسے اپنے حساب سے نئی شکل دوں گا۔ ایک ایک کرچی اور ایک ایک ٹکڑا جوڑ کر نئی شبیہ بناؤں گا۔ جو میری ہوگی۔

لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ سوچ کر بھی مجھے اطمینان نہیں ہو رہا تھا، تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ ایک چبھن ایک خلش پھر بھی تھی۔ میری یہ حرکت ٹھیک ہوگی۔ یہ گھٹیا بات تو نہیں ہے۔

یہ نہ ہو کہ وہ میرے منہ پر ہی دے مارے۔ اور ہمیشہ کے لئے ناراض ہو جائے۔ پھر کیا ہو گا؟ لیکنمیں تو صرف اسے ایک واقعہ سناؤں گا۔ جیسے اور بہت سے واقعات اسے سناتا رہتا ہوں۔ یہ تو ظاہر نہیں کروں گا، کہ میں اسے کوئی......

اس روز میں دفتر سے اٹھ کر گھر نہیں گیا۔ پہلے ورکشاپ سے گاڑی لی۔ پھر ایک کاموش سے ہوٹل سے کھانا کھایا۔ ادھر ادھر گھوما، شام کی چائے ایک نئے پارک میں پی۔ اور چھ بجے کے قریب اس کے گھر پہنچا۔

وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ میرے حساب سے بے وقت۔ لیکن اس کے لئے وقت کی کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس کا جب جی چاہتا۔ وہ کسی وقت بھی نماز پڑھ سکتی تھی۔ نماز کا دورانیہ بھی وہ اپنی مرضی سے گھٹا بڑھا سکتی تھی۔ اس وقت وہ جستوجہ سے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ وہ جلدی فارغ نہیں ہو گی۔ اس لئے میں اسکے بچوں کے پاس چلا گیا۔

اس کے بچے بہت پیارے ہیں۔ اور مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ بلکہ مجھے اپنے برابر کا ہی سمجھتے ہیں۔ میرے آنے پر اتنا خوش ہوتے ہیں کہ مجھے اور سے بات ہی نہیں کرنے دیتے، حتیٰ کہ کوئی اور انہیں ڈانٹتا ہے کہ، باتیں کرنے دو، مین ان کے ساتھ کھیلتا رہا۔ اور وہ خوشی سے چھلانگیں لگاتے رہے۔

اس نے نماز میں بہت دیر لگائی۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھی میرے پاس نہیں آئی بلکہ کچن مین چلی گئی اور پتا نہیں کیا کرتی رہی۔ پھر کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں گئی اور وہیں سے آواز لگائی۔

بچو انکل کو تنگ نہ کرو۔ انہیں ادھر بھیج دو۔

میں اس کے کمرے میں گیا۔ وہ اپنے شوہر کا خط لیے بیٹھی تھی۔ دیکھو تو یہ کتنا بد تمیز انسان ہے۔ الٹا مجھ سے شکایت کرتا ہے۔ اپنی حرکتیں نہیں دیکھتا۔ صبح سے پریشان ہوں اس لئے امی کے گھر چلی گئی تھی، ذرا خط پڑھو اس کا؟

یہ کہہ کر اس نے وہ خط میری طرف بڑھا دیا۔ خط میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ وہی پیار محبت کی باتیں وہی شکوے شکایت ۔ مجھے ایسی کوئی بات نظرں ہیں آتی جس سے وہ پریشان ہوئی ہو، یہی بات میں نے اس سے کہہ دی، اس نے خط میرے ہاتھ سے چھینا۔ تم تو گدھے ہو۔ کہتی ہوئی وارڈ روب کی طرف چلی گئی۔ اور وہاں خدا جانے کیا کرنے لگی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا واقعہ اسے کیسے سناؤں؟ ۔ میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ سینے پر جو بھاری سل رکھی تھی۔ اسے میں جلد سے جلد اتار پھینکنا چاہتا تھا۔ لیکن موقع ہی نہیں مل رہا تھا۔

یہ بھی خیال تھا کہ اگر آج اور ابھی وہ بات نہ کہی گئی تو پھر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ مگر وہ موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔

میں اٹھا، اور اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔

تمہیں بھی وارڈ روب میں ٹانگ دوں۔ اس نے ہنستے ہوئے میری طرف دیکھا۔ مگر تم تو مکھی بنا کر دیوار سے چپکانے کے قابل ہو۔

واقعی ہی تم ایسا سمجھتی ہو۔ میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

وہ بھی ایک دم سنجیدہ ہو گئی ’’ ایں؟ کیا ہو؟ تم تو اچانک رونے لگے ...... خیر تو ہے؟

اصل میں میرے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔

خیر تو ہے کیا ہو گیا؟ وہ سچ مچ پریشان ہو گئی۔

اب میں نے آہستہ آہستہ ایک ایک نقطہ پر زور دے کر ایک ہی سانس میں وہ واقعہ سنا دیا۔ پھر میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اور انتظار کرنے لگا کہ کب اس کے چہرے پر غصہ یا شرمندگی کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور کب وہ بپھر کر میری

طرف لپکتی ہے۔

لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا...... اس کے چہرے کا رنگ بدلا ضرور۔ لیکن وہ رنگ غصے یا شرمندگی کا نہیں۔ فکرمندی کا تھا۔ ایک گہرا سا سایہ۔ اس کے سرخ رنگ پر لہرایا اور اس کی آنکھوں سے افسردگی جھانکنے لگی۔

ہوں اس نے سوچتے ہوئے کہا، اور بہت ہی سنجیدگی کے ساتھ اس صورت حال کا تجزیہ شروع کر دیا۔ یہ سچویشن ایسی ہی ہے۔ جیسے جنگ کے زمانے میں ہو جا تی ہے۔ خالص سوشل اور سوشیالوجیکل......

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور خاموش تھا۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا تم نے وہ فلم تو ضرور دیکھی ہو گی۔ STALAG 17 اس میں ایک کریکٹر اپنی بیوی کے خط سنایا کرتا تھا۔ جو وہ گھر سے بھیجتی ہے۔ بس ایسا ہی معاملہ ہے یہ بھی......

وہ بول رہی ہے۔ اور میں اس کے چہرے کو دیکھ رہا ہوں۔ وہ اس واقعے کا تجزیہ کر رہی ہے۔ اور میرے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔ میں زرد ہوتا جا رہا ہوں۔ اور سردی کے موسم میں بھی میرے جسم پر پسینہ رینگنے لگا ہے۔ اب میں وہاں...... اس کے سامنے نہیں ہوں۔

اس لئے تو میں نے کہا کہ اس کہانی کا نام خط سرطان ہے ہے'' لیکن اس کا ہنری ملر کے ناول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

--------The End -----ختم شد--------